لوگ مجھے جانتے ہیں اس لیے ’تعارف‘ کی ضرورت نہیں

’’پیش لفظ‘‘ میں نے اس لیے نہیں لکھا کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے، میں نے اپنے مضامین میں کہہ دیا ہے ’’دیباچہ‘‘ یا ’’مقدمہ‘‘ میں نے اس لیے کسی سے نہیں لکھوایا کہ میرے نزدیک یہ اس شہ بالے کی طرح مضحکہ خیز حد تک غیر ضروری اور غیر اہم ہے جو دولہا کے آگے یا پیچھے گھوڑے پر سجا بنا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔

سعادت حسن منٹو

(دہلی 12 اپریل 1942ء)

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی ۔۔۔۔۔۔سو جب تک مردوں کو وصل نصیب نہیں ہوتا، وہ حسرت ہی سے اپنا دل بہلاتے رہیں گے اور خوباں سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ سلسلہ کب شروع ہوا وہ مرد کون تھا جس نے پہلی بار کسی عورت کو چھیڑا۔ اس کے متعلق تاریخ سے ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہت ممکن ہے باغ عدن سے کسی گھنی جھاڑی کے عقب میں یا کسی سایہ دار درخت کے نیچے حضرت آدمؑ نے یہ سلسلہ شروع کیا ہو کیونکہ وہ جنت سے یونہی تو نکالے نہیں گئے تھے۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ حضرت آدمؑ نے ہی اس دلچسپ سلسلے کا آغاز کیا تھا تو ''پہلی چھیڑ'' کا تصور ممکن نہیں ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چھیڑ بے حد خام ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس چھیڑ میں انتہا درجے کی لطافت اور نزاکت ہو۔ دراصل اس کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کے حالات زندگی اور ان کے کردار و اطوار سے ہم قطعاً نا آشنا ہیں۔ اسی طرح ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اماں حوا نے اس چھیڑ کو کس رنگ میں دیکھا اور ان کے دل و دماغ میں اس چھیڑ نے کس قسم کا ردعمل پیدا کیا۔۔۔۔طرح طرح کے تصور دماغ میں آتے ہیں، پر کوئی صحیح تصویر نہیں بنتی۔ دو برہنہ سائے سے ایک خیالی باغ میں لتے نظر آتے ہیں، اس کے بعد حال کے نقوش کچھ اس طرح ابھرتے ہیں کہ تصور امریکہ کے کسی ننگے کلب کی طرف چلا جاتا ہے باوا آدمؑ صاحب بن جاتے ہیں اور اماں حوا ان کی میم

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔۔۔ یورپ میں جہاں ترقی پسند کا دور دورہ ہے اور تہذیب و تمدن کی چولی کے بند کھلے ہوئے ہیں حسرتیں کم ہیں اور وصل زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود وہاں چھیڑ چھاڑ عام دیکھنے میں آتی ہے نقاب اٹھنے پر بھی وہاں کی بے نقاب عورتیں اسی طرح گھوری جاتی ہیں جس طرح یہاں ہندوستان کی نقاب پوش عورتوں کے نقاب گھورے جاتے ہیں۔ چھیڑ چھاڑ بھی زوروں کی ہوتی ہے۔ ہندوستان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ۔ دراصل جنسی بھوک کچھ اس قسم کی بھوک ہے کہ مٹائے نہیں مٹ سکتی۔ جب تک مرد اور عورت پاس پاس رہیں گے، یہ چھیڑ چلی جائے گی یا پھر کوئی ایسا زمانہ آئے کہ عورت کو وجود مرد کے لیے غیر ضروری ہو جائے تو چھیڑ کا یہ سلسلہ خود بخود ختم ہو جائے گا اس سے پہلے اس کا خاتمہ ممکن نہیں۔

پچھلے دنوں گاندھی جی نے آج کل کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے بارے میں ارشاد کیا تھا ''ایک جولیٹ کے سو سو رومیو موجود ہیں'' اس پر لاہور میں وہ شور مچا تھا کہ خدا کی پناہ۔۔۔۔ مس ممتاز شاہ نواز اور دوسری خواتین نے گاندھی جی کے اس حملے کا بڑی شدت سے جواب دیا۔ بہت دیر تک مستورات کے مضامین ہندوستان کے اس نیم مستور لیڈر کے خلاف چھپتے رہے۔ گاندھی جی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انہوں نے ایک مضمون اور لکھا اور اس میں تہذیب نو کے گرفتار لڑکوں کو اپنے اہنسائی تیروں کا نشانہ بنایا ان نوجوانوں سے گاندھی جی نے کہا ''تم بازار میں جب چلو تو اپنی نگاہیں نیچی رکھا کرو اگر ہو سکے تو ہڈ پہنا کرو تا کہ تمہاری نگاہیں نوجوان لڑکیوں پر نہ پڑ سکیں اور تمہارا ایمان متزلزل ہونے سے بچ سکے۔''

ہندوستان پر گاندھی جی کا اثر مسلم ہے پر ان کا یہ مضمون نوجوانوں کے جذبات پر اثر انداز نہ ہو سکا۔۔۔۔خوباں سے چھیڑ جاری رہی۔نگاہوں پر سنسر نہ بیٹھ سکا، جذبات ویسے کے ویسے بے لگام رہے۔گاندھی جی کی یہ سعی ویسی ہی ناکام رہی جیسے بمبئی میں امتناع شراب کے بارے میں کانگریس گورنمنٹ کی کوشش۔

گاندھی جی کی یہ کوشش اگر بارآور ثابت ہوتی تو ذرا غور کیجئے کہ معاشرتی زندگی میں کتنا بڑا انقلاب برپا ہو جاتا۔۔۔۔گلی کوچوں اور بازاروں میں آپ کو مرد ماتھے پر ہڈ باندھے اور نگاہیں نیچی کئے چلتے پھرتے نظر آتے۔ٹریفک میں کئی مشکلات پیدا ہو جاتیں اور ہر روز حادثے وقوع پذیر ہوتے اور ان حادثوں کا شکار صرف مرد ہوتے ماتھے پر ہڈ، نگاہیں فرش پر، سامنے سے تیز رفتار موٹر آ رہی ہے، ادھر جوان عورتیں جا رہی ہیں، ہارن پر ہارن بجایا جا رہا ہے، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن ایک عجیب مشکل میں آدمی پھنس جاتا ہسپتال میں زخمیوں سے بھر جاتا وہاں بھی بے چارے مردوں کی آنکھوں پر ہڈ چڑھا رہتا کہ کسی نرس کو نہ دیکھ پائیں۔

ہڈ وڈ کی بات چھوڑیئے روزمرہ کی زندگی بالکل بے کیف ہو جاتی، جذبات کا دریا بند پانی کی طرح ٹھہر جاتا، امنگیں، خیال آرائی کی تمام قوتیں جذباتی ہیجان، غرضیکہ وہ سب کچھ جس سے انسانی زندگی میں حرارت پیدا ہوتی ہے، فنا ہو جاتا۔۔۔۔عورت ہوتی، مرد بھی ہوتے لیکن وہ چنگاری نہ ہوتی جو ان دونوں کے تصادم سے پھوٹتی ہے۔جوانیوں کے بھرے ہوئے جام ہونٹوں کے لمس کو ترستے رہتے۔شوخیاں اور شرارتیں بالکل مفقود ہو جاتیں، چاروں طرف متانت اور

سنجیدگی نظر آتی، چہرے لمبوترے ہو جاتے، ان کی تازگی، ان کی رونق اور ان کی دمک سب غائب ہو جاتی۔ زندگی کے اکتا دینے والے ایک آہنگ تسلسل میں آدمی بالکل بے جان اور مردہ ہو کے رہ جاتا۔ ملک کی شاعری اور اس کے ادب کا ستیاناس ہو جاتا۔ فنون لطیفہ سب کے سب یتیم ہو جاتے۔۔۔۔۔۔۔ مگر یہ نہ ہوا اس لیے کہ اس کا ہونا ممکن نہیں تھا۔

ہر بالغ مرد اور ہر بالغ عورت کو معلوم ہے کہ یہ چھیڑ چھاڑ کیوں ہوتی ہے اس لیے کہ یہ کوئی خلاف عقل چیز نہیں لیکن یہاں وہ چند بیانات دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے جو میں نے بڑ کاوش سے چند نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کے متعلق حاصل کیے ہیں۔

میں نے پہلے ذیل کے سوالات لڑکوں کے لیے تیار کیے۔

1 تم لڑکیوں یا عورتوں کو کیوں چھیڑتے ہو۔۔۔۔ کیا اس کی کوئی وجہ تم بیان کر سکتے ہو؟

2 کس قسم کی لڑکیوں یا عورتوں کو تم زیادہ چھیڑتے ہو؟

3 تمہارے چھیڑنے کا طریقہ کیا ہے؟

4 کیا تمہارے خیال میں لڑکیاں یا عورتیں ایسی چھیڑ چھاڑ پسند کرتی ہیں؟

5 کوئی ایسا واقعہ بیان کرو جو اس قسم کی چھیڑ چھاڑ سے وابستہ ہو اور جس کے نقوش تمہارے ذہن پر مرتسم ہو چکے ہوں۔

میں نے یہ پانچ سوال بارہ لڑکوں سے کیے جن کی عمر سولہ سے لے کر چوبیس سال کے درمیان تھی۔ ان میں سے سات لڑکے جو تعلیم یافتہ تھے، مجھے پہلے سوال

کا خاطر خواہ جواب نہ دے سکے۔ باقی پانچ لڑکوں نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن ان کے جواب ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ جو کچھ انہوں نے اس ضمن میں کہا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"ہم لڑکیوں اور عورتوں کو اس لیے چھیڑتے ہیں کہ ہمیں اس میں مزہ آتا ہے۔ زیادہ مزہ ہمیں ان لڑکیوں کو چھیڑنے میں آتا ہے جو ہماری دراز دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہ کرسکیں۔ دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا کر خاموش ہو جائیں، گالیاں ان کی زبان کی نوک پر آ کر رک جائیں، غصے کے اس خاموش اظہار کا لطف بیان سے باہر ہے۔۔۔ہم اس لیے ان کو چھیڑتے ہیں۔۔۔کہ اس چھیڑ کی تحریک ہمارے اندر خود بخود پیدا ہو جاتی ہے بعض اوقات بازار میں چلتے ہوئے کئی خوبصورت اور پر شباب لڑکیاں ہمارے پاس سے گزر جاتی ہیں مگر ہم ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے دراصل چھیڑنا موڈ کی بات ہے۔ اگر موڈ ایسا ہو تو کوئی لڑکی ہماری چھیڑ سے بچ کر نہیں جا سکتی۔ بعض اوقات ہمیں گالیاں سننا پڑتی ہیں اور خطرناک حادثوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس سے ہماری یہ سرگرمی کچھ دیر کے لیے ماند پڑ جاتی ہے مگر پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔اس میں شک نہیں کہ عورت کی بے بسی سے ہم ناجائز فائدہ اٹھا جاتے ہیں مگر عورت کی بے بسی نظر نہیں آتی اس لیے کہ وہ ہماری پہنچ سے بہت دور رہتی ہے۔ اس کے خیالات و محسوسات سے چونکہ ہم غافل ہیں اس لیے ہمیں وہ اونچے درخت کی ٹہنیوں سے الجھی ہوئی پتنگ دکھائی دیتی ہے جس پر کنکر مارنے کا خیال خواہ مخواہ دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔۔۔آپ پوچھتے ہیں کہ ہم لڑکیوں کو

کیوں چھیڑتے ہیں، ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم لڑکیوں کو کیوں نہ چھیڑیں؟ اگر ہم انہیں نہ چھیڑیں گے تو اور کون چھیڑے گا۔ ہمارے اور ان کے تعلقات ہمیشہ سے کچھ اس قسم کے چلے آئے ہیں کہ یہ چھیڑ چھاڑ ضروری ہے۔''

ان پانچ نوجوانوں میں سے ایک لڑکا جس کی عمر چوبیس برس تھی، بہت ہوشیار تھا۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اچھی تھی اس نے مجھ سے کہا'' آپ کہتے ہیں کہ ہم عورتوں کو کیوں چھیڑتے ہیں؟ اس کا جواب تو آپ کو کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا لیکن اس کا جواب کیا ہے کہ میں نے پرسوں بازار میں جاتے ہوئے ایک کتے کی طرف دیکھا۔ ایک دم جانے کیا ہوا کہ میں نے اسے آنکھ ماردی۔ اب اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ میں نے اس کو آنکھ کیوں ماری تو میں آپ کو خاطر خواہ جواب نہ دے سکوں گا اس لیے کہ میں اس لمحاتی جذبے کا تجزیہ نہیں کرسکتا جو اس عجیب وغریب حرکت کا باعث ہوا۔''

دوسرے سوال کا جواب آٹھ لڑکوں نے یہ دیا کہ ہم ان لڑکیوں کو چھیڑنا پسند کرتے ہیں یا ان لڑکیوں کو چھیڑنے کے لیے ہمارے اندر اکساہٹ پیدا ہوتی ہے جو جوان ہوں اور جنہیں اپنی جوانی پر ناز ہو۔۔۔۔۔۔۔ یہ ناز ان کی چال ڈھال میں صاف نظر آجاتا ہے۔

دو لڑکوں نے اسی سوال کا جواب یوں دیا'' ہم صرف ان لڑکیوں کو چھیڑنا پسند کرتے ہیں جو ہمیں عین موقع پر پسند آجائیں بعض اوقات معمولی شکل وصورت اور معمولی جوانی کی لڑکیوں کو چھیڑنے کو دل چاہا ہے اور بعض اوقات غیر معمولی طور پر حسین اور تیکھی لڑکیوں ہی کو چھیڑا جاتا ہے۔ یہ محض اکساہٹ کی بات ہے ہمارا

خیال ہے کہ یہ اکساہٹ لڑکیاں خود پیدا کرتی ہیں۔چھیڑنے کا مادہ تو ہمارے اندر موجود ہے مگر اس بارود کو آگ وہی دکھاتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔''

باقی دو لڑکوں نے کہا ''ہم صرف موٹی اور گول گپی لڑکیوں کو چھیڑتے رہتے ہیں۔دبلی پتلی لڑکیوں کو ہم نے کبھی نہیں چھیڑا موٹی اور بھاری جسم کی لڑکی کو چھیڑنے میں بہت مزہ آتا ہے''

ان میں سے ایک نے کہا ''بازار میں یا گلی میں جہاں کہیں موٹی لڑکی مجھے نظر آ جائے میں آنکھ ضرور مارتا ہوں اس میں ایک خاص لطف آتا ہے مجھے، جسے میں بیان نہیں کرسکتا۔مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری آنکھ اس کے نرم نرم جسم میں کھپ گئی ہے۔موٹی لڑکیاں یوں بھی زیادہ شرمیلی ہوتی ہیں، ان کو آنکھ ماری جائے تو شرم سے ان کے گدگدے گال جب تھرتھراتے ہیں تو ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے۔''

تیسرے سوال کا جواب دس لڑکوں نے ایک جیسا دیا انہوں نے کہا چھیڑنے کے طریقے یوں تو بہت سے ہیں لیکن عام طریقہ یہی ہے کہ راہ چلتی لڑکی کو آنکھ ماری جائے۔آنکھ سے چھیڑنا خطرناک نہیں اس لیے کہ اس میں قربت کی ضرورت نہیں ہوتی۔دور سے بھی آنکھ ماردی جائے تو نشانے پر بیٹھتی ہے اور اپنا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔آنکھ محض شرارت کے طور پر ماری جاتی ہے مگر اس جھپک میں یہ سوال بھی پوشیدہ ہوتا ہے ''کیا خیال ہے تمہارا؟'' صرف ایک پکارے کے ذریعے سیہ یہ سوال جس میں ہزارہا سوال منجمد ہوتے ہیں ایک سیکنڈ سے کم عرصے میں کردیا جاتا ہے۔اس کا جواب عام طور پر ایک نفرت انگیز اور خشم آلود گھبراہٹ ہوتی ہے

جولڑکی کے سارے جسم پر چشم زدن میں پھیل جاتی ہے۔آنکھ مارنا اس لیے زیادہ خطرناک نہیں کہ اس شرارت کا ٹھوس ثبوت بہم پہنچانا بہت مشکل ہے ذرا آنکھ جھپکائی،لڑکی کے چہرے پر انگارے سے بکھرے اور چل دیئے۔کبھی کبھی کوئی لڑکی مسکرا دیتی ہے اور یہ مسکراہٹ دیر تک ہمیں یاد رہتی ہے اس لیے کہ اس میں ایک ایسی تیتری کے رنگ ہوتے ہیں جو ہاتھ نہیں آسکتی بس ایک لمحے کے لیے یہ مسکراہٹ ہماری آنکھ کی جھپک سے تیتری کے ہلکے پھلکے پروں کی طرح چھوتی ہے۔اور پھر پھڑ پھڑا کر اڑ جاتی ہے آنکھوں کو چھوڑیئے تو جسم میں زبان کے علاوہ صرف ہاتھ باقی رہ جاتے ہیں جن سے چھیڑا جا سکتا ہے ہم ان سے مدد لیتے ہیں لیکن بہت کم، اس لیے کہ ہاتھ اکثر اختیار سے باہر نکل جاتے ہیں اور لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔بھیڑ بھاڑ زیادہ ہو، کوئی میلا ٹھیلا ہو، کھوے سے کھوا چھل رہا ہو، اس افراتفری میں کسی لڑکی کو اگر گدگدا دیا جائے تو اتنا زیادہ خطرناک نہیں۔نمائش میں رات کے وقت اس مقام پر جہاں اونچی سیڑھی پر سے بازی گر کو نیچے آگ کے کنوئیں میں چھلانگ لگانا ہوتی ہے، کافی ہجوم ہوتا ہے یہاں ہم اکثر لڑکیوں کے گدگدیاں کرتے ہیں بعض اوقات اپنا جسم اس کے جسم سے رگڑ کر ہم تیزی سے آگے نکل جایا کرتے ہیں۔کبھی کاندھے سے ہلکا سا دھکا بھی دے دیا جاتا ہے۔بس ہم صرف یہی طریقے استعمال کرتے ہیں۔

باقی دو لڑکیوں میں سے ایک نے کہا ''میں نے آج تک کسی لڑکی کو آنکھ نہیں ماری میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آنکھ ماری جاتی ہے اور میں نے کئی لڑکوں کو آنکھ مارتے بھی دیکھا ہے مگر میں کوشش کے باوجود یہ چیز سیکھ نہیں سکا میں جب کبھی

ایک آنکھ سکیڑنے کی کوشش کرتا ہوں تو میری دوسری آنکھ بھی بند ہو جاتی ہے میں اسی وجہ سے کسی کو آنکھ نہیں مارتا۔ میں نے ہاتھ سے بھی آج تک کسی لڑکی کو نہیں چھیڑا میرا چھیڑ چھاڑ کا طریقہ سب سے جدا اور انوکھا ہے۔ میں راہ چلتی لڑکیوں سے وقت پوچھا کرتا ہوں اس سے مجھے بہت لطف حاصل ہوتا ہے۔ وقت میں صرف انہی سے پوچھتا ہوں جن کی کلائی پر گھڑی بندھی ہو۔ آج تک کسی لڑکی نے مجھے وقت بتانے سے انکار نہیں کیا۔ لیکن بہت کم لڑکیاں مجھے گھڑی دیکھ کر وقت بتا سکتی ہیں اس لیے کہ ایک دم جب کسی لڑکی سے وقت پوچھا جائے تو وہ سخت گھبرا جاتی ہے۔ اس گھبراہٹ میں وہ انکار بھی نہیں کر سکتی میں خود اپنے آپ کو گھبرایا ہوا ظاہر کرتا ہوں جیسے مجھے ایک خاص وقت پر کہیں پہنچنا ہے۔ اس قسم کی اضطراری کیفیت اپنے اوپر طاری کر کے میں ادھر ادھر پریشانی کے عالم میں دیکھتا ہوں، پھر جیسے اچانک میری نگاہیں اس کی گھڑی پر جا پڑی ہیں، میں پوچھا کرتا ہوں ''معاف فرمائیے گا، آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہے؟'' بس وقت پوچھا، جو کچھ اس نے بتایا سنا اور تیز قدمی سے چل دیئے۔ بعض اوقات شکریہ ادا کر دیا اور بعض اوقات مصنوعی گھبراہٹ میں یہ بھی بھول گئے پانچ برس کے عرصے میں ایک سو ستاون لڑکیوں سے میں وقت پوچھ چکا ہوں ایک بار جس سے میں وقت پوچھتا ہوں، اس کی شکل وصورت اچھی طرح یاد رکھتا ہوں تا کہ پھر اس سے وقت نہ پوچھوں۔''

دوسرے لڑکے نے اس کا جواب یوں دیا ''مجھے صرف زبانی چھیڑ چھاڑ پسند ہے۔ میں نے پانچ چھ مرتبہ آنکھ بھی ماری ہو گی مگر زیادہ لطف مجھے زبانی چھیڑ چھاڑ

میں آتا ہے بازار میں کسی لڑکی پر ایسا فقرہ کہنا کہ صرف وہی سمجھے، آس پاس کے لوگ نہ سمجھیں یقیناً ایک فن ہے مگر ایسے فقرے ہر روز نہیں کسے جا سکتے۔ دماغ روشن اور حاضر ہو کوئی محرک مل جائے تو فقرہ کسنے میں ایسا لطف آتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

چوتھے سوال کا جواب نو لڑکوں نے بالکل ایک جیسا دیا "ہمارا خیال ہے کہ لڑکیاں ہماری چھیڑ چھاڑ کو پسند نہیں کرتیں اس لیے کہ عورت اور مرد کے درمیان اس وقت تک مفاہمت کا کوئی رشتہ پیدا نہیں ہو سکتا جب تک وہ میاں بیوی نہ بن جائیں عورت مرد کی طرف یوں دیکھتی ہے جیسے بکرے قصائی کی طرف۔۔۔۔۔۔ مرد کا تصور ہمیشہ عورتوں کی عصمت کے تنے ہوئے رسے پر کھڑا کر دیتا ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات ہماری یہ چھیڑ چھاڑ محض ایک معصوم تفریح کے لیے ہو مگر عورت اس معصوم تفریح کو بھی گناہ اور ثواب کی خطرناک طور پر نازک ترازو میں تولے گی۔۔۔ سچ پوچھئے تو ہمارے پیش نظر صرف عورت ہوتی ہے جو کچھ اس کے عقب میں ہے، ہم نے اس پر کبھی غور نہیں کیا۔ وہ اگر خوش نہیں ہوتی ہے تو نہ ہو اگر ناراض ہوتی ہے تو ہوا کرے، ہماری یہ چھیڑ جاری رہے گی۔"

دو لڑکوں نے اس سوال کا جواب دیا "عورتیں ہماری چھیڑ چھاڑ پسند کرتی بھی ہیں اور نہیں بھی کرتیں دراصل عورت ہاں اور نہ کا ایک نہایت ہی دلچسپ مرکب ہے یہی وجہ ہے کہ ہم اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اگر اس میں ہاں اور نہ کا یہ الجھاؤ نہ ہوتا تو ہم اسے کبھی نہ چھیڑتے۔ انکار اور اقرار کچھ اس طرح عورت کے

وجود میں خلط ملط ہو گیا ہے کہ بعض اوقات اقرار انکار معلوم ہوتا ہے اور انکار اقرار۔۔۔۔۔ہمیں تو اسی چیز نے مار رکھا ہے۔''

ایک لڑکے نے اس سوال کا جواب بالکل مختلف طور پر دیا۔''اجی صاحب! چھوڑیئے لڑکیاں اس چھیڑ چھاڑ کو بہت پسند کرتی ہیں عورت کی جوانی اور مرد کی جوانی میں لمبا چوڑا فرق ہی کیا ہے۔بس یہی نا کہ وہ شلوار قمیض یا ساڑھی پہن کر جوان ہوتی ہے اور ہم پتلون کوٹ کے اندر جوان ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔میں تو صرف اس لیے لڑکیوں کو چھیڑتا ہوں کہ وہ اسے پسند کرتی ہیں۔۔۔جب ہم انہیں چھیڑتے ہیں وہ وہ تخلیے میں اپنی سہیلیوں کو اپنے تاثرات ضرور بتاتی ہیں یہ تاثرات ان سہیلیوں پر عجیب وغریب کپکپاہٹیں طاری کرتے ہیں آپ کو معلوم نہیں اور نہ مجھے معلوم ہے مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ ہماری پھونکوں سے لڑکیوں کے کنوار پن کی لو جب لرزتی ہے تو ایک عجیب ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے اگر اس حقیقت کا احساس مجھے نہ ہوتا تو میں ہرگز ہرگز کسی لڑکی کو نہ چھیڑتا۔''

اب میں آخری سوال کے جوابات کی طرف آتا ہوں ہر لڑکے نے ایک واقعہ بیان کیا جو اس قسم کی چھیڑ چھاڑ سے متعلق تھا مگر ان میں سے صرف چند اس قابل ہیں کہ یہاں درج کروں اکثر واقعات کچھ اس قسم کے تھے۔۔۔۔۔ایک لڑکی کو چھیڑا گیا۔اس نے شور مچا دیا جس کے باعث چھیڑنے والے کی بہت بدنامی ہوئی،وغیرہ وغیرہ۔

سب سے دلچسپ داستان اس لڑکے نے مجھے سنائی جس نے ایک بار کتے کو آنکھ ماری تھی۔اس نے کہا''آج سے چار برس پہلے کا ذکر ہے۔امرت سر میں

کانگریس تحریک کے باعث دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ جلیانوالہ باغ میں طلباء اور دوسرے لوگوں کا ایک میلا سا لگا رہتا تھا۔ میں ہر روز شام کو اسٹڈی کرنے کے بہانے سے جلیانوالہ باغ میں جاتا تھا۔ ایک روز جب کہ میں اس باغ میں جانے کے لیے بازار طے کر رہا تھا، میری نگاہ بغیر کسی مطلب کے اوپر کو اٹھی، ایک سال خوردہ مکان کی بالکونی میں مجھے ایک سفید پگڑی نظر آئی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سمجھا کہ کوئی سکھ ہوگا، پر جب وہ پگڑی اونچی ہوئی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب میں نے سانولے رنگ کی ایک تیکھے نقشوں والی لڑکی کو دیکھا، اس نے سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی۔ آہنی جنگلے میں سے اس کا چوڑی دار پاجامہ بھی مجھے نظر آیا۔ کم بخت نے اچکن بھی پہن رکھی تھی۔ جو اس کے بہت پھنس کر آئی تھی، اس نے میری طرف جب دیکھا تو میں نے بلند آواز میں کہا ''تسلیم عرض کرتا ہوں'' یہ سن کر وہ بوکھلا سی گئی۔ ایک کھسیانی سی شرم آلود ہنسی اس کے ہونٹوں پر پھیلی اور میری نگاہوں سے نظر بچا کر اندر کمرے میں چلی گئی۔''

جلیانوالہ باغ میں سٹوڈنٹ یونین کیمپ کے اندر جا کر میں نے اپنے چند دوستوں کو یہ واقعہ سنایا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ لڑکی ایک کانگریس ورکر کی بیوی ہے جو تین چار روز سے قید خانے میں ہے۔ لڑکی کی شادی کو مشکل سے چار پانچ مہینے ہوئے تھے۔ خاوند کی گرفتاری کے بعد اب وہ اکیلی اس مکان میں رہتی تھی۔ یہ تمام باتیں جب مجھے معلوم ہو گئیں تو میں سیدھا اپنے گھر روانہ ہوا جو وہاں سے دور نہیں تھا۔ گھر جا کر اپنے کمرے کو بند کر کے میں نے بلاؤز پہنا، بلاؤز کے نیچے میں نے ربڑ کی گیند کے دو ٹکڑے کر کے سینے پر جما لیے، پیٹی کوٹ پہنا، پھر ساڑھی

پہنی، اس زمانے میں میرے بال بہت لمبے تھے، سیدھی مانگ نکال کر میں نے چند لٹیں ادھر اور ادھر چھوڑ دیں۔ ان دنوں عورتوں میں چپل پہننے کا رواج عام تھا۔ چنانچہ میں نے اپنا چپل ہی پاؤں میں رہنے دیا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب میں نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو مجھے خود پر عورت کا دھوکا ہونے لگا۔ لباس آدمی کو کتنا تبدیل کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ خیر، بہن کا برقعہ اوڑھ کر میں چلا۔ گلی میں کئی بار مجھے ٹھوکریں لگیں اس لیے کہ برقعہ پاؤں میں الجھ الجھ جاتا تھا۔ عورتوں کی چال بھی مجھ سے نہیں چلی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی دامن گیر تھا کہ کوئی راستے میں بھانپ لے گا تو بہت خفیف ہونا پڑے گا۔

بہر حال ان تمام مشکلات کے ہوتے ہوئے میں نے تین بازار طے کئے اور اس مکان پر پہنچ گیا۔ حلوائی کی دکان کے ساتھ ہی اس مکان کی سیڑھیاں تھیں، میں نے منہ سے برقعہ ذرا اونچا کیا اور اوپر چڑھ آیا۔ دل میرا دھک دھک کر رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس کوئی دم میں سینے سے نکل کر سیڑھیوں پر آ پڑے گا لیکن شرارت کا تصور اس کمزوری پر غالب آیا۔ میں نے دستک دی اور دستک دیتے ہی سوچ لیا، اگر کوئی مرد سامنے آ گیا تو میں کچھ کہے سنے بغیر نیچے چلا جاؤں گا اور اگر ضرورت پڑی تو آواز میں باریکی پیدا کر کے کہہ دوں گا۔ معاف کیجئے گا، میں غلطی سے ادھر چلی آئی۔۔۔۔۔۔ چنانچہ یہ سوچتے ہی میں نے ایک بار اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ قدموں کی چاپ سنائی دی مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا دل پہلو سے نکل کر اندر کمرے کے فرش پر چل رہا ہے، میں نے سوچا کہ بھاگ جاؤں، پر اندر سے کنڈی کھل چکی تھی۔ میں نے اٹھا ہوا برقعہ نیچے چھوڑ لیا۔ دروازہ کھلا، وہ لڑکی

میرے سامنے تھی، مجھ سے زیادہ بوکھلائی ہوئی سر کے بال پریشان ہو رہے تھے، مردانہ قمیض اس نے پہن رکھی تھی، پائجامہ وہی تھا چوڑی دار۔ کاندھے پر اس نے دوپٹہ بڑی بے ترتیبی سے ڈال رکھا تھا۔ برقعہ پوش عورت کو دیکھ کر اس کے ہوش بجا ہوئے میرے بھی سانس میں سانس آیا اس نے کہا ''اندر آ جائیے'' میں بے دھڑک اندر چلا گیا۔

ایک بڑا کمرہ تھا۔ اس کو طے کر کے ہم دوسرے کمرے میں جا پہنچے جو بہت ہی چھوٹا تھا۔ اس میں دو کرسیاں اور ایک چارپائی پڑی تھی۔ اس چارپائی پر مجھے وہ اچکن دکھائی دی جس کو اس نے پہن رکھا تھا۔ اس کی ایک آستین الٹی ہوئی تھی پاس ہی سفید پگڑی دھری تھی۔ اس نے کئی بار مجھے سرتاپا دیکھا۔ میری آمد اس کے لیے ایک معمہ بنی ہوئی تھی اس چھوٹے کمرے میں پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا۔ ''تشریف رکھیے'' اور یہ کہہ کر اس نے کرسی پر سے چند کتابیں اٹھا کر چارپائی پر رکھ دیں۔ میں اس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب میری پریشانی کسی حد تک دور ہو گئی تھی مگر میرا دھیان دروازے کی طرف تھا جو وہ کھلا چھوڑ آئی تھی۔ بے شمار خیالات میرے دماغ میں آ رہے تھے، جب میں کرسی پر بیٹھ گیا تو اس نے مہمان نواز انداز میں کہا ''برقعہ اتار لیجیے'' میں نے اس کے جواب میں ادھر ادھر دیکھا تو اس نے مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا ''یہاں میرے سوا کوئی نہیں'' میں دل ہی دل میں ارادہ کر چکا تھا کہ کوئی بات نہ کروں گا مگر یہ الفاظ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گئے ''آپ باہر کا دروازہ بند کر دیجیے'' میرا لہجہ اپنا تھا مگر اسے شک نہ ہوا وہ فوراً اٹھی اور دروازہ بند کرنے چلی گئی۔۔۔۔۔۔

میں نے اس دوران میں حالات کا پر غور کیا اور چہرے پر سے نقاب ہٹالی۔ سر میرا برقعے کی ٹوپی میں تھا۔ دونوں کان بھی اس میں چھپے ہوئے تھے۔ چہرہ بالوں سے بے نیاز تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اس کو صدمہ اچانک نہیں پہنچے گا۔ دروازہ بند کر کے وہ آئی میں نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ وہ چارپائی پر بیٹھی اور بیٹھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی جیسے بھڑ نے اسے کاٹ کھایا ہو۔ میری طرف دیکھ کر اس کے منہ سے مدھم سے چیخ نکلی ــــــ۔ انگریزی ضرب المثل کے مطابق بلی بیگ میں سے نکل چکی تھی۔ میں نے برقعہ اتار دیا۔ اس کی ٹانگیں چوڑی دار پائجامے میں کانپ گئیں۔ میری جرأت بڑھ گئی۔ مسکرا کر میں نے کہا'' آداب عرض کرتی ہوں'' وہ مجھے پہچان گئی تھی اور خوف نے اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا میں نے اس کی خوف زدہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا'' آپ کو مردانہ لباس خوب سجتا ہے، کیا میرے بدن پر آپ کا یہ لباس اچھا نہیں لگتا''   ــــــ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے، اگر چھت نیچے آرہتی یا آسمان سے ناگہانی طور پر بجلی گر پڑتی تو اس کو اتنا خوفناک تعجب کبھی نہ ہوتا جتنا کہ میری آمد پر اسے ہوا۔ اس کی زبان بالکل گنگ ہوگئی تھی اگر وہ چیخنا بھی چاہتی تو ناکام رہتی۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے ترس آیا۔ چنانچہ میں نے اپنا برقعہ اٹھا کر کہا'' گھبرائیے نہیں میں اب چلتا ہوں مذاق ختم ہوا'' جب میں نے وہاں سے چلنے کا قصد کیا تو اس نے لرزاں آواز میں کہا'' ذرا ٹھہریئے''

میں ٹھہر گیا'' فرمائیے''

اس نے میرے بلاؤز کی طرف دیکھا جس میں سے گیند کے ٹکڑے نیچے

ڈھلک آئے تھے۔ شرم سے اس کے کان کی سانولی لویں سرخی مائل ہو گئیں لیکن بے اختیار اس کو ہنسی آ گئی میں بھی ہنس پڑا۔ اس کا خوف کچھ دور ہوا چنانچہ اس نے غیر لرزاں آواز میں کہا "آپ اس لباس میں گھر واپس جا سکیں گے۔۔۔۔۔۔؟"

میں نے جواب دیا "کیوں نہیں۔۔۔۔۔۔۔ آیا بھی تو اسی لباس میں تھا۔"

لیکن یہ کہتے ہی ایک دم اندرونی طور پر مجھے محسوس ہوا کہ میں اس لباس میں ہرگز ہرگز ایک قدم بھی نہ اٹھا سکوں گا۔

اس نے میرا جواب سن کر کہا "آپ سوچ لیجئے"

اور جب میں نے سوچنا شروع کیا تو یہ احساس اور زیادہ پختہ ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ ساڑھی اتار دوں لیکن بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں تو میں بالکل اسٹیج کا مسخرہ بن جاتا۔ پھر خیال آیا کہ سب کچھ اتار دوں اور ساڑھی کا تہمد بنا لوں مگر لوگوں کی نگاہیں اور بھی میری طرف اٹھتیں۔ پھر سوچا کہ جیسے آیا تھا ویسے ہی چلوں مگر برقعے کا تصور اب ایک بہت بڑا بوجھ محسوس ہونے لگا میں نے گھبرا کر اس سے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو یہاں تھوڑی دیر بیٹھ جاؤں"

اس نے درخواست رد نہ کی "تشریف رکھئے" لیکن فوراً ہی اسے کوئی خیال آیا اور وہ مضطرب ہو گئی "نہیں اب آپ تشریف لے جائیے میرے فادر ان لا آن والے ہیں۔۔۔۔۔۔ میں بھول ہی گئی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جائیے، یہاں سے جلدی چلے جائیے"

میں اس قدر گھبرا گیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرے سارے کپڑے اتار کر کسی

نے مجھے ننگا کردیا ہے۔ میں بجائے اٹھنے کے اور جم کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر اس نے مجھ سے زیادہ گھبرا کر کہا "میرے فادران لا آنے والے ہیں۔۔۔۔۔بس اب وہ آتے ہی ہوں گے۔۔۔۔۔آپ چلے جائیے۔"

مجھے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ اسی غصے میں اس سے میں نے تیز لہجے میں کہا "تو میں کیا کروں اس لباس میں مجھ سے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جائے گا۔"

موقع کی نزاکت کے باوجود اسے ہنسی آگئی لیکن میری سنجیدگی ویسی کی ویسی قائم رہی۔ اس نے چند لمحات غور کیا اور پھر کہا "آپ یہ اچکن پہن لیجئے۔ میں آپ کو قمیض اور پائجامہ نکال دیتی ہوں مگر پرماتما کے لیے جلدی کیجئے اب کچھ سوچئے نہیں"

اس نے میرے جواب کا انتظار نہ کیا چارپائی کے نیچے سے ایک ٹرنک کھینچ کر نکالا، اس میں سے جلدی جلدی اس نے ایک قمیض نکالی۔ پائجامہ وہ دیر تک ڈھونڈتی رہی مگر اسے نہ ملا۔ میں اس دوران میں بلاوز اتار کر قمیض پہن چکا تھا۔ جب پائجامہ نہ ملا تو اس نے کہا "آپ یہیں ٹھہریئے، میں پائجامہ اتار کر آپ کو دے دیتی ہوں" یہ کہہ کر وہ پھرتی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ دو منٹ شدید قسم کے اضطراب میں گزرے، اس کے بعد وہ آئی پائجامہ دے کر وہ باہر چلی گئی۔ "اب جلدی پہن لیجئے"

میں نے افراتفری میں یہ پائجامہ پہنا، چونکہ چوڑیاں کافی زیادہ تھیں اس لیے کھینچ تان کر پورا آ ہی گیا۔ اتنے میں آواز آئی "پہن لیا"

میں نے کہا "ہاں پہن لیا"

یہ سن کر وہ اندر آئی اور کہنے لگی'' پرماتما کے لیے یہاں سے چلے جائیے۔۔۔۔۔مجھے ڈر ہے کہ وہ کہیں آ نہ جائیں''

میں نے اچکن پہنی برقعہ ہاتھ میں لیا اور وہاں سے چلنے ہی والا تھا کہ اس نے کہا'' یہ ساڑھی وغیرہ تو لیتے جائیے''

میں نے بلاؤز، ساڑھی کوٹ اور ربڑ کی گیند کے دونوں ٹکڑوں کو دیکھا اور باہر نکلتے ہوئے کہا'' یہ سب چیزیں یہیں پڑی رہیں'' اس نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا میں دروازے تک پہنچ گیا وہ میرے ساتھ ساتھ آئی، جب دروازہ کھول کر میں باہر نکلا تو اس نے مسکرا کر کہا'' آداب عرض کرتا ہوں۔''۔۔۔۔۔۔اس کے بعد میری اس سے ملاقات نہ ہوئی کیوں کہ وہ دوسرے روز ہی کہیں چلی گئی، نہ معلوم کہاں میں نے اس کا بہت کھوج لگایا مگر کچھ پتہ نہ چلا، اس کی اچکن اور پائجامہ ابھی تک میرے پاس محفوظ پڑا ہے۔شاید میری ساڑھی، بلاؤز اور پیٹی کوٹ بھی اس کے پاس ابھی تک محفوظ ہوں اور گیند کے وہ دو ٹکڑے بھی۔میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر یہ واقعہ ایسا نہیں کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھول سکے۔

اس لڑکے نے جس کو راہ چلتی لڑکیوں سے وقت پوچھنے میں مزہ آتا تھا ذیل کا واقعہ بیان کیا۔

'' میں جب بمبئی گیا تو وہاں سڑکوں پر ان گنت لڑکیاں دیکھ کر میری طبیعت بہت خوش ہوئی کیوں کہ ان میں سے اکثر اپنی کلائیوں پر گھڑی باندھتی تھیں۔ایک روز کا ذکر ہے، ناگ پاڑہ میں جہاں یہودیوں کی آبادی ہے، فٹ پاتھ پر میں

نے ایک پارسی لڑکی دیکھی۔ بڑی تیز قدمی سے وہ سامنے والی باٹلی والے ہسپتال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی گوری گوری کلائی پر کالے تسمے کے ساتھ گھڑی بندھی تھی۔ اس کے اور میرے درمیان تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا جو میں نے چٹکیوں میں طے کرلیا اس سے دو قدم آگے نکل کر میں دفعتاً مڑا ''تمہاری گھڑی ما کتنا واگا؟'' میں نے اس سے گجراتی زبان میں وقت پوچھا اس نے اپنی کلائی اونچی کی تو گھڑی ندارد ''ماری گھڑیاں کاں چھے''اس نے گھبرا کر کہا۔ میری گجراتی ختم ہوگئی میں نے اسے ہندوستانی میں جواب دیا'' آپ کی گھڑی مجھے کیا معلوم کہاں ہے؟'' صاحب اس نے تو چلانا شروع کر دیا ایک تو گجراتی زبان، اس پر اس پارسی لڑکی کا چیخ چیخ کر بولنا، میرے اوسان خطا ہو گئے۔ گھڑی میں نے چند منٹ پہلے اس کی کلائی پر دیکھی تھی، پر اب ایک دم خدا معلوم کہاں غائب ہوگئی تھی۔ وہ برابر کہے جا رہی تھی۔'' تمے اج لیدی ہے۔ ''یعنی تم نے ہی لے لی ہے اور میں اسے بے سود یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا'' میں نے آپ کی گھڑی نہیں لی ہے اگر میں نے آپ کی گھڑی لی ہوتی تو آپ سے وقت ہی کیوں پوچھتا۔۔۔اس کو بھی چھوڑیئے۔ میں نے گھڑی آپ کی کلائی سے کیسے اتار لی۔

اس کا شور سن کر فٹ پاتھ پر کئی یہودی اور کرسٹان جمع ہو گئے۔ میں ان میں گھر گیا۔ بھانت بھانت کی بولیاں شروع ہو گئیں۔ کبھی میں انگریزی میں اپنی بے گناہی ثابت کرتا، کبھی ہندوستانی میں، مگر سب اسی کے طرفدار تھے۔ میں سخت گھبرا گیا۔ قریب تھا کہ میں ان سب سے کہہ دوں تم جاؤ جہنم میں، نہیں مانتے تو نہ مانو

کہ میری نگاہ سڑک پر ایک چھوٹے سے بچے پر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں مجھے کالا فیتا نظر آیا۔ کالے جیتے کے ساتھ گھڑی بھی لٹک رہی تھی میں چلایا ''وہ دیکھو، اس بچے کے ہاتھ میں کیا ہے؟''

سب سے پہلے اس لڑکی نے بچے کی طرف دیکھا اور کہا ''میری گھڑی''

بچے کے ہاتھ میں گھڑی اسی کی تھی۔ ایک بڈھی یہودن نے بڑھ کر اس بچے سے گھڑی لی اور اس پارسی لڑکی کو دے دی۔ میں نے کوئی بات کرنی مناسب نہ سمجھی، اس لیے کہ اس وقت میں اپنے آپ کو ہیرو سمجھ رہا تھا۔

اس لڑکے نے جس کا یہ کہنا تھا کہ لڑکیاں چھیڑ چھاڑ پسند کرتی ہیں، یہ واقعہ بیان کیا۔

''جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ لڑکیاں ہماری چھیڑ چھاڑ پسند کرتی ہیں بلکہ بعض اوقات تو وہ ہمیں دعوت دیتی ہیں کہ ہم انہیں چھیڑیں اس واقعے سے جو میں اب بیان کرنے والا ہوں، آپ اس کی تصدیق کر سکیں گے۔ آج سے ڈھائی برس پہلے کا ذکر ہے جب میرے خیالات آج سے مختلف تھے، ان دنوں مجھ پر کسی سے عشق کرنے کی دھن سوار تھی۔ چنانچہ ہر وقت اداس اداس رہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے سارے وجود پر ایک نا قابل بیان اضمحلال طاری ہے۔ یہ اداسی اور یہ اضمحلال اس روز بہت ہی زیادہ بڑھ گیا جب مجھے اپنے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ وہ گلی میں ایک لڑکی سے عشق لڑا رہا ہے۔ اس کے عشق کی داستان سن کر مجھے بے حد افسوس ہوا۔ اس قدر رشک آیا کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اب میں نے ارادہ کر لیا کہ ہر روز اس گلی سے گزارا کروں گا اور اسی لڑکی سے رابطہ پیدا

کرنے کی کوشش کروں گا، یہ ارادہ میں نے اس لیے کیا کہ میری نظر میں کوئی ایسی لڑکی تھی ہی نہیں جس سے اس قسم کا رشتہ پیدا کیا جا سکتا ہو۔"

سو جناب، میں پندرہ بیس روز تک متواتر ایک ہی وقت پر اس گلی میں سے گزرتا رہا۔ وہ لڑکی اس دوران میں مجھے کئی بار نظر آئی۔ ہر مرتبہ اس نے میری طرف دیکھا مگر بات اس سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ آوارہ گرد کہیں کے تو ہر روز یہاں کے پھیرے کیوں کرتا رہتا ہے ------میرے اوسان خطا ہو گئے بخدا، میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ میرا حلق خشک ہو گیا۔ میں بمشکل یہ کہہ سکا۔ "میں ------میں ------میں تو کبھی ادھر سے نہیں گزرتا"

وہ ہنسی ------برقعے کی جالی میں سے اس کی آنکھیں مجھے نظر آئیں۔ میرا خوف دور ہو گیا، میں نے اپنا بازو چھڑا لیا اور اس کے کولہے پر اس زور سے چٹکی بھری کہ وہ بلبلا اٹھی "اللہ کرے مر جائیں ------تیرا ککھ نہ رہے" اس کا مطلب یہ تھا کہ خدا کرے تو مر جائے تیرا کچھ باقی نہ رہے --میرا سب کچھ باقی رہا، وہ بھی باقی رہی اس لیے کہ میرا خوف دور ہو گیا تھا اور اس کی خفگی نہ رہی۔

☆☆☆☆☆

کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی۔۔۔۔۔۔۔قطع تعلق بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔عداوت بھی ہے اور نہیں بھی۔عجیب وغریب مضمون ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد اور عورت کا باہمی رشتہ کیا ہے۔عورت کی طرف مرد کا میلان سمجھ میں آتا ہے لیکن مرد کی طرف عورت کا میلان جو ہے اور نہیں بھی ہے، سمجھ سے کچھ اونچا ہی رہتا ہے یعنی عورت مرد سے نفرت بھی کرتی ہے اور انجام کار اس سے محبت بھی کرتی ہے۔اس کی بدعنوانیوں کی مذمت کرتی ہے مگر اس کے باوجود ان عنوانیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

شادی ہی کو لیجیے جو کہ بہت عام چیز ہے، چاہیے تو یہ کہ لڑکی اپنی شادی پر خوش ہو۔لیکن ہونے والی دلہنوں کو کس نے گھڑی بنتے نہیں دیکھا، رونی آواز میں ان کے منہ سے ایسی باتیں کس نے نہیں سنیں، میری جوتی کو کیا غرض پڑی تھی، جو میں چق میں سے ان کو جھانک کر دیکھتی۔۔۔میں تو انہیں ہاتھ تک نہ لگانے دوں۔۔۔۔مفتوں کی ہاتھ لگ گئی ہوں جبھی تو اپنے دوستوں میں میری یوں ہتک کی گئی ہے۔۔۔۔۔آگ لگے میری جان کو۔۔۔۔نہیں بھئی میں تو عمر بھر کنواری رہوں گی۔۔۔۔امی جان نے تو اپنے سر کی بلا ٹالی ہے۔۔۔۔۔جانے کون ہیں، کون نہیں ہیں، گھر لے جاتے ہی مجھے قتل کر دیں۔۔۔۔اتنا پڑھایا لکھایا تھا اسی دن کے لیے کہ مجھے ایک نامحرم آدمی کے حوالے کر دیا جائے۔۔۔۔۔میں زہر کھا لوں گی۔۔۔لڑکیاں پرایا دھن ہوتا

ہے، بس یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ چار روز سے میرے منہ میں ایک کھیل تک نہیں گئی، کسی کو ترس نہیں آتا۔۔۔۔۔۔ نہیں میں یوں نہیں بیٹھوں گی۔۔۔۔۔ مجھ سے یہ کیوں کہا جا رہا ہے کہ نہاؤ، سجو، بنو۔۔۔ یہ سجا بنا کر مجھے کس کے حوالے کیا جا رہا ہے۔۔۔۔ میری بھتی کھایئے، مجھے ہائے ہائے کر کے پیٹئے اگر میری شادی کیجیے۔۔۔۔۔

آنکھوں میں آنسو بہتے ہیں، کئی کئی دن واقعی کھانا نہیں کھایا جاتا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہاتھوں پر مہندی لگوائی جاتی ہے، ڈھولک بجانے والی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھا جاتا ہے، گپیں اڑائی جاتی ہیں اور تخلیے میں اپنی سب سے عزیز سہیلی کے ساتھ کپکپی پیدا کرنے والی باتیں کی جاتی ہیں، آزمودہ نسخے نوٹ کیے جاتے ہیں، آنے والے حادثات کی تفصیلات ادھر ادھر سے اکٹھی کی جاتی ہیں اور۔۔۔۔۔ کیا کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔

مہندی لگے ہاتھ۔۔۔۔۔۔ مقیشی بال۔۔۔۔۔۔ لس لس کرتے بھاری جوڑے چمکیلے زیور چہرے کی اڑی رنگت، ریشمی گھونگھٹ۔۔۔ دل کی دھڑکنیں۔۔۔۔۔ شہنائیاں۔۔۔ باجے گاجے۔۔۔۔۔ دھوم دھڑکے۔۔۔۔ اس کے بعد حجلہ عروسی۔۔۔۔۔۔ خاموشیوں کے قفل جو کبھی کھلیں ہی نہیں۔ ادھر یکسر انکار، ادھر کبھی التجائیں، منتیں، خوشامدیں اور کبھی دھمکیاں ”لو اب خدا کے لیے مان بھی جاؤ۔۔۔۔۔ دیکھو ہم تم سے کبھی نہ بولیں گے۔۔۔۔۔ کچھ منہ سے تو بولو۔۔۔۔۔ قسم لے لو جو تمہیں پھر گدگداؤں، ایک فقط تم ہاں کر دو۔۔۔۔۔ خدا کی قسم میں تمہیں کچھ نہیں کہوں

گا۔۔۔۔۔۔آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔۔۔۔بھئی میں تو تھک گیا ہوں آخر ہمیں تھوڑی دیر آرام بھی تو کرنا ہے۔''

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔۔۔۔۔۔۔۔خاموشی تکلم میں تبدیل ہوئی'' نہیں آپ اپنے دوستوں کو ضرور ساری بات بتا دیں گے۔۔۔۔۔۔مجھے کہیں کا نہ رکھیں گے۔۔۔آپ کو خدا کی قسم جو آپ نے کچھ کہا۔ ہائے، میں کیسی بے حیا ہوں۔۔۔۔آپ دل میں کیا کہتے ہوں گے، چٹاخ چٹاخ باتیں کر رہی ہے۔۔۔۔۔خدا کرے مجھے موت آ جائے۔۔۔۔۔ضرور دروازے کے باہر کوئی کھڑا ہے۔اب میں کیا کروں۔۔۔۔۔۔۔۔۔زبردستی نہ کیجئے میری کلائی ٹوٹ جائے گی۔ آپ کتنے بے رحم ہیں۔ دیکھئے میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔۔۔خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دیجئے۔۔۔۔۔میں مر جاؤں گی۔۔۔۔۔مجھے بخش دیجئے۔۔۔۔۔صرف آج کے روز بخش دیجئے۔۔۔۔۔۔پھر آپ جو کہیں گے میں مان لوں گی۔۔۔۔۔''

ایسی باتیں کون مانتا ہے آخر وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ہر جوان لڑکی سے جلد یا بدیر یہی سانحہ پیش آتا ہے۔مردوں کی بدعنوانیوں کے متعلق ساری شکایتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور ایک ہی رات میں وہ تمام منزلیں طے کر لی جاتی ہیں جن کے متعلق سوچنا بھی کبھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔

شادی کے دوسرے روز ہی وہ مرد جس کو برا بھلا کہا جاتا تھا، عزیز ترین رفیق بن جاتا ہے''انہوں نے کہا تھا کہ تم سیدھی مانگ نکالا کرو۔۔۔۔۔صبح سے کہیں

باہر گئے ہیں، ابھی تک لوٹے نہیں ۔۔۔۔۔۔اللہ خیر کرے ۔۔۔۔۔ یہ سلیپنگ سوٹ انہوں نے مجھے دیا ہے، کہتے تھے رات کو سوتے وقت دوسرے کپڑوں کی بجائے اب اسے ہی پہنا کرو۔۔۔۔۔نہیں بھئی میں پان نہیں کھاؤں گی، انہوں نے منع کیا تھا۔۔۔۔ان کو آج تک کبھی وقت پر چائے نہیں ملی تھی ۔ جب میں نے یہ سنا تو خدا کی قسم میرے دل کو بہت وہ ہوا۔۔۔۔۔صبح اٹھ کر میں نے پہلا کام یہی کیا کہ ان کے لیے چائے بنوائی۔''

میں سمجھتا ہوں کہ مرد اور عورت کے درمیان صرف ایک رات حائل ہے۔ اگر یہ کالی چیز حائل نہ ہوتی تو خوباں سے چھیڑ چھاڑ کبھی پردہ ظہور پر نہ آتی۔ بہت ممکن ہے کہ مرد چھیڑتے وقت اس رات کو بھول جاتا ہو مگر عورت جب چھیڑتی ہے یا جب کسی عورت کو چھیڑا جاتا ہے تو رات جھٹ اس کی نظر کے سامنے آجاتی ہے۔

سارا فساد اسی رات کا ہے جس نے انسانی زندگی کو کئی خوبصورت روشنیوں سے متعارف کرایا ہے۔ چھیڑ چھاڑ انہی روشنیوں میں سے ایک روشنی ہے، جسے پھلجڑی کہنا بجا ہوگا۔ میں اس کے متعلق مضمون میں نوجوان مردوں کے تاثرات بیان کر چکا ہوں، اس مضمون میں نوجوان لڑکیوں کا ردعمل بیان کیا جائے گا۔

یہ ردعمل معلوم کرنے کے لیے میں نے ذیل کا سوالیہ تیار کیا

1 مردوں کی چھیڑ چھاڑ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔۔۔آپ اسے پسند کرتی ہیں یا ناپسند؟۔۔۔۔۔۔پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی وجہ بیان کیجئے؟

2 جب آپ کو چھیڑا جاتا ہے تو آپ کیا کرتی ہیں؟

3 آپ کو کیوں چھیڑا جاتا ہے؟

4 کیا آپ مردوں کو نہیں چھیڑتیں؟

5 کوئی ایسا واقعہ بیان کیجئے جو اس چھیڑ چھاڑ سے متعلق ہو اور جس کا تاثر ابھی تک آپ کے حافظے پر قائم ہو؟

ظاہر ہے کہ عورتوں اور لڑکیوں سے براہ راست یہ سوال کرنے اور ان کا جواب حاصل کرنے میں مجھے بہت دقت پیش آئی ہوگی۔ خصوصاً کنواری لڑکیوں سے تو میں نے ڈرڈر کے یہ سوال کیے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح ان دقتوں اور مشکلوں کے باوجود یہ مضمون تیار ہو ہی گیا۔

عورتوں اور لڑکیوں کے تاثرات اور ان کا ردعمل بیان کرنے سے پہلے میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک جگہ تمام لڑکیاں اور عورتوں کو بلا کر میں نے یہ معلومات حاصل نہیں کیں۔ مجھے تین بڑے شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لاہور، بمبئی اور دہلی، ان تین شہروں میں مختلف اوقات پر میں ایک دو عورتوں سے ملا۔ ان سے دوستانہ بات چیت کی اور اپنے مطلب کی باتیں معلوم کر لیں۔

کل بارہ عورتوں سے میرا اس قسم کا انٹرویو ہوا جن میں سے دو بیاہی ہوئی تھیں باقی سب کنواری تھیں ان کی عمر کا اوسط سولہ سال سے زیادہ نہیں تھا۔

نو لڑکیوں نے جن میں سے دو بیاہی ہوئی بھی شامل تھیں، پہلے سوال کا بالکل ایک جیسا جواب دیا ''مردوں کی چھیڑ چھاڑ کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ ایسی فضول اور نازیبا حرکت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ پرائی بہو بیٹیوں کو چھیڑنا کہاں کی شرافت ہے۔ یہ صریحاً شہدہ پن ہے اس قسم کی حرکت صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اخلاق

حمیدہ سے عاری ہوتے ہیں جن کی آنکھوں میں شرم کا پانی بھی نہیں ہوتا۔ ہم اس چھیڑ چھاڑ کو صرف ناپسند ہی نہیں کرتیں بلکہ انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اس لیے ہماری آزادی میں یہ بے شمار رکاوٹیں پیدا کرنے کا موجب بنی ہوئی ہے۔ غضب خدا کا ہم ڈر کے مارے باہر سیر کو بھی نہیں جا سکتیں۔ باغ میں گھومنے کے لیے جائیں تو ہمیشہ اس بات کا کھٹکا رہتا ہے کوئی مردود ہمارے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دے گا اور ایسی بھوکی نظروں سے دیکھے گا کہ سیر کا سارا لطف، مزا کرکرا ہو جائے گا۔"

کسی پھول کی طرف دیکھئے تو جھاڑی کے عقب سے کن سری آواز آئے گی" انہیں منظور اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا تھا۔ چلیں ہیں سیر گل کو دیکھنا شوخی۔ یہ نگوڑے کچھ کرنے بھی دیں۔ یہ موئی چھیڑ چھاڑ ہے یا گندی موری کے چھینٹے۔ کوئی پکچر دیکھنے جاؤ تو سب کی گردنیں ہماری طرف مڑ جائیں گی۔ اندھیرا ہوتا ہے تو اس بات کا دھڑکا رہتا ہے کہ اپنی ٹانگ کھجلانے کے بہانے ساتھ والے لالہ جی ہماری ٹانگ کھجلانا شروع کر دیں گے۔ پکچر ختم ہونے پر باہر نکلتے وقت یہ اندیشہ لاحق رہے گا کہ کوئی صاحب کندھا مار کر نکل جائیں گے اور انگریزی میں افسوس کا اظہار کر دیں گے۔۔۔۔ کوٹھے پر بال سکھانے کے لیے جاؤ تو کوئی ہمسایہ اپنے چڑھے ہوئے پتنگ کی ڈور ڈھیلی کر کے بالوں میں الجھا دے گا۔ غصے میں آ کر ڈور پکڑ لو تو آواز آئے گی" لے لیجئے جتنی درکار ہے" بھنا کر ڈور کھینچنا شروع کی تو انہوں نے چرخی ہاتھ میں لے لی" کھینچتے جائیے جب تک آپ تھک نہ جائیں کیا کریں کیا نہ کریں ہم تو بہت عاجز آ گئے ہیں۔۔۔۔ ایک دکھ ہو تو

بتائیں۔۔۔۔

شاپنگ کے لیے جائیں تو اور مصیبتیں سر پر کھڑی ہوتی ہیں، دکاندار ہی آنکھیں سینک رہے ہیں اور اپنی حرص پوری کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی فقرہ بھی چست کر دیتا ہے ''کشمیر کے سیب ادھر بھی دیکھتے جایئے۔۔۔۔ انڈرویئرز کے نئے نئے ڈیزائن آئے ہیں، ملاحظہ فرماتے جایئے۔۔۔ ایک نظر ادھر بھی، بالکل نیا مال ہے۔۔۔۔۔'' اب ان مردوں سے کوئی کیا کہے جی تو اکثر یہی چاہتا ہے کہ اپنی چھتری ان ملعونوں کے حلق میں گھونس دیں یا ہینڈ بیگ منہ پر دے ماریں مگر بے کار کے فضیحتے سے ڈر لگتا ہے اس لیے مجبوراً خاموش رہنا پڑتا ہے۔۔۔۔ کوئی موٹر پاس سے گزرتی ہے تو اس کے اندر بیٹھے ہوئے تمام صاحبان گھورنا شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ حضرت یہ آپ کو کیا خبط سمایا۔ آپ کی موٹر جا رہی ہے، ہم بھی جا رہے ہیں، اس نظر بازی کا فائدہ۔۔۔۔۔

موٹر والوں کو چھوڑیئے، یہ کم بخت ڈلیا والے مزدور، جنہیں دہلی میں جھلی والے اور بمبئی میں پاٹیا والے کہتے ہیں، بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے ''میم صاحب، لایئے یہ پارسل میں اٹھالوں۔۔۔ یہ مرتبان مجھے دے دیجیے، میں اٹھا لیتا ہوں۔۔۔ ان سے کہا جاتا ہے ''نہیں بھئی! میں اتنی چھوٹی چیز کے لیے مزدور نہیں چاہتی'' جواب ملتا ہے ''میم صاحب! میں آپ سے پیسے تھوڑے ہی مانگتا ہوں۔'' اب بتایئے ان الو کے پٹھوں کو کیا جواب دیا جائے؟ سو سو آفتوں میں ہر وقت جان پڑی رہتی ہے۔۔۔۔۔ کوئی ٹھکانہ ہے اس عذاب کا خدا کرے نہ

رہیں ایسے لوگ اس دنیا کے تختے پر ناک میں دم کر رکھا ہے نابکاروں نے۔۔۔۔۔۔چھیڑ چھاڑ کو ناپسند کرنے کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ یہ ایک نہایت ہی لغو اور بے ہودہ حرکت ہے کہ جس کا سر ہے نہ پیر، ہمیں آخر کیا سمجھ لیا گیا ہے؟''

ان نو لڑکیوں میں سے ایک نے کہا مجھے اس چھیڑ چھاڑ سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی چوہوں سے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔۔۔۔۔

ایک اور نے کہا ''میں اس لیے یہ چھیڑ چھاڑ ناپسند کرتی ہوں کہ عورت اس کا جواب تھپڑ مارنے یا گالی دینے کے سوا کسی اور طریقے سے دے ہی نہیں سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں ہم سے نہیں ہوسکتیں۔ اسی واسطے ہم اس سے نفرت کرتی ہیں، راہ چلتے چھیڑا جائے تو اور بھی مصیبت ہے۔ اب کیا بیچ بازار کے تو تو میں میں شروع کر دی جائے۔ اصل میں عورت شروع سے دبی ہوئی ہے اس لیے بے چاری کچھ بھی نہیں کرسکتی ورنہ ایسے بدنیت مردوں کا علاج ہوسکتا ہے۔''

باقی تین لڑکیوں میں دو نے اسی سوال کے جواب میں کہا۔ ہمیں یہ چھیڑ چھاڑ ناپسند نہیں مگر وہ چھیڑ چھاڑ یقینی ناپسند ہے جو بالکل تہذیب سے گری ہو یعنی جس میں انتہا درجے کا بھونڈا پن ہو۔ آنکھیں مارنا، کندھے رگڑنا، سلام کرنا، دور سے اشارہ بازی کرنا، فحش مذاق کرنا، یہ سب ہمیں ناپسند ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک آنکھ میچ لینے سے کیا ہوتا ہے۔ چھیڑنے کا یہ طریقہ بہت ہی بازاری اور عامیانہ ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ ''کیوں، تمہاری کیا صلاح ہے؟'' یہ مذاق نہیں بلکہ ایک نہایت ہی ادنیٰ کاروباری سوال ہے ایسا بھدا

اشارہ ہے جو خوش ذوق آدمیوں کو ہرگز استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں بنیا پن ہے اور کندھے رگڑنا یا دھکے مارنا اکھاڑوں میں ہونا چاہیے۔ چھیڑ چھاڑ گشتی گیری نہیں اور بھئی کیا پتہ ہے دھکے سے کوئی اوندھے منہ گر پڑے، کوئی جوڑ نکل پڑے، کوئی ہڈی ٹوٹ جائے، ہنسی میں کھنسی ہو جائے اور جناب سلام کا تو کوئی مطلب ہی نہیں۔ یہ کیا ہے کہ بار بار ہاتھ جوڑے جا رہے ہیں۔ ماتھے کی طرف ہاتھ لے جایا جا رہا ہے، مذاق شستہ ہونا چاہیے، کوئی اس میں بات ہو نہ کہ صرف چھیڑ دیا جائے۔ کوئی پتھر اٹھا کر سر پر مار دیا جائے، پسلیوں میں ٹھونکا دے دیا جائے۔۔۔ کوئی ذائقہ دار بات ہونی چاہیے جس سے دل و دماغ کو فرحت ہو، شگفتگی سی پیدا ہو۔۔۔ آدمی ایک دو گھڑی کے لیے خوش ہو جائے، ایسی چھیڑ چھاڑ ہمیں پسند ہے اور خدا کرے کہ یہ ہمیشہ جاری رہے۔ اس سے بڑا لطف حاصل ہوتا ہے۔ جوانی کی داستان میں اس قسم کے چٹکلے ضرور ہونے چاہئیں یہ نہ ہوں تو کہانی بالکل خشک اور بے مزہ ہوگی۔

ان دو لڑکیوں میں سے ایک نے یہ بھی کہا ''بدصورت اور کریہہ المنظر مردوں کو تو چھیڑنے کا کوئی حق ہی نہیں۔ اگر وہ چھیڑنا ہی چاہتے ہیں تو ایسی عورتوں کو منتخب کیا کریں جو ان کا جوڑ ہوں یا بدصورتی میں ان سے کچھ زیادہ ہی نمبر لیتی ہوں۔ بدصورت مردوں کا خوش شکل عورتوں کو چھیڑنا میرے نزدیک ایک بہت بڑا جرم ہے۔ میں خوبصورت نہیں ہوں لیکن وہ صدمہ جو خوش شکل عورتوں کو ایسے مردوں کی چھیڑ چھاڑ سے ہوتا ہے اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں۔''

بارھویں یعنی آخری لڑکی نے اس سوال کے جواب میں کہا ''مردوں کی چھیڑ

چھاڑ کے متعلق میرا خیال بہت اچھا ہے۔ مجھے یہ چیز پسند ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں بہت شریر ہوں میں چاہتی ہوں کہ مرد مجھے چھیڑیں تا کہ جواب میں ان کو میں بھی چھیڑ سکوں۔ وہ عورتیں جو سمجھتی ہیں کہ ہم مردوں کو چھیڑ نہیں سکتیں، بے وقوف ہیں۔ وہ سوچتی ہی نہیں کہ مردوں کو اتنی سہولتیں میسر نہیں جتنی کہ ہمیں ہیں۔ ہمارا جوابی حملہ انہیں بوکھلا سکتا ہے، ان کی سٹی گم کر سکتا ہے، انہیں لاجواب کر سکتا ہے اس لیے کہ ہم عورتیں ہیں ان کو اس کا ہر حالت میں لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ مرد عورت کو کمزور، کم زبان اور کم عقل سمجھتا ہے، اس کے اس نظریئے سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے۔ عورت کمزور سہی لیکن وہ کم زبان اور کم عقل تو نہیں۔ اپنی عقل اور اپنی زبان سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا۔ جائے۔ میں سمجھتی ہوں کہ مردوں کے مقابلے میں ہم عورتیں کہیں زیادہ ذہین اور طباع ہیں۔ ہم اگر چاہیں تو مردوں کی زبان بند کر سکتی ہیں، ان کی ساری چالاکی ختم کر سکتی ہیں۔۔۔۔۔ عورت کے سامنے مرد حیثیت ہی کیا رکھتا ہے۔ عورت سے دور مرد سب کچھ ہے پر جب وہ عورت کے سامنے آتا ہے تو کشکول اٹھانے والا بھکاری بن جاتا ہے کیوں کہ عورت سے وہ سوائے خیرات کے اور مانگتا ہی کیا ہے۔ مرد کے لیے عورت بہت دلچسپ چیز ہے، عورت کے لیے مرد بھی کم دلچسپ چیز نہیں اور میرا تو یہ خیال ہے کہ ایسی دلچسپ چیز خدا نے پیدا ہی نہیں کی۔ اکثر عورتیں مرد کو ان کی آنکھوں سے دیکھتی ہیں جن سے وہ اپنے باپ اور بھائیوں کو دیکھنے کی عادی ہیں۔ یہ غلطی ہے، سب مرد، باپ اور بھائی تو نہیں ہوتے۔''

دوسرے سوال کا جواب پہلی نو میں سے پانچ لڑکیوں نے اس طور پر دیا ''ہم

نفرت سے منہ پھیر لیتی ہیں یا دل ہی دل میں ان کو کوس کر خاموش ہو جاتی ہیں''

نو میں سے باقی چار لڑکیوں نے کہا ''اگر اکیلی ہوں یعنی ساتھ کوئی مرد نہ ہو تو مجبوراً خاموش ہو جانا پڑتا ہے لیکن اگر کوئی ساتھ مرد ہو تو اس کی مدد لے لی جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر ساتھ والے مرد اکثر یہی کرتے ہیں ''تمہیں شرم نہیں آتی۔۔۔۔۔ کیا تمہاری ماں بہن نہیں'' یوں شرم دلانے پر ہماری تسلی ظاہر ہے کہ خاک بھی نہیں ہوتی مگر کیا کیا جائے ہر بازار جھگڑا کرنے سے تو ہم رہیں۔''

ان چار لڑکیوں میں سے ایک نے کہا ''نہیں بابا میں تو خاموش نہیں رہ سکتی اگر کوئی مرد میرے ساتھ ایسی حرکت کرے تو میں لڑنے مرنے پر اتر آتی ہوں۔ مجھ میں ذرہ بھر برداشت کا مادہ نہیں ہے۔ میں تو گالیوں کا تانتا باندھ دیا کرتی ہوں اور مجال ہے کہ چھیڑنے والے چوں بھی کر جائے۔ شریف عورتوں سے دل لگی کرنا خالہ جی کا گھر تو نہیں۔ اور بھئی اپنے دل کی بھڑاس تو ضرور نکال لینی چاہیے۔ چاہے اس میں اپنی بدنامی ہی کیوں نہ ہو''

اسی سوال کا جواب باقی تین لڑکیوں نے ترتیب وار یوں دیا۔

1 اگر چھیڑ چھاڑ شستہ اور تہذیب کے دائرے کے اندر ہو تو میں مسکرا دیا کرتی ہوں، بس ذرا سی مسکراہٹ جس سے صرف داد کا اظہار ہو، ہونٹوں اور آنکھوں میں پیدا کی اور چل دیئے۔ مردوں کو زیادہ منہ نہیں لگانا چاہیے کیوں کہ زیادہ منہ لگانے سے یہ اکثر بگڑ جاتے ہیں۔ چھیڑ چھاڑ کرنے والا یقینی طور پر عورت کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے، جب اسے اپنی حماقت کا جواب مل جاتا ہے تو دل ہی دل میں خجل ہو کر ایک طرف سمٹ جاتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ

مرد خواہ کتنا ہی ذلیل ہو اس کے اندر شرم و حیاء کا مادہ ضرور ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب کوئی عورت ان کو شرمندہ کرنے کی کوشش کرے تو وہ ضرور شرمندہ ہو جاتا ہے۔

2 اگر چھیڑ چھاڑ نہایت ہی عامیانہ اور بازاری قسم کی ہو تو میں نہ چھیڑنے والے کی طرف غور کرتی ہوں نہ اس کے فعل کی طرف ایسے بدذوق لوگوں کو اہمیت دینا بہت بڑی غلطی ہے۔ البتہ خوش ذوق مردوں کی چھیڑ چھاڑ کی رسید ضرور دینی چاہیے۔ صرف رسید، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بدشکل مردوں کی چھیڑ چھاڑ کا جواب میں اپنی زبان نکال کر دیا ٹھینگا دکھا کر دیا کرتی ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ نفرت اور حقارت کا کوئی اور اچھا ذریعہ اظہار مل جائے مگر ٹھینگا دکھانے سے زیادہ آسان، باا ثر اور قریب ذریعہ اظہار مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ دراصل کہنا یہ ہوتا ہے ”یہ منہ اور مسور کی دال ۔۔۔۔۔۔ ذرا آئینے میں رخ مبارک تو دیکھئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے Gig Saw Puzzle نہایت ہی بھونڈے پن سے جوڑنے کی کوشش کی ہے“ بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے یہی وجہ ہے کہ خود بخود ٹھینگا ان کی جانب اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دل کو تھوڑی سی تسکین حاصل ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ یہ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی کہ انگوٹھے کو ان جذبات سے کیا تعلق ہے۔

3 میں مرد کے ہر جملے کا جواب دینے کی قائل ہوں خواہ وہ کتنا ہی اوچھا کیوں نہ ہو، میں چاہتی ہوں کہ ہر عورت اسے اپنا اصول بنالے۔

تیسرے سوال یعنی ”آپ کو کیوں چھیڑا جاتا ہے؟“ کے جواب میں پہلی نو

لڑکیوں اور عورتوں نے کہا'' جانے ہماری بلا۔۔۔۔۔۔بری عادت جو ہوئی۔ جن لوگوں کے اخلاق بگڑ جائیں ایسی حرکتیں ہی تو کرتے ہیں۔ ایک دفعہ اگر ان کا دماغ جوتوں سے پلپلا کر دیا جائے تو آئندہ کبھی ان کو جرأت نہ ہو۔''

باقی تین لڑکیوں نے ترتیب وار اس سوال کے جواب میں یہ کہا۔

1 ہم عورتوں اور مردوں کے درمیان ایک نہایت ہی لطیف پردہ حائل ہے۔ اس شفاف پردے میں سے مرد اکثر ہماری طرف تعجب آمیز دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ شیشے کی الماری میں رکھی ہوئی چیزیں خواہ مخواہ دلچسپ ہو جاتی ہیں۔ ہم شیشے کی الماریوں میں رکھی ہوئی نمائشی چیزیں ہیں مگر لطف یہ ہے کہ ہمیں ان الماریوں میں خود مردوں ہی نے بند کر رکھا ہے۔

2 جس بینچ پر لکھا ہو'' روغن گیلا ہے'' اس کو انگلی سے چھو کر ضرور دیکھا جائے گا۔ جس دیوار پر حکم امتناعی لکھا ہو'' یہاں اشتہار لگانا منع ہے'' اس پر اشتہار ضرور چسپاں کیے جائیں گے۔ جس راستے پر'' یہ شارع عام نہیں'' کا بورڈ لگا ہو اس راستے سے لوگ ضرور گزریں گے۔۔۔۔عورت بھی ایک قسم کا گیلا روشن ہے، وہ دیوار ہے جس پر اشتہار لگانا منع ہے یا وہ سڑک ہے جس پر یہ شارع عام نہیں کا بورڈ لگا ہے۔

3 ہمیں اس لیے چھیڑا جاتا ہے کہ ہم چھیڑنے کی چیزیں ہیں۔ اگر مرد ہمیں نہ چھیڑیں تو کسے چھیڑیں۔۔۔۔۔۔۔گھوڑیوں کو؟

چوتھا سوال یہ تھا۔۔۔۔'' کیا آپ مردوں کو چھیڑتی ہیں؟'' اس کا جواب میں نے پہلی نو لڑکیوں سے پوچھنا مناسب خیال نہ کیا۔

باقی تین لڑکیوں میں سے پہلی دو نے کہا ''ہم نے آج تک اس معاملے میں کبھی پہل نہیں کی۔ دراصل ہم ڈرپوک ہیں کئی دفعہ جی چاہا کہ چھیڑ خانی کی جائے مگر ہمت نہیں پڑی۔ ایک بات یہ بھی ہے پہل مردوں ہی کی طرف سے ہونی چاہیے۔''

آخری لڑکی نے کہا'' کیوں نہیں، میں ضرور چھیڑتی ہوں۔ جب موقع ملے، چھیڑتی ہوں اگر موقع نہ ملے تو موقع پیدا کر لیتی ہوں۔۔۔۔ موقعے پیدا کرنے عورت کے لیے کیا مشکل ہیں۔ مرد کو تو موقع کی تلاش میں گھنٹوں ضائع کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے اندر جرأت پیدا کرنا پڑتی ہے۔ ساری اونچ نیچ پر غور کرنا پڑتا ہے مگر عورت یہ ابتدائی مرحلے طے کئے بغیر اپنا کام کر سکتی ہے۔ مرد کے چہرے پر ان ابتدائی تیاریوں کے آثار نظر آ جاتے ہیں یعنی وہ کچھ مضطرب سا، کچھ بے وقوف سا دکھائی دیتا ہے جونہی یہ آثار نظر آئیں عورت کو فوراً اپنا پستول چلا دینا چاہیے۔ اس کی ساری تیاریاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ میں تو اکثر یہی کیا کرتی ہوں یوں میں نے کئی شکاری شکار کرنے سے پہلے شکار کیے ہیں۔''

آخری سوال کے جواب میں پہلی نو لڑکیوں اور عورتوں میں سے صرف چار مندرجہ ذیل واقعات بیان کر سکیں۔

ایک نے کہا میں سکول میں پڑھتی تھی اور ہر روز تانگے پر جاتی تھی۔ ایک دن میں نے تانگہ سٹیشنری کی دکان پر ٹھہرایا کیوں کہ مجھے کوہ نور پنسل لینا تھی۔ مجھے معلوم ہیں، سائیکل پر ایک لڑکا میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ جب میں نے پنسل نکالنے کے لیے دکاندار سے کہا تو وہ جھٹ سے آگے بڑھا اور دکاندار سے کہنے لگا''

ایک پنسل کوہ نور میرے لیے بھی'' دکاندار دو پنسلیں نکال کر لے آیا'' کتنے پیسے؟'' اس لڑکے نے پوچھا دکاندار نے جواب دیا'' ساڑھے تین آنے'' لڑکے نے پنسل پھینک دی اور کہا'' تم نے تو صریحاً لوٹ مچا رکھی ہے دوسری دکان پر پنسل تین آنے میں ملتی ہے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا'' آیئے میں آپ کو وہ دکان دکھا دوں'' میرے انتظار کا جواب دیئے بغیر اس نے سائیکل کے پیڈل پر پیر رکھا اور کوچوان کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے چل پڑا۔ میں نے دل میں سوچا۔ یہ دکاندار واقعی بہت گراں فروش ہے ضرور اس پنسل میں یہ دو پیسے زیادہ منافع لے رہا ہے۔ چنانچہ تانگہ اس لڑکے کی سائیکل کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ تھوڑی ہی دور چل کر وہ سائیکل پر سے اترا اور مجھ سے کہنے لگا'' یہ دکان ہے'' پھر اس نے دکاندار سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ کہا'' مولوی صاحب کوہ نور کی دو پنسلیں نکالئے گا'' دکاندار فوراً پنسلیں نکال کر لے آیا اس پر اس لڑکے نے مجھ سے کہا'' اس کو تین آنے دے دیجئے'' میں نے تین آنے ادا کر دیئے لڑکا سامنے سکول میں داخل ہو گیا اور میں آگے چل دی۔

سکول جا کر میں نے ایک سہیلی سے بات کی اس نے کہا'' کوہ نور کی پنسل تو ہر جگہ ساڑھے تین آنے میں ملتی ہے، اس دکاندار نے تین آنے میں کیسے دی'' میں نے کہا'' تم میرے ساتھ چلو میں تمہیں اس سے لے دوں گی'' سکول کا ٹائم ختم ہونے سے پہلے پہلے چار لڑکیاں میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئیں ہم سب اس دکان پر گئیں میں نے چار پنسلیں ان کو اسی دام پر لے دیں دوسرے روز چھ میں نے اپنے بھائی جان کے لیے خریدیں۔ شام کو جب میں اپنی استانی کے لیے بارہ

پنسلیں خریدنے کے لیے اس دکان پر پہنچی تو دکاندار نے کہا ''وہ صاحب جو اس روز آپ کے ساتھ آئے تھے، چھ آنے جمع کرا گئے تھے، ایک پنسل انہوں نے لی تھی، اس کے پورے دام انہوں نے دے دیئے تھے۔ گیارہ پنسلیں آپ نے لیں۔ تین آنے کے حساب سے چھ آنے میں سے جو انہوں نے یہ کمی پوری کرنے کے لیے جمع کرائے تھے، دو پیسے باقی بچتے ہیں آپ ایک پنسل لے جا سکتی ہیں ۔۔۔۔ یہ سن کر مجھے بے حد شرم آئی اور غصہ بھی بہت آیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے یہ شرارت کیوں کی۔ یہ واقعہ اسی وجہ سے مجھے اب تک یاد ہے۔''

دوسری نے کہا ''میرے پیٹ میں تھا۔ ہم لوگ پہلی مرتبہ قطب دیکھنے گئے تھے۔ وہ آگے آگے تھے اور میں آہستہ آہستہ ان کے پیچھے سیڑھیاں طے کر رہی تھی۔ ایک اندھیرا تھا دوسرے میری طبیعت خراب تھی۔ قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا۔ دم پھول رہا تھا اور سر چکرا رہا تھا۔ ان تمام مصیبتوں کے باوجود میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ آخری منزل تک ضرور پہنچوں گی خواہ راستے ہی میں دم نکل جائے لیکن دوسری منزل تک پہنچتے پہنچتے میری طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ مجھے دیوار کا سہارا لے کر رکنا پڑا۔ دو نوجوان لڑکے میرے پیچھے آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا ''اگر قطب الدین ایبک کو اس بات کی خبر ہوتی تو لاٹھ کے بجائے اس نے یقیناً میٹرنٹی ہوم تعمیر کرایا ہوتا۔'' ۔۔۔۔۔۔ دانت پیس کر ہی تو رہ گئی ان اللہ کے ماروں کو مذاق بھی کب سوجھتا ہے۔''

تیسری نے کہا ''پتا جی کی تبدیلی لاہور ہوئی تو ہم نے ۔۔۔۔۔ میں ایک

مکان کرائے پر لے کر رہنا شروع کیا۔ سردیوں کا موسم آیا تو میں پہلی مرتبہ دھوپ سینکنے کے لیے کوٹھے پر چڑھی۔ سامنے ہی ایک اور کوٹھا تھا۔ وہاں ایک لڑکا کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔ مجھے اس کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا چنانچہ میں نے فوراً آواز دی "ماتا جی! لڑکے نے جب یہ آواز سنی تو جوڑے ہوئے ہاتھ کھول دیئے اور بازو پھیلا کا ورزش شروع کر دی۔ بانہوں کے بعد اس نے ٹانگوں کی ورزش کی اور دس منٹ کے بعد مجھے دیکھتا ہوا نیچے اتر گیا۔ اس کی اس دلچسپ حرکت پر مجھے بے حد ہنسی آئی۔ اس واقعے کو چار برس گزر چکے ہیں۔ مگر جب کبھی میں اس لڑکے کے بستہ ہاتھوں کا تصور کرتی ہوں جو میرے "ماتا جی" کہنے پر ورزشی انداز میں کھل گئے تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔

چوتھی نے کہا "ہم ہر روز سکول سے فارغ ہو کر ایک قطار میں واپس آیا کرتی تھیں۔ سکول پرائیویٹ قسم کا تھا۔ ہمارے ساتھ ہیڈ ماسٹر بھی ہوا کرتا تھا۔ ایک روز اسی طرح ہم واپس آ رہی تھیں کہ ہال بازار میں ہماری چار لڑکیوں سے مڈ بھیڑ ہوئی جو غالباً ہاکی کھیلنے جا رہے تھے کیونکہ ہر ایک کے ہاتھ میں اسٹک تھی ان لڑکوں میں سے ایک نے ہم سب کو گھور گھور کے دیکھا۔ ہم میں بہت چھوٹی بھی تھیں۔ ان کی طرف اس نے غور نہ کیا جو جوان تھیں ان کو اس نے بلند آواز میں گننا شروع کر دیا۔ "ایک ـــــــ دو ـــــــ تین ـــــــ چار ہیڈ ماسٹر صاحب یہ دیکھ کر فوراً آگے بڑھے "تمہیں شرم آنی چاہیے" لڑکے نے جیسے ہیڈ ماسٹر صاحب یہ دیکھ کر فوراً آگے بڑھے "تمہیں شرم آنی چاہیے" لڑکے نے جیسے ہیڈ ماسٹر صاحب کی بات سنی ہی نہیں کہنے لگا" پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو،

دس ۔۔۔۔۔۔۔ دس گول، ہاف ٹائم میں دس گول کون یقین کرے گا۔‘‘ ہیڈ ماسٹر صاحب خاموش ہو گئے۔ انہوں نے دل میں سوچا ہوگا کہ چلو اچھا ہوا جو اس نے میری بات نہ سنی ورنہ خواہ مخواہ جھگڑا ہو جاتا ۔۔۔۔۔۔ مجھے اس لڑکے کی یہ چالاکی کبھی نہیں بھولے گی۔ بات کا کاٹا بدلتے وقت اس کے چہرے پر مجال ہے جو ذرہ بھر گھبراہٹ نظر آئی ہو۔

باقی تین لڑکیوں نے آخری سوال کے جواب میں ترتیب وار ذیل کے واقعات بیان کیے۔

1 یہ بمبئی کی بات ہے میں اور میری سہیلی دونوں بس میں ماہم کا میلہ دیکھنے جا رہی تھیں۔ موسم بہت اچھا تھا، شام کا وقت تھا، ہم بالائی منزل پر تھیں اس لیے ہوا کے جھونکے خوب مزے دے رہے تھے۔ جب بس داور کے پل پر چڑھی تو ادھر ادھر ریلوے لائنوں کا ایک جال سا بکھرا نظر آیا۔ میرے اس طرف دوسری رو میں ایک خوش شکل نوجوان لڑکا بیٹھا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں کے چھلے بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا اور اپنے ساتھی سے کہا ’’ہاتھی ۔۔۔۔۔ سفید ہاتھی‘‘ میں نے اپنی سیٹ پر سے ذرا اٹھ کر اس طرف دیکھا مگر مجھے ہاتھی نظر نہ آیا اس پر اس لڑکے نے مجھ سے مخاطب ہو کر بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا ’’اسے تخیل کی فسوں کاری کہتے ہیں‘‘ بات بڑی معمولی ہے مگر یہ واقعہ میرے دل و دماغ میں ہمیشہ کے لیے مرتسم ہو چکا ہے۔ اسے تخیل کی فسوں کاری کہتے ہیں اس گورے چٹے لڑکے نے یہ فقرہ ایسے دلکش انداز میں کہا کہ میں بے حد متاثر ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں مصنوعی شاعرانہ پن تھا۔ چہرے پر ایک

عجیب قسم کی قلندرانہ متانت تھی۔ پھر مجھے مسکراتا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر جو تبسم پیدا ہوا، اس میں اچھی بنی ہوئے چائے کی سی گھلاوٹ تھی۔۔۔۔۔

2 ''سردیوں کا موسم تھا۔ رگوں میں خون منجمد ہوا جاتا تھا۔ انہی دنوں میں ہمارا ایک دور کا رشتہ دار ملازمت کی تلاش میں آیا اور کچھ دیر ہمارے پاس ٹھہرا۔ یہ لڑکا جس کی عمر بائیس برس کے قریب ہوگی۔ اچھے ڈیل ڈول کا تھا، بھرا بھرا جسم جو کسی حد تک موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ گال سرخ، رنگ سفید جیسا کہ عام طور پر کشمیریوں کا ہوتا ہے۔ دودھ پینے کا بہت قائل تھا۔ آتے ہی اس نے امی جان سے کہا'' آپ کو تکلیف تو ضرور ہوگی مگر میں ناشتے پر ایک گلاس دودھ اور دو کچے انڈے ضرور پیا کرتا ہوں کھاتا بھی خوب ہوں۔''

اس کو ورزش کا بھی شوق تھا چنانچہ صبح اٹھ کر ڈمبلوں سے ایکسر سائز کرتا تھا اور اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے نہانا فخر سمجھتا تھا۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا'' اتنی سردی میں ٹھنڈے برف پانی سے نہانا کیا ضروری ہے اور پھر ہر روز؟'' اس کے جواب میں اس نے اپنی چھاتی چوڑی کرتے ہوئے کہا'' مجھے تو بالکل سردی محسوس نہیں ہوتی خدا جانے آپ لوگوں کے دانت کیوں بجتے رہتے ہیں ادھر میری طرف دیکھیے صرف ایک قمیص پہنے ہوں، نیچے بنیان بھی نہیں۔ بہت زیادہ سردی ہو تو چند دنوں کے لیے یہ تکلف کرنا پڑتا ہے ورنہ کبھی نہیں۔''

تین چار روز تک اس نے ہم سب پر اس طرح رعب گانٹھا، جب ملازمت نہ ملی تو مایوس ہو کر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور کچھ چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ مجھے چونکہ ہر روز نہانے سے اور دودھ پینے سے سخت نفرت ہے اس لیے میں نے اس سے بدلہ

لینے کی ٹھانی۔ اس کے اور میرے درمیان جو باتیں ہوئیں، میں بیان کرنا نہیں چاہتی۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ ہم نے ایک رات کوٹھی کے باہر اصطبل میں ملنا طے کر لیا۔ اب کچھ اصطبل کے متعلق، یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے جسے اباجی اصطبل کہا کرتے ہیں۔ اس میں ایک عدد گائے بندھی رہتی ہے۔ رات کے بارہ بجے یعنی مقررہ وقت پر وہ اپنے کمرے سے کھسک کر اصطبل کے پاس آ گیا۔ میں بھی کسی نہ کسی طریقے سے وہاں پہنچ گئی تھی۔ جونہی وہ آیا میں نے اسے اصطبل کے اندر داخل کر دیا ’’آپ کچھ دیر یہاں کھڑے رہیں، میں کوٹھی کے اندر جا کر اپنا اطمینان کر آؤں ممکن ہے کوئی جاگتا ہو‘‘

اس نے جب گائے کو دیکھا تو ٹھٹکا ’’میں نے مسکرا کر کہا آپ کو تو اس کے دودھ سے بہت پیار ہے ڈرتے کیوں ہیں میں ابھی آئی‘‘ میں نے اس کو اندر داخل کیا اور باہر سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔

صبح چھ بجے کے قریب اتفاقاً جب میری آنکھ کھلی تو مجھے اس کا دھیان آیا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ دوڑی دوڑی گئی کواڑ کے ایک سوراخ سے میں اندر دیکھا۔ وہ گائے کا کالا اور کھردرا کمبل اوڑھے گائے پر بیٹھا تھا میں نے دروازہ کھولا اور اس سے کہا ’’معاف کیجئے گا میں نے واپس آنے کی بہت کوشش کی مگر امی جان نے مجھے اپنے ساتھ لٹا لیا۔ انہیں بہت سردی لگ رہی تھی۔ میں کیسے آپ سے معافی مانگوں آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔‘‘

اس نے میری کسی بات کا جواب نہ دیا شکر ہے کہ گھر میں کسی کو اس واقعے کی خبر نہ ہوئی آٹھ بجے کے قریب اس نے نوکر کو بلایا اور کہا ’’آج میں گرم پانی سے

نہاؤں گا'' پھر نو بجے جب ناشتہ چنا گیا تو اس نے دودھ پینے سے انکار کر دیا ''میں آج چائے پیوں گا''

مجھے اس قدر مسرت حاصل ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتی اب اس سے میری باقاعدہ خط و کتابت جاری ہے۔

3 دو برس پہلے کی بات ہے جس کا میری شرارت پسندیوں سے کوئی تعلق نہیں یوں تو میری زندگی میں ایسے بہت سے واقعے ہیں جو یاد رکھنے کے قابل ہیں لیکن یہ واقعہ جو میں اب بیان کروں گی۔ ایسا ہے جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا میں بہت شریر ہوں حاضر جواب تو بلا کی ہوں میں کبھی پریشان نہیں ہوئی تھی لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ جب مجھے پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تو عجیب و غریب لطف کا احساس ہوا جیسا کہ آپ کو واقعے کے بیان سے معلوم ہو گا میری پریشانی کا باعث کسی مرد کی چالاکی یا ہوشیاری نہیں تھی بلکہ محض ایک حادثے کی وجہ سے مجھے بے حد خفیف ہونا پڑا۔

میں نے ٹریم میں کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ لیکن مجبوراً ایک روز مجھے اس میں سوار ہونا پڑا۔ مجھے جلدی داور پہنچنا تھا۔ بس آنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ ٹریم سامنے کھڑی تھی چنانچہ میں اس میں بیٹھ گئی میرے سامنے ایک بہت ہی موٹا پارسی لڑکا بیٹھا تھا۔ اس کی توند اس قدر بڑھی تھی اور اس کی گردن جس پر کلف لگا کالر چڑھا تھا، اس قدر موٹی تھی کہ اگر وہ نیچے فرش کی طرف دیکھنا چاہتا تو اسے لیٹنا پڑتا۔ مجھے سخت زکام ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ریشمی رومال تھا جس سے میں بار بار اپنی ناک صاف کر رہی تھی، جب ٹریم چلی تو لال باغ کے قریب ہوا کا

ایک زبردست جھونکا آیا۔ رومال میرے ہاتھ سے اڑا اور اس موٹے پارسی کی ران پر جا گرا۔ کچھ دیر تک میں نے دل ہی دل میں کئی طریقے یہ رومال حاصل کرنے کے لیے سوچے یہ بھی خیال آیا کہ اسے مخاطب کر کے کہوں ''میرا رومال گر گیا ہے، براہ مہربانی دے دیجئے'' لیکن سوچا کہ وہ گردن جھکا کر کیسے دیکھ سکے گا میں خود اس کو بتا کر وہاں سے رومال اٹھانا نہیں چاہتی تھی چنانچہ میں نے ارادہ کر لیا کہ چپ چاپ آنکھ بچا کر دو انگلیوں کی مدد سے بالکل آہستگی کے ساتھ اسے اٹھا لوں گی، میں نے کئی مرتبہ کوشش کی لیکن ہر بار اس ڈر کے مارے کہ ٹریم میں بیٹھا ہوا کوئی اور آدمی دیکھ لے گا، مجھے اپنا ہاتھ کھینچنا پڑا۔

مجھے غیر معمولی طور پر مضطرب دیکھ کر پارسی کو ایسا محسوس ہوا کہ فضا میں کچھ گڑ بڑ سی ہے مجھے کھڑکی میں سے باہر جھانکتے دیکھ کر کئی مرتبہ اسے بھی اپنی اکڑی ہوئی گردن موڑ کر باہر جھانکنا پڑا۔

چاہئے تو یہ تھا کہ میں اس رومال کو وہیں چھوڑ دیتی اور بازار سے ایک اور خرید لیتی مگر وہ ایک دوست کا تحفہ تھا اس لیے مجھے بے حد عزیز تھا۔ میں نے آخری بار ارادہ کر کے جب ہاتھ اس طرف بڑھایا تو پارسی بے چین ہو گیا۔ میں اس کی طرف خدا معلوم کن نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اس کو اب پکا یقین ہو گیا کہ میرے اضطراب کا باعث اس کا کوئی ایسا نقص ہے جس سے وہ ابھی تک غافل ہے۔ اس نے بڑی دقت سے اپنی گردن جھکائی۔ موٹے موٹے گدگدے ہاتھ رانوں پر ادھر ادھر پھیرے ایک ہاتھ کے نیچے میرا رومال آیا۔ ایک دم اس کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ جلدی سے بڑی پھرتی کے ساتھ اس نے انگلیوں کی مدد سے میرے اس

نتھنے سے رومال کو اپنی پتلون کے اندر داخل کر لیا۔۔۔۔۔کم بخت نے یہ خیال کیا کہ اس کی قمیض کا دامن باہر نکلا ہوا ہے ادھر اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا ادھر میرا۔۔۔۔۔۔ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر شرم محسوس کرتے رہے۔ میں تو اس حادثے کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی۔ جونہی ٹریم ٹھہری میں اس پارسی کی طرف دیکھے بغیر اتر گئی۔

میں اس واقعے کو قریب قریب بھول چکی تھی کہ چھ یا سات مہینے کے بعد کرافورڈ مارکیٹ کے پاس جب کہ میں ایک دکان سے بھنا ہوا پستہ لے رہی تھی۔ ایک خوش پوش نوجوان میرے قریب آیا۔ اس نے اپنی جیب میں سے ایک باریک کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک چیز نکالی اور مجھ سے کہا ''معاف فرمائیے گا آپ کی ایک چیز گم ہو گئی تھی جو مجھے مل گئی آج حاضر کر رہا ہوں''

میں نے باریک کاغذ کھول کر دیکھا تو میرا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔۔وہی رومال تھا جو اس موٹے پارسی نے اپنی پتلون میں داخل کر لیا تھا۔۔۔۔۔۔مجھے بے حد شرم محسوس ہوئی، غصہ بھی بہت آیا، تھوڑی سی ہنسی بھی آئی اور میں حیران ہوں کہ ایک دم میری آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔۔۔۔شاید اس لیے کہ میں نے اس نوجوان کو اب پہچان لیا تھا۔۔۔ٹریم میں یہ اس روز دور ایک کونے میں بیٹھا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔مجھے کوئی بات نہ سوجھی۔۔۔۔ٹھیک طور پر میں اپنے کھسیانے پن کا اظہار بھی نہ کر سکی۔

☆☆☆☆☆

دیہاتی بولیاں

آیئے! آپ کو پنجاب کے دیہاتوں کی سیر کرائیں۔ یہ ہندوستان کے وہ دیہات ہیں جہاں رومان تہذیب وتمدن کے بوجھ سے بالکل آزاد ہے۔ جہاں جذبات بچوں کی مانند کھیلتے ہیں۔ یہاں کا عشق ایسا ہوتا ہے جس میں مٹی ملی ہوئی ہے، تصنع اور بناوٹ سے پاک ان دیہاتوں میں بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کے دل دھڑکتے ہیں۔ قدم قدم پر آپ کو شاعری نظر آئے گی جو اوزان کی قید اور لفظی بندشوں سے بالکل آزاد ہے۔

یہاں کی کھلی ہوا میں آپ چلیں پھریں گے تو آپ اپنے اندر ایک نئی زندگی پائیں گے۔ آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ آپ بھی عشق کر سکتے ہیں آپ بھی پرندوں کی زبان سمجھ سکتے ہیں اور ہواؤں کی گنگناہٹ آپ کے لیے بھی کچھ معنی رکھتی ہے۔ جب ابابیلیں خاموش آسمان میں ڈبکیاں لگاتی ہیں اور شام کو چمگادڑ قطار اندر قطار جنگلوں کی طرف تیرتی ہیں اور گاؤں واپس آنے والے ڈھور ڈنگروں کے گلے میں بندھے ہوئے گھنگھرو بجتے ہیں اور فضاء پر ایک دلفریب ناچ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو آپ کا دل بھی کبھی پھیلے گا اور کبھی سکڑے گا۔

وہ دیکھیے، سامنے کچے کوٹھے زمین پر لیٹے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر بڑے بڑے اپلوں کی قطار دور تک چلی گئی ہے۔ مٹی کے یہ گھروندے بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں کیوں کہ ان میں فاصلہ نہیں ایک کوٹھا دوسرے کوٹھے سے ہمکنار ہے، اسی طرح اس کھلے میدان پر ایک اور کھلا میدان بن گیا ہے۔ ان

کوٹھوں پر چارپائیاں اوندھی پڑی ہیں، گنے کے لمبے لمبے چھلکے بکھرے ہوئے ہیں، دوپہر کا وقت ہے، دھوپ اتنی تیز ہے کہ چیل بھی انڈہ چھوڑ دے۔ فضاء ایک خوابگوں اداسی میں ڈوبی ہوئی ہے، کبھی کبھی چیل کی باریک چیخ ابھرتی ہے اور خاموشی پر ایک خراش سی پیدا کرتی ہوئی ڈوب جاتی ہے۔۔۔۔۔ مگر اس تیز دھوپ میں یہ کوٹھے پر کون چڑھا ہے۔۔۔ ارے، یہ تو کوئی اس گاؤں کی مٹیار (نوجوان لڑکی) ہے دیکھو تو کس انداز سے تپتے ہوئے کوٹھے پر ننگے پیر چل رہی ہے۔ یہ لو وہ کھڑی ہو گئی اسے کس کا انتظار ہے اس کی آنکھیں کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ ببولوں کے جھنڈ میں یہ کیا دیکھ رہی ہے۔ کب تک یہ ایسے کھڑی رہے گی۔ کیا اس کے پیر نہیں جلتے شاید اسی نے یہ کہا ہوگا۔

کوٹھے اپر کھلیاں

میری سڑ گیاں پیر دیاں تلیاں

میرا یار نجر نہ آوے

(ترجمہ: میں کوٹھے پر کھڑی ہوں اور کھڑے کھڑے میرے پیر کے تلوے جل گئے ہیں۔۔۔ لیکن میرا عاشق نظر نہیں آتا)

نہیں اس نے تو گنے کے سوکھے ہوئے چھلکے اکٹھے کرنے شروع کر دیئے۔۔۔ لیکن یہ پھر بار بار ادھر کیوں دیکھتی ہے جدھر بوڑھے برگد کے سائے تلے ایک نوجوان ہاتھ میں ایک لمبی لاٹھی لئے کھڑا ہے۔۔۔۔ کیا یہ اس کا وہ تو نہیں؟ اس کی لاٹھی پر پیتل کے کوکے کتنے چمک رہے ہیں!

ہم ادھر نوجوان کی طرف دیکھتے رہے اور ادھر آخری کوٹھے پر جو کہ یہاں سے

کافی دور ہے ایک اور نو جوان لڑکی نمودار ہو گئی دور سے کچھ دکھائی نہیں دیتا مگر اس کی ناک کی لونگ کتنی چمک رہی ہے۔ کیا اسی لونگ کے بارے میں کہا گیا تھا

تیرے لونگ دا پیا لشکارا

ہالیاں نے ہل ڈک لے

(ترجمہ: تیرے لونگ (ناک کی کیل) نے جب چمک پیدا کی تو ہل چلانے والوں نے اپنے ہل روک لئے (اس خیال سے کہ بجلی چمک رہی ہے اور بارش آ رہی ہے)

اجی نہیں یہ تو کچھ اور ہی معاملہ ہے، یہ دیکھئے ادھر کی لڑکی اس لڑکی کو اشارہ کر رہی ہے۔ شاید اسے آنے کے لیے کہہ رہی ہے پھر اس طرف بھی جھک کر دیکھتی ہے جہاں گاؤں کا وہ نوجوان آدمی سائے تلے کھڑا ہے۔ ایک ہاتھ سے لاٹھی پکڑے ہے اور دوسرے ہاتھ سے اپنے گلے میں پڑے ہوئے تعویذوں سے کھیل رہا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر وہ ''بولی'' یاد آ جاتا ہے جو اس گاؤں کے تمام لڑکوں کو یاد ہے، کیا ہے؟۔۔۔۔ہاں!

منڈا موہ لیا تو یتاں والا

دمڑی دا سک مل کے

(ترجمہ: ایک تکڑے جوان کو جس نے آفات سے محفوظ رہنے کے لیے تعویذ پہن رکھے تھے، ایک لڑکی نے دمڑی کا سک (اخروٹ یا کسی اور درخت کی چھال جس سے ہونٹ رنگے جاتے ہیں) مل کر موہ لیا)

پھر اشارے ہو رہے ہیں ادھر کی لڑکی اسے جلدی آنے کے لیے اشارہ کر رہی

ہے۔۔۔۔۔۔۔۔صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتی۔

کوٹھے کوٹھے آ کُچھیے

تینوں بنتو دا یار وکھاواں

(ترجمہ: کوٹھے کوٹھے چلی آ کچھی۔۔۔۔۔۔میں تجھے بنتو کا عاشق دکھاؤں)

کیا پتہ ہے کہ یہ نوجوان جو برگد کے سائے تلے مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے، بنتو ہی کا عاشق ہو۔ بنتو کا نہ ہوگا تو کسی اور کا ہوگا کیوں کہ بہر حال اسے کسی کا تو عاشق ہونا ہی چاہیے۔ دیکھیے کس انداز سے کھڑا ہے۔ سر پر سفید کھادی کا صافہ باندھ رکھا ہے اور اپنے آپ کو کس قدر اہم سمجھ رہا ہے۔ اس کو دو نوجوان لڑکیوں نے اس حالت میں دیکھ لیا ہے، اب سارے گاؤں کی کنواریوں کو معلوم ہو جائے گا کہ سر پر سفید کھادی کا صافہ باندھ کر وہ برگد کے سائے تلے کھڑا تھا۔ کیا کیا باتیں نہ ہوں گی، پھبتیاں اڑائی جائیں گی اور کنویں پر دیر تک ہنسی اور قہقہوں کے چھینٹے اڑتے رہیں گے اور کیا پتہ ہے کہ کوئی شریر چھوکری اونچے سروں میں یہ گانا شروع کر دے۔

سر بنھ کے کھدر دا صافہ چندرا شوقین ہو گیا

(ترجمہ: سر پر کھادی کا صافہ باندھ کر بے چارہ شوقین ہو گیا ہے)

یہ چھوکری جب ہنسے گی تو اس کے دانتوں میں ٹھکی ہوئی سونے کی کیلیں بھی ہنسیں گی اور کیا پتہ ہے کہ وہاں پاس کی جھاڑی کے پیچھے کوئی شریر لونڈا چھپا بیٹھا ہو۔ وہ یہ ہنستی ہوئی کیلیں دیکھ لے اور اٹھ کر جب کھیتوں کا رخ کرے تو دفعتاً اس

کے ہونٹ واہوں اور یہ بولی پرندے کی طرح پھر سے اڑ جائے

موج سنیارا لے گیا

جنہیں لائیاں منداں وچ میکھیاں

(ترجمہ: مزہ تو سنیارہ لے گیا جس نے تمہارے دانتوں میں یہ کیلیں جڑیں)

یہ لڑکا جب کھیتوں سے لوٹ کر گاؤں آئے گا اور شام کو چوپال پر حقے کے دور چلیں گے تو وہاں وہ سفید صافے والا بھی ہوگا۔ اس کو معلوم ہو جائے گا کہ کنویں پر پانی بھرنے کے دوران میں کس ظالمانہ طریق پر اس کا مضحکہ اڑایا گیا ہے تو وہ افسردہ اور مغموم ہو جائے گا، بیٹھتے سوتے جاگتے اس کو اپنی معشوقہ کی بے رخی ستاتی رہے گی، ایک آہ کی صورت میں آخر کار اس کے سینے میں یہ الفاظ اٹھیں گے۔

کلا ٹکریں تے حال سناواں

دکھاں وچ پے گئی جندڑی

(ترجمہ: اس میں اپنے کسی دوست کو یا اپنے ہی آپ کو مخاطب کیا گیا ہے، اگر تم اکیلے میں ملو تو میں تمہیں سارا حال سناؤں میری زندگی دکھوں سے گھر گئی ہے)

بہت ممکن ہے وہ اپنے دوست کو ہمدرد جان کر حال دل کہے اور یوں اپنے دل کا غبار ہلکا کرے مگر اتفاق ایسا ہو کہ ان دونوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو جائے اور جس کو اس نے اپنا ہمدرد بنایا تھا اسے سارے گاؤں میں نشر کر دے، اس پر یہ کوئی ضرور کہے گا

یاری وچ نہ وکیل بنائیے

لڑ　　کے　　دس　　دوَ　　گا

(ترجمہ: عشق میں کسی کو وکیل نہ بنانا چاہیے کیوں اگر اس سے لڑائی ہو گی تو وہ سارا بھید کھول دے گا)

پھر نامراد عاشق یہ سمجھ کر کہ اس کا عشق ناکام رہا ہے، ہل چلاتے ہوئے دوپہر کی اداس دھوپ میں یکا یک بول اٹھے گا

میری　　لگ　　دی　　کسی　　نہ　　دیکھی

تے　　ٹٹ　　دی　　نوں　　جگ　　جان　　دا

(ترجمہ: جب میری اور اس کی محبت ہوئی تو کسی کو پتہ تک نہ چلا ہے، مگر اب کہ یہ رشتہ ٹوٹ گیا ہے، ساری دنیا کو معلوم ہو گیا ہے اور جگ ہنسائی کا باعث ہوا ہے)

لیکن کیا پتہ ہے کہ دوسری طرف اس کی معشوقہ کو بھی کچھ کہنا ہو کیا پتہ ہے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہو اور ظاہر نہ کر سکتی ہو کیوں کہ یہ بول اس کے منہ سے بغیر کسی وجہ کے تو نہیں نکلیں گے

یار　　سرو　　دا　　بوٹا

ویہڑے　　وچ　　لا　　رکھ　　دی

(ترجمہ: یار میرا کیا تھا سرو کا درخت تھ، اپس اسے اپنے صحن میں لگا چھوڑتی)

اتنے میں فوج کی بھرتی شروع ہو جائے گی۔ جب برسات آئے گی پیپل کے درختوں میں جھولے پڑیں گے آم کے درختوں پر پپیہے پیہو پیہو پکاریں گے، کوئلیں کوکیں گی، سارا گاؤں خوش ہو گا تو وہ۔۔۔۔۔ اپنے گھر کی گیلی منڈیر کی طرف

امید بھری نظروں سے دیکھ کر پکارے گی۔

بول وے نمانیاں کواں

کوئلاں کوک دیاں

(ترجمہ: اے نمانے کوے تو ہی بول، کوئلیں کوک رہی ہیں کوا اگر بولے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی عزیز آنے والا ہے)

میدان خالی ہونے پر اس گاؤں میں ایک اور عاشق بھی پیدا ہو جائے گا، وہ ہر روز اس امید پر اس کے گھر کے پاس سے گزرے گا کہ ایک روز وہ اسے ضرور بلائے گی اور اشاروں ہی اشاروں میں باتیں ہوں گی مگر ایسا نہیں ہوتا۔ آخر کار وہ تنگ آ کر کہے گا

کدی چندریئے ہاک نہ مار

چوڑے والی بانہہ کڈھ کے

(ترجمہ: لفظ چندری کا ترجمہ نہیں ہوسکتا، اردو میں اس کے لیے کوئی مترادف لفظ نہیں ملا۔ چندری زبان پنجابی زبان میں مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے، کبھی ہمدردی کے طور پر اس کو گفتگو میں استعمال کیا جاتا ہے، یہاں محبت اور شکایت دونوں اس میں حل ہیں۔ وہ اس کو چندری سے مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے کبھی اپنے چوڑے (ہاتھی دانت کی بنی ہوئی چوڑیوں کا ایک گروہ جو کلائی سے لے کر کہنی تک دیہات کی عورتیں پہنتی ہیں) والا بازو باہر نکال کر مجھے اشارہ نہیں کیا (مجھے اپنے پاس نہیں بلایا)

ایک زمانہ گزر جائے گا۔ عشق کی داستان افسانہ بن جائے گی اور آخر ایک روز

یہ دیہاتی حسینہ کسی کے ساتھ بیاہ دی جائے گی۔ اس کے بیاہ پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوں گی۔ لوگ اس کا اور اس کے خاوند کا مقابلہ کریں گے اور کوئی نوجوان چیخ اٹھے گا۔۔۔۔۔

منڈا روہی دی کگردا جا تو
ویا کے لے گیا چندر ورگی

(ترجمہ: ''روہی دی کگر'' ایک خاص قسم کے ببول کو کہتے ہیں جس کی لکڑی بڑی کرخت اور کالی ہوتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک مرد جو کہ روہی کے ببول کی طرح کھردرا اور کالا تھا، چاند جیسی دلہن بیاہ کر لے گیا ہے!)

پہلی رات آئے گی ہزاروں کپکپاہٹیں اپنے ساتھ لئے ایک پلنگ پر دلہن گٹھڑی بنی ہوئی اپنے حنا آلود ہاتھ جوڑے گی اور اپنے آمادہ ظلم خاوند سے منت بھرے لہجے میں کہے گی۔

میںنوں اجدی رات نہ چھیڑیں
مہندی والے ہتھ جوڑ دی

(ترجمہ: مجھے صرف آج کی رات نہ چھیڑو دیکھو میں اپنے حنا آلود ہاتھ جوڑ رہی ہوں)

کیا وہ مان جائے گا؟ کیا جوڑے ہوئے حنا آلود ہاتھ اس ظالم کے دل میں رحم پیدا کر دیں گے، خیر اس قصے کو چھوڑیئے۔ یہ مرحلہ کسی نہ کسی طرح طے ہو ہی جائے گا اور دلہن پرانی ہو جائے گی، پھر جھگڑے شروع ہوں گے اور ایک روز اس کا خاوند اس کے پہلے عاشق کو برا بھلا کہے گا تو وہ اس وقت سینے پر پتھر رکھ کر

خاموش تو ہو جائے گی مگر اکیلے میں اس کے منہ سے یہ بول نکلیں گے۔

میرے یار نوں مندا نہ بولیں
میری بھانویں گت پٹ لئیں

(ترجمہ: میری تم چٹیا جڑ سے اکھیڑ لو مگر میرے یار کو برا نہ کہو)

اور۔۔۔۔۔۔اور پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔یونہی عمر بیت جائے گی اور یہ افسانہ اس دیہات میں نئے فسانے پیدا کرے گا۔

☆☆☆☆☆

دیہاتی بولیاں

پنجاب کے چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بنجاروں کی آمد بہت اہمیت رکھتی ہے۔عورتیں عام طور پر اپنے سنگھار کا سامان انہی بنجاروں سے خریدتی ہیں۔ دیہاتی زندگی میں بنجارے کو اپنے پیشے اور اپنی چلتی پھرتی دکان کی وجہ سے کافی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ دیہاتی گیتوں اور بولیوں میں اس کا ذکر عام ہے چونکہ وہ ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتا اس لیے اسے بے وفائی کی تجسیم بنا دیا گیا مجھے اس وقت کوئی ایسا گیت یاد نہیں آ رہا، جس میں بنجارے کا ذکر ہو مگر چند بول میرے ذہن میں گونج رہے ہیں۔ جو میں نے خدا معلوم کہاں اور کب سنے تھے۔

اوو نجارا، بھلا و نجار،۔۔۔او یار کوارا

ساڑے اوہاں دا۔۔۔۔۔۔۔ٹھگ ونجارا

مطلب: وہ بنجارا، وہ بھلا کنوار یار ہمارا ہم عمر ہی وہ ٹھگ بنجارا۔۔۔۔۔۔یہ شاید ایک کنواری لڑکی کے جذبات ہیں جس میں دوشیزہ محبت کے اتار چڑھاؤ بڑی پیاری لہروں کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔

یہ بنجارے کانچ کی رنگ برنگ چوڑیاں بھی لاتے ہیں جو دیہات کی کنواریاں ہاتھوں ہاتھ لیتی ہیں۔چوڑیاں چڑھانے میں یہ بنجارے بڑی مہارت رکھتے ہیں چنانچہ پارے کی طرح مچلتی ہوئی کلائیوں میں بھی بڑی پھرتی سے کانچ کی کھنکھناتی ہوئی چوڑیاں یوں چٹکیوں میں چڑھا دیتے ہیں۔وہ کس انداز سے دیہات کی نوجوان لڑکیوں کی انگلیاں چٹخاتے ہیں اور کس انداز سے ان کے ہاتھ

اپنے ہاتھوں میں دباتے ہیں۔اس کا تصور آپ خود کیجئے۔۔۔۔میرے تصور میں وہ جوان لڑکی ہے جس نے نیلی چوڑیاں پہنی ہیں، اس کی سانولی بانہوں میں یہ چوڑیاں دیکھ کر آسمان بھی نکھر گیا ہے۔۔۔۔لڑکی بڑے چاؤ سے بار بار اپنی چوڑیوں کو وادبھری نگاہوں سے دیکھتی جارہی ہے۔ادھر کھیتوں کی طرف جہاں کپاس اگ رہی ہے، ببولوں کے جھنڈ میں سے دفعتاً اس کا عاشق نکلتا ہے اور دونوں کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے، جانے کیابات ہے دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے نظر آتے ہیں۔نوجوان اس کو سخت ہاتھوں سے پکڑنا چاہتا ہے مگر وہ مچھلی کی مانند اس کی گرفت سے پھسل پھسل جاتی ہے تھوڑی سی کشمکش کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنستی ہے مگر فوراً ہی مصنوعی سنجیدگی اختیار کر کے کہتی ہے

اساں نویاں چڑھایاں چوڑیاں

ہتھاں تے نہ ماریں ویریا

مطلب: ہم نے یہ چوڑیاں نئی نئی پہنی ہیں۔۔۔۔دیکھو ہمارے ہاتھوں پر نہ مارنا ہنسی مذاق ختم ہوتا ہے۔لڑکی جس کا نام بنتو ہے، بار بار اپنی آنکھ ملتی ہے، اس کا چاہنے والا اس سے پوچھتا ہے، کیا ہوا بنتو تیری آنکھ کو کیا ہو گیا ہے وہ آنکھ مل کر کہتی ہے ''تنکا پڑ گیا ہے''

کیہڑے یاد دا گتاوا کیتا اکھ وچ ککھ پے گیا

مطلب: تو نے کس یار کے لیے گائے بھینسوں کا چارہ تیار کیا ہے کہ تیری آنکھ میں تنکا پڑ گیا ہے۔

تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کے بعد میلے کی بات چیت ہوتی ہے بنتو کا دوست بڑے

ٹھاٹ سے بیساکھی کے میلے پا جا رہا ہے گلے میں سونے کا یہ موٹا کنٹھا (زیور) پڑا ہے۔ قمیض دھاری دار کپڑے کی ہے جس سے شہری شب خوابی کا لباس بناتے ہیں، ہاتھ میں نئی لاٹھی ہے جس کو تیل پلایا گیا ہے۔ جب میلے جانے کے لیے سب لوگ نکلیں گے تو یہ جوتا اس کی لاٹھی سے بندھا ہوگا، اس کے پاس اک چھاتا بھی ہے جو گاؤں میں اور کسی کے پاس نہیں، اس لئے وہ اسے ضرور ساتھ لے کر جائے گا۔ بارش نہیں تو کیا، شان تو بڑھ جائے گی۔

میلے کا سن کر جٹو کے منہ میں پانی آ جاتا ہے وہ اس سے کہتی ہے

میلے چلیاں نے لیا دیوں پہنچی
وے لے جا میرا گٹ من کے

مطلب: تو میلے پر جا رہے ہو تو میرے لیے ایک پہنچی ضرور لانا۔۔۔۔۔لو میری کلائی کا ناپ لیتے جاؤ۔

ستانے کے لیے وہ انکار کر دیتا ہے۔ ہم تمہارے کیا ہوتے ہیں کہ تمہاری روز روز کی فرمائشیں پوری کرتے رہیں نہیں ہم تمہارے لیے میلے سے کچھ نہیں لائیں گے۔

تھوڑی سی دیر چخ چخ ہوتی ہے، آخر جٹو ملامت آمیز لہجے میں تھک ہار کر اپنے دوست سے کہتی ہے۔

میری اک نہ منی کم جاتا
تیریاں میں لکھ من دی

مطلب: کم ذات تو نے میری یہ ایک چھوٹی سی بات نہ مانی اور میں تو تیری

لاکھوں باتیں مانتی ہوں۔

اس پر ازراہ مذاق جتو کا دوست اس سے کہتا ہے کیوں۔۔۔۔بس ۔۔۔۔۔۔۔یہ تو وہی ہوا۔۔۔۔

کچی یاری لڈواں دی

لڈو مک گئے یرانے ٹٹ گئے

یہ سن کر جتو کے احساس کو ٹھیس لگتی ہے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور ایک دم اس کے سینے سے آہ اٹھتی ہے،وہ سوچتی ہے۔۔۔۔

کی کھٹیا ای عشق گل لا کے

جندڑی نوں روگ لا لیا

مطلب:عشق کو گلے لگا کر یعنی کر کے تو نے کیا فائدہ حاصل کیا ہے سوائے اس کے کہ اپنی جان کو ایک روگ لگا لیا ہے۔۔۔۔عشق کرنے سے پہلے اس کے کانوں نے بار بار سنا تھا۔۔۔۔۔

کتے ڈب نہ مریں انجانا وے

عشقے دی نہر وگدی

مطلب:اے انجان تو کہیں ڈوب نہ مرے،تیرے آگے عشق کی نہر چل رہی ہے۔

اس کو یہ سب کچھ معلوم تھا مگر پھر بھی وہ عشق میں گرفتار ہوگئی اور ہر وقت بن ٹھن کے رہنے لگی۔۔۔ابھی تھوڑے ہی روز ہوئے،اس نے محلے کے رنگریز سے کہا تھا۔

چنی رنگ دے لا ریا میری

وے السی دے پھل ورگی

مطلب: اے رنگریز میرا دوپٹہ رنگ دے، ایسے رنگ میں جو السی کے پھول کی طرح ہو (السی کے پھول کا رنگ بہت خوبصورت ہے)

اور اس کا عاشق کتنا صادق تھا جس روز اس نے یہ سنا تھا کہ وہ بیمار ہے تو اس کو کتنا دکھ ہوا تھا اور جب چوتھے روز دھان کے کھیتوں میں اس سے ملاقات ہوئی تھی تو اس نے کہا تھا

تیری میری اک جندڑی

تینوں تاپ چڑھے ہیں ہونگاں

مطلب: تیری میری ایک جان ہے یعنی یک جان دو قالب والا معاملہ ہے تجھے بخار چڑھے تو میں ہنکارے بھرتی ہوں

سوچتے سوچتے وہ اپنے دوست کی طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھتی ہے اور کہتی ہے کیا میں نے تم سے کہا نہیں تھا۔۔۔۔

میرا کالجا گنڈھے دے چھل ورگا

دیکھیں یارا پاڑ نہ سٹیں

مطلب: میرا کالجہ پیاز کے چھلکے کی طرح نازک ہے، دیکھنا کہیں اسے چیر پھاڑ نہ دینا

یہ کہہ کر وہ بیری کے پاس بیٹھ کر زاروقطار رونا شروع کر دیتی ہے اس کا عاشق جس نے صرف چھیڑنے کی خاطر اسے لڈوؤں کا طعنہ دیا تھا، سخت پریشان ہوتا ہے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔وہ اس کو ہزار دلاسے دیتا ہے مگر وہ روئے جاتی ہے، معافیاں مانگتا ہے مگر اس کے آنسو نہیں تھمتے۔بھئی میں نے کیا کہا ہے جو تمہارے آنسو ہی بند نہیں ہوتے۔کوئی مجھ سے خطا ہو گئی تو معاف کر دو۔لو اب چپ ہو جاؤ، غصے کو تھوک دو۔۔۔۔حد ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ارے بھئی کچھ تو خیال کرو کوئی یہاں آ نکلے تو کیا سمجھے۔۔۔۔بس چپ ہو جاؤ۔۔۔۔۔۔آ کر ہوا کیا ہے۔۔۔کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے۔

وہ روئے جاتی ہے اور اس بات پر اڑ جاتی ہے

تیرے سامنے بیٹھ کے رووواں
تے دکھ تینوں نہیں دسنا

مطلب: تیرے سامنے بیٹھ کے روؤں گی پر یہ نہیں بتاؤں گی کہ مجھے دکھ کیا پہنچا ہے

عاشق کے لیے یہ کتنا بڑا دکھ ہے بنتو سامنے بیٹھ کے روئے جا رہی ہے پر یہ بتانے کے لیے تیار نہیں کہ اسے کیا دکھ پہنچا ہے اس سے بڑھ کر روحانی سزا وہ اپنے عاشق کو اور کیا دے سکتی ہے۔

چند روز کے بعد یہ بات سارے گاؤں میں پھیل جاتی ہے کہ بنتو اور اس کے عاشق کا آپس میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے چنانچہ طرح طرح کی باتیں سننے میں آتی ہیں۔بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے،لوگ بنتو کے عاشق کو طعنے دیتے ہیں چنانچہ وہ بنتو کو مخاطب کر کے کہتا ہے

کی کہنے تیری یاری

مہنا مہنا ہو کے ٹٹ گئی

مطلب: اے خام عورت! (کچی یعنی وہ عورت جو عشق کرنے کے معاملے میں بالکل خام ہو) تیری دوستی بھی کیا تھی جو طعنہ طعنہ ہو کر ٹوٹ گئی۔

ایک روز بنتو نے اسے دور کٹے ہوئے درختوں کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا، اس کے دل میں ہیجان سا برپا ہو گیا۔

یاری توڑ کے کھنڈاں تے بہہ گیاں
تے ہن تو کیہڑا رب ہو گیاں

مطلب: دوستی ختم کر کے تو مجھ سے دور کٹے ہوئے درختوں کی جڑوں پر بیٹھ گیا ہے لیکن تو ایسا کرنے سے خدا تو نہیں ہو گیا۔

درختوں کی ٹنڈ منڈ جڑوں پر ایسے کئی خدا دیہاتوں میں بیٹھے رہتے ہیں جن کی خدائی آن کی آن میں اوندھی ہو جاتی ہے۔۔۔آسمانوں والا خدا اوپر بیٹھ کر یہ تماشا دیکھتا رہتا ہے اور خاموش رہتا ہے۔

☆☆☆☆☆

تحدید اسلحہ

بین الاقوامی سیاست اتنی پیچ دار اور الجھی ہوئی ہے کہ اس کو سمجھنا کام رکھتا ہے سچ تو یہ ہے کہ اس بھول بھلیاں میں انسان گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

تحدید اسلحہ کے متعلق آپ نے بیسیوں مرتبہ اخباروں میں پڑھا ہو گا مگر سچ کہئے کہ آپ نے اس کے متعلق کیا سمجھا؟ لیکن میں آپ کی عقل و دانش کا امتحان لینا نہیں چاہتا۔ میں نے اس کے متعلق جو کچھ سمجھا ہے، وہ نہایت سادہ الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے یعنی اس طور پر کہ بچے کو بھی غلط فہمی نہ ہو سکے۔ فرض کر لیجئے کہ آپ اور میں ذرا ذرا کم سمجھ والے واقع ہوئے ہیں۔ میرے پاس تکیہ ہے اور بہت ممکن ہے کہ یہ تکیہ میں آپ کے سر پر دے ماروں۔ آپ کے پاس ایک انڈہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ آپ اسے میرے سر پر پھوڑ دیں۔ گویا تکیہ اور انڈہ ہمارے اسلحہ ہیں امن قائم رکھنے کی خاطر ہم آپس میں سمجھوتہ کرنے کے لیے تحدید اسلحہ کی ایک مجلس منعقد کرتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنے لیے ایک تکیہ رکھنے کے حقوق حاصل کریں گے اور میں ایک انڈہ رکھنے کا حق طلب کروں گا۔ گویا ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے کا برابر کا ضرر پہنچانے کا سامان ہو گا۔ ہم دونوں میں سے کسی کو حق نہیں ہو گا کہ ایک دوسرے کے مشورے کے بغیر اپنے ہتھیاروں میں اضافہ کر کے باہمی امن کو خطرے میں ڈالیں۔

اب کچھ دیر کے بعد میں آپ کی طرف توجہ اس امر کی طرف مبذول کراتا ہوں کہ آپ کے پاس قلم تراش ہے جو وقت پر مہلک ہتھیار ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ

سن کر آپ میری توجہ اس امر کی طرف منعطف کراتے ہیں کہ میری ملکیت میں ایک کلہاڑی ہے جس سے میں ایک ہی ضرب میں گردن اڑا سکتا ہوں۔ اس پر ہمارے دلوں میں دفعتاً جذبہ امن پسندی کروٹ لیتا ہے اور میں جھوٹ سے ایک قلم تراش خرید لیتا ہوں اور آپ اولین فرصت میں کلہاڑی لے آتے ہیں۔ اب حالات بین الاقوامی سیاسیات کی طرح ترقی پذیر ہو جاتے ہیں اور ایک روز میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ چونکہ میرے ہتھیاروں کے جواب میں آپ کے پاس بھی اس قسم کے ہتھیار موجود ہیں اس لیے مجھے بازار سے پستول خریدنے میں کوئی دیر نہ کرنی چاہیے۔ بات باون تولے پاؤ رتی کی ہے۔ جب میں پستول خرید لاتا ہوں تو آپ پستول کے ساتھ ساتھ ایک چمکیلی تلوار بھی لے آتے ہیں۔ اب فطری طور پر میں بھی تلوار خرید لیتا ہوں اور ساتھ ساتھ تجدید اسلحہ کے جذبے کے ماتحت ایک مشین گن بھی گاڑی پر لدوا کر لے آتا ہوں۔

تو سمجھ لیجئے کہ اب امن و امان قائم ہونے میں کوئی دیر نہیں، آپ دوڑ کر بہترین اسلحہ ساز کے یہاں سے ایک عمدہ قسم کا تباہ کن ٹینک لے آتے ہیں اور لگے ہاتھوں ایک بڑا سا بم بھی خرید لیتے ہیں۔ جس سے میرے گھر کی چھت بھک سے اڑائی جا سکتی ہے۔ خاکسار بھی آپ کی دیکھا دیکھی دو ایک گولے گھر میں ڈال لیتا ہے اور بطور حفظ ما تقدم گیس بنانے والوں کو چند سلنڈر گیس تیار کرنے کی فرمائش بھی کر ڈالتا ہے۔ اس گیس سے آپ کے بال بچوں کا رنگ پیلا پڑ سکتا ہے اور آپ کے چہرے پر سوکھے ہوئے بینگن کی طرح جھریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس پر آپ اس قسم کی گیس تلاش کر لیتے ہیں جو میرے سر، میری ٹانگوں اور میرے بازوؤں کو

سرے سے غائب ہی کر دے۔ پھر آپ احتیاطاً ایک بمبار طیارہ بھی اپنے گھر میں لے آتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کچھ اس طرح غیر مسلح ہو جاتے ہیں کہ ہمارے درمیان جنگ کا خیال ہی نہیں کیا جا سکتا۔ تھوڑے دنوں کے بعد ہم ایک دوسرے کو بالکل فنا کر دیتے ہیں مگر یہ تباہی اتفاقی ہو گی۔ اس کا کچھ خیال نہیں کرنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

ہندی اور اردو

"ہندی اور اردو کا جھگڑا ایک زمانے سے جاری ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر تاراچند جی اور مہاتما گاندھی اس جھگڑے کو سمجھتے ہیں لیکن میری سمجھ سے یہ ابھی تک بالاتر ہے۔ کوشش کے باوجود اس کا مطلب میرے ذہن میں نہیں آیا۔ ہندی کے حق میں ہندو کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ مسلمان، اردو کے تحفظ کے لیے کیوں بے قرار ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔؟ زبان بنائی نہیں جاتی، خود بنتی ہے اور نہ انسانی کوششیں کسی زبان کو فنا کر سکتی ہیں۔ میں نے اس تازہ اور گرما گرم موضوع پر کچھ لکھنا چاہا تو ذیل کا مکالمہ تیار ہو گیا۔"

منشی نرائن پرشاد: اقبال صاحب یہ سوڈا آپ پئیں گے؟

مرزا محمد اقبال: جی ہاں، میں پیوں گا

منشی: آپ لیمن کیوں نہیں پیتے؟

اقبال: یونہی، مجھے سوڈا اچھا معلوم ہوتا ہے ہمارے گھر میں سب سوڈا ہی پیتے ہیں

منشی: تو گویا آپ کو لیمن سے نفرت ہے؟

اقبال: نہیں تو۔۔۔۔۔۔۔۔نفرت کیوں ہونے لگی منشی نرائن پرشاد۔۔۔۔۔۔گھر میں چونکہ سب یہی پیتے ہیں۔۔۔۔۔اس لیے عادت سی پڑ گئی ہے۔ کوئی خاص بات نہیں بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ لیمن سوڈے کے مقابلے میں زیادہ مزے دار ہوتا ہے۔

منشی: اسی لیے تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میٹھی چیز چھوڑ کر آپ کھاری چیز کیوں پسند کرتے ہیں لیمن میں نہ صرف یہ کہ مٹھاس گھلی ہوتی ہے بلکہ خوشبو بھی ہوتی ہے آپ کا کیا خیال ہے؟

اقبال: آپ بالکل بجا فرماتے ہیں ــــــ پر

منشی: پر کیا؟

اقبال: کچھ نہیں ـــــــ میں یہ کہنے والا تھا کہ میں سوڈا ہی پیوں گا

منشی: پھر وہی جہالت ــــــ کوئی سمجھے میں آپ کو زہر پینے پر مجبور کر رہا ہوں۔ ارے بھائی لیمن اور سوڈے میں فرق ہی کیا ہے۔ ایک ہی کارخانے میں یہ دونوں بوتلیں تیار ہوئیں۔ ایک ہی مشین نے ان کے اندر پانی بند کیا ــــــ لیمن سے مٹھاس اور خوشبو نکال دیجیے تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟

اقبال: سوڈا ـــــــ کھاری پانی ــــــ

منشی: تو پھر اس کے پینے میں حرج ہی کیا ہے؟

اقبال: کوئی حرج نہیں

منشی: تو پیو ـــــــ

اقبال: تم کیا پیو گے؟

منشی: میں دوسری بوتل منگوا لوں گا

اقبال: دوسری بوتل کیوں منگواؤ گے ـــــــ سوڈا پینے میں کیا حرج ہے؟

منشی: کو ــــــ کوئی حرج نہیں

اقبال: تو لو پیو یہ سوڈا

منشی: تم کیا پیو گے؟

اقبال: میں دوسری بوتل منگوا لوں گا

منشی: دوسری بوتل کیوں منگواؤ گے ۔۔۔۔ لیمن پینے میں کیا حرج ہے؟

اقبال:

کو ۔۔۔۔۔ ئی ۔۔۔۔۔۔۔ حر ۔۔۔۔۔ ج ۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔

اور سوڈا پینے میں کیا حرج ہے؟

منشی: کو ۔۔۔۔۔ ئی ۔۔۔۔۔۔۔ حر ۔۔۔۔ ج ۔۔۔۔ نہیں

اقبال: بات یہ ہے کہ سوڈا ذرا اچھا رہتا ہے

منشی: لیکن میرا خیال ہے کہ لیمن ۔۔۔ ذرا اچھا رہتا ہے

اقبال: ایسا ہی ہو گا ۔۔۔۔۔۔ پر میں تو اپنے بڑوں سے سنتا آیا ہوں کہ سوڈا اچھا ہوتا ہے۔

منشی: اب اس کا کیا ہو گا ۔۔۔۔۔۔۔ میں بھی اپنے بڑوں سے یہی سنتا آیا ہوں کہ لیمن اچھا ہوتا ہے۔

اقبال: آپ کی اپنی رائے کیا ہے؟

منشی: آپ کی اپنی رائے کیا ہے

اقبال: میری رائے ۔۔۔۔ میری رائے ۔۔۔۔۔۔ میری رائے تو یہی ہے کہ ۔۔۔۔ لیکن آپ اپنی رائے کیوں نہیں بتاتے؟

منشی: میری رائے ۔۔۔۔ میری رائے ۔۔۔۔۔۔ میری رائے تو یہی

ہے کہ۔۔۔۔لیکن میں اپنی رائے کا اظہار پہلے کیوں کروں؟

اقبال: یوں رائے کا اظہار نہ ہو سکے گا۔۔۔۔۔۔۔اب ایسا کیجئے کہ اپنے گلاس پر کوئی ڈھکنا رکھ دیجئے، میں بھی اپنا گلاس ڈھک دیتا ہوں یہ کام کر لیں تو پھر آرام سے بیٹھ کر فیصلہ کریں گے۔

منشی: ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔بوتلیں کھل چکی ہیں اب ہمیں پینا ہی پڑیں گی چلئے جلدی فیصلہ کیجئے ایسا نہ ہو کہ ان کی ساری گیس نکل جائے۔۔۔۔ان کی ساری جان تو گیس ہی میں ہوتی ہے۔

اقبال: میں مانتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔اور اتنا آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ لیمن اور سوڈے میں کچھ فرق نہیں

منشی: یہ میں نے کب کہا تھا کہ لیمن اور سوڈے میں کچھ فرق ہی نہیں۔۔۔۔۔۔۔بہت فرق۔۔۔۔۔۔۔زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک میں مٹھاس ہے، خوشبو ہے، کھٹاس ہے یعنی تین چیزیں سوڈے سے زیادہ ہیں سوڈے میں تو صرف گیس ہی گیس ہے اور وہ بھی اتنا تیز کہ ناک میں گھس جاتی ہے۔اس کے مقابلے میں لیمن کتنا مزے دار ہے۔ایک بوتل پیو، طبیعت گھنٹوں بشاش رہتی ہے۔سوڈا تو عام طور پر بیمار پیتے ہیں۔۔۔۔اور آپ نے ابھی ابھی تسلیم بھی کیا ہے کہ لیمن سوڈے کے مقابلے میں زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔

اقبال: ٹھیک ہے پر میں نے یہ تو نہیں کہا کہ سوڈے کے مقابلے میں لیمن اچھا ہوتا ہے۔مزیدار کے معنی یہ نہیں کہ وہ مفید ہو گا، اچار بڑا مزیدار ہوتا ہے مگر اس کے نقصان آپ کو اچھی طرح معلوم ہیں کسی چیز میں کھٹاس یا خوشبو کا ہونا یہ ظاہر

نہیں کرتا کہ وہ بہت اچھی ہے۔آپ کسی ڈاکٹر سے دریافت فرمائیے تو آپ کو معلوم ہوا کہ لیمن معدے کے لیے کتنا نقصان دہ ہے۔۔۔سوڈا البتہ چیز ہوئی نا۔۔۔۔یعنی اس سے ہاضمے میں مدد ملتی ہے۔

منشی: دیکھیے اس کا فیصلہ یوں ہوسکتا ہے کہ لیمن اور سوڈا دونوں مکس کر لئے جائیں

اقبال: مجھے کوئی اعتراض نہیں

منشی: تو اس خالی گلاس میں آدھا سوڈا ڈال دیجیے

اقبال: آپ بھی اپنا آدھا لیمن ڈال دیں۔۔۔۔۔۔۔۔میں بعد میں سوڈا ڈال دوں گا۔

منشی: یہ تو کوئی بات نہ ہوئی پہلے آپ سوڈا کیوں نہیں ڈالتے

اقبال: میں سوڈا لیمن مکسڈ پینا چاہتا ہوں

منشی: اور میں لیمن سوڈا مکسڈ پینا چاہتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.net All rights reserved 2006

اگر

اگر یہ ہوتا تو کیا ہوتا اور اگر یہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا اور اگر کچھ بھی نہ ہوتا تو پھر کیا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ان خطوط پر ہم جتنا سوچیں گے، الجھاؤ پیدا ہوتے جائیں گے اور جیسا یورپ کے ایک بڑے مفکر نے کہا ہے "یہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا" کے متعلق سوچ بچار کرنا بالکل لاحاصل ہے۔ یہ بات ایک عام آدمی کے نقطہ نظر سے کہی گئی ہے اور بالکل سچ ہے کیونکہ عام آدمی کا کام اگر کی چکر میں پھنسنا نہیں ہے اس لیے کہ اس میں پھنس کر وہ اپنی حرکت، اپنی توجہ کی شدت اور اپنے عمل کی قوت کو بالکل کھودے گا "وہ جو کچھ کہ ہوسکتا ہے یا ہو جاتا" پر سوچ بچار کرنا "دماغی سٹہ بازی" ہے کیونکہ اس میں آدمی اسپیکولیشن کی بھول بھلیوں میں پھنس جاتا ہے عام آدمی کا ایسی باتیں سوچنا بالکل بے کار ہے لیکن فلسفی کی بات الگ ہے۔ وہ جب نامعلوم ممکنات کا کھوج لگاتا ہے تو اسے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہو جاتا ہے اس لیے کہ وہ حال اور مستقبل دونوں سے متعلق ہے۔ عارضی اور دائمی دونوں چیزوں سے اسے واسطہ ہے۔ انسان کی متبدل اور غیر متبدل دونوں قسم کی عادات اس کے پیش نظر رہتی ہیں۔ چنانچہ اس کے دماغ میں ایسے سوالوں کا پیدا ہونا ضروری ہے اگر فلاں فلاں حادثہ وقوع پذیر نہ ہوتا تو زمانے کی رفتار کیسی ہوتی فلاں ارادے یا فیصلے میں اگر تھوڑی سی ترمیم ہوتی تو واقعات کا رخ کیسا ہوتا۔ اگر فلاں فلاں حادثہ وقوع پذیر نہ ہوتا تو زمانے کی رفتار کیسی ہوتی۔ فلاں ادارے یا فیصلے میں اگر تھوڑی سی ترمیم ہوتی تو واقعات کا رخ کیسا ہوتا۔ اگر فلاں آدمی مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے

یا کچھ دیر بعد مرتا تو زندگی میں کیا تبدیلی پیدا ہوتی۔

''اگر'' کی بے شمار ایسی شکلیں ہوسکتی ہیں کیونکہ اب تک جو کچھ ہوا ہے اس کو ہر رنگ میں دیکھا جاسکتا ہے ''اگر'' کے میدان میں ایسے کئی گھوڑے دوڑائے جاسکتے ہیں مثال کے طور پر اگر حکیم سقراط اس مار دھاڑ میں جو کہ چار سو بیس سال قبل از مسیح ایتھنز کے باشندوں نے مچائی تھی، قتل ہو گیا ہوتا تو افلاطون اور ارسطو کا نام کبھی سننے میں نہ آتا۔ یونانی فلسفے کا وجود تک نہ ہوتا اور وہ سبق جو یورپ کی دانش گاہوں میں دو ہزار سال سے پڑھایا جا رہا ہے، معرض وجود ہی میں نہ آتا۔۔۔ اس ''اگر'' پر اگر غور کیا جائے تو کتنی دلچسپ باتوں کا سلسلہ شروع ہوسکتا ہے بیتے ہوئے زمانے کا دو ہزار سال لمبا تھان کھول کر اس کے تمام نقش و نگار مٹا کر نئے بیل بوٹے بنانا کم دلچسپ نہیں۔۔۔۔۔ اور اگر یہ سوچا جائے کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ایک انچ کا آٹھواں حصہ بڑی یا چھوٹی ہوتی تو کیا ہوتا۔۔۔۔۔۔ یہ ''اگر'' بہت مشہور ہے اور اس پر غور بھی کیا جا چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر ''قلوپطرہ کی ناک ایک انچ کا آٹھواں حصہ بڑی یا چھوٹی ہوتی تو عیسائیوں کی تاریخ تمدن بالکل مختلف ہوتی۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ عورتوں کی ناک کے سائز کو اتنا اہم نہ سمجھیں اور کسی خاتون کی ناک کو قوموں کی قسمت تبدیل کرنے والی نہ مانیں مگر اس بات پر پھر بھی بحث ہوسکتی ہے کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ذرہ بھر بڑی یا چھوٹی ہوتی تو اس کی خوب صورتی میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا۔ اگر اس کی خوبصورتی میں فرق آجاتا تو وہ نہ جولیس سیزر کو اور نہ مارک انطونی کو مسحور کرسکتی۔ چنانچہ رومن ہسٹری بالکل مختلف طریقے پر لکھی جاتی۔ چنانچہ عیسائیوں کی تاریخ تمدن بھی بالکل مختلف ہوتی

اور۔۔۔۔خدا جانے اور کیا کیا کچھ نہ ہوتا اور کیا کیا کچھ ہوتا۔''

آیئے! ہم چند تاریخی ''اگروں'' پر سرسری نظر ڈالیں۔

اگر سابق قیصر جرمنی ولیم دوئم اور شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم ایک دوسرے سے دلی نفرت نہ رکھتے ہوئے تو سن چودہ کی بڑی لڑائی معرض وجود ہی میں نہ آتی۔ کہتے ہیں شہنشاہ ایڈورڈ کو قیصر ولیم کی خود بینی پسند نہ تھی۔ پہلی ملاقات ہی میں ان کے دل نفرت کے جذبات سے معمور ہو گئے جو سالہا سال تک قائم رہے اس دوران میں چھوٹے چھوٹے معمولی واقعات بھی ان کو مشتعل کرتے رہے۔ چنانچہ کاؤنٹس آف وارک نے اس قسم کے ایک معمولی واقعے کا ذکر کیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شہنشاہ ایڈورڈ اور قیصر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ ان کے سامنے سے جنگی نامہ نگار ملٹن پرائر گزرا۔

قیصر نے پوچھا ''یہ مختصر سا عجیب وغریب آدمی کون ہے؟''

ایڈورڈ نے جواب دیا: ''مشہور ومعروف جنگی نامہ نگار ملٹن پرائر''

قیصر نے حقارت آمیز لہجے میں کہا ''اوہ۔۔۔۔ملٹن پرائر۔ وہ جرنلسٹ''

شہنشاہ ایڈورڈ قیصر کی اس بدتمیزی سے کبیدہ خاطر ہو گئے اور اس کو ذلیل کرنے کی ٹھان لی ''آپ اس سے مل کر یقیناً خوش ہوں گے'' شہنشاہ ایڈورڈ نے اس انداز میں کہا گویا انہوں نے قیصر کی حقارت آمیز گفتگو کا مقصد ہی نہیں سمجھا۔

اس سے پہلے کہ شہنشاہ ایڈورڈ کا تند مزاج بھانجا کچھ کہہ سکے۔ انہوں نے ملٹن پرائر کو قریب آنے کا اشارہ کر دیا۔ جب وہ پاس آ گیا تو شہنشاہ نے یوں تعارف کرایا ''مسٹر پرائر! قیصر نے خواہش ظاہر کی کہ میں تمہاری اس سے ملاقات

کراؤں''

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ شخصی منافرت جنگ کے دیوتا کو مشتعل کرنے کا سبب بنی اور انگریزوں سے جرمنی کے حسد اور نفرت کی آگ کا ایندھن بن گئی اور سن چودہ میں جنگ عظیم شروع ہوگئی۔۔۔۔

اگر نیپلز میں لیڈی ہملٹن نے نلسن سے ملاقات نہ کی ہوتی اور وہ اس پر عاشق نہ ہو جاتا تو بہت ممکن ہے کہ نیل کی جنگ کبھی وقوع پذیر نہ ہوتی۔

اٹلی کا ارادہ نلسن کی مدد کرنے کا نہ تھا۔ اس کی راہ میں روڑے اٹکائے جا رہے تھے لیکن حسین اور جادو نظر ایما یعنی لیڈی ہملٹن نے اپنے مدبر شوہر کے پردے میں زنجیر کو حرکت دی اور اس کے جہازوں کو سامان رسد فراہم کرنے اور مہم پر روانہ ہونے میں مدد دی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس خاتون نے اپنے عاشق کو بہت سی راز کی باتیں بھی معلوم کر کے بتلائیں۔

اگر ملکہ الزبتھ اسپین کے شہنشاہ فلپ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی اور ملکہ میری کے پروانہ موت پر دستخط نہ کرتی تو انگلستان پر آرمیڈا یعنی اسپین کا زبردست جنگی بیڑہ کبھی حملہ نہ کرتا۔

ریاست کی بساط پر ملکہ انگلستان نے شاہ فرانس اور شاہ اسپین کو ایک دوسرے کے مقابلے میں احمق بنا کر یورپ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ ملکہ میری جب قتل ہوئی تو فلپ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ میری نے اپنی وصیت میں فلپ کو تاج و تخت کا مالک قرار دیا تھا جو اس کا سب سے قریبی عزیز اور کیتھولک تھا۔ فلپ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر انگلستان فتح ہو گیا تو یورپ میں

کیتھولک مذہب کا پھر پچھلا سا اقتدار ہو جائے گا۔ بس اس نے بغیر سوچے سمجھے آرمیڈا کو انگلستان فتح کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ لیکن نتیجہ برعکس ہوا اور اسپین کی ساری شان و شوکت خاک میں مل گئی۔

اگر شہنشاہ میکس میلیاں ایک مغرور اور ضدی عورت سے شادی نہ کرتا تو میکسیکو خونیں انقلاب سے محفوظ رہتا اور ساتھ ہی شہنشاہ کی جان بچ جاتی۔

میکسیکو کے باشندے اس بات کے خلاف تھے کہ ان کے وطن پر کوئی غیر ملکہ حکمران ہو۔ ان کی مرضی کے خلاف نپولین سوئم ان پر میکس میلیاں کی حکومت عائد کر رہا تھا جس سے انہوں نے یکسر انکار کر دیا۔ میکس میلیاں نے جب دیکھا کہ معاملات دگرگوں ہو چکے ہیں تو اس نے چاہا کہ تخت سے دستبردار ہو جائے مگر اس کی ضدی اور مغرور ملکہ بیچ میں حائل ہو گئی۔ اس نے اپنے خاوند کو غیرت دلائی ''ایسی باتیں صرف بڈھوں اور احمقوں کو زیب دیتی ہیں۔۔۔۔۔ چونتیس سال کے جوان شہنشاہ کے لیے یہ انتہائی ذلت اور بزدلی ہو گی اگر وہ تخت سے دستبردار ہو جائے۔''

اس کے بعد وہ بعجلت تمام شہنشاہ فرانس کے پاس آئی اور نپولین سوئم سے فوجی امداد کی ملتجی ہوئی لیکن امریکہ نے نپولین کو پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا چنانچہ اس نے فوجی امداد سے صاف انکار کر دیا۔ ادھر ملکہ امداد و اعانت کی فکر میں سرگرداں تھی۔ ادھر میکس میلیاں اور اس کی فوج صدر واریز کے ہاتھوں شکست پر شکست کھا رہی تھی۔ ملکہ کی ضد آخر رنگ لائی اور اس کے نیک دل شوہر میکس میلیاں کو گرفتار کر لیا گیا اور بعد میں اسے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔۔۔۔ کہتے ہیں کہ ملکہ کو پھر

کبھی اپنے شوہر کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا اور مدت تک اس پرغم کے باعث دیوانگی کی کیفیت طاری رہی۔

اگر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ بڑا دلچسپ اگر ہے۔۔۔اگر کولمبس نے امریکہ دریافت نہ کیا ہوتا تو ظاہر ہے کہ کسی اور نے دریافت کرلیا ہوتا کیونکہ پرانی دنیا سے یہ نئی دنیا زیادہ دور نہیں مگر ہمیں تو صرف یہ سوچنا ہے کہ اگر کولمبس نے یہ دنیا دریافت نہ کی ہوتی تو کیا ہوتا۔فورڈ کی موٹر کاریں نہ ہوتیں۔ لیگ آف نیشنز نہ ہوتی۔انگریزوں کا تمباکو سے تعارف نہ ہوتا اور نہ آئرستان میں آلوؤں کی کاشت ہوتی۔۔۔۔۔چارلی چپلن جیسا مسخرہ نہ ہوتا اور یہ فلم نہ ہوتے۔

فلموں اور آلوؤں کو چھوڑیئے۔۔۔آپ یہ سوچئے کہ اگر راجہ دسرتھ کے رتھ کا پہیہ نہ نکلتا تو کیا ہوتا۔۔۔۔۔ظاہر ہے کہ ہر سال سال دسہرے کے موقعے پر جو راون جلایا جاتا ہے نہ جلایا جاتا۔

تاریخی بیان ہے کہ جب راجہ دسرتھ کے رتھ کا پہیہ نکل گیا تو رانی کیکئی نے میخ کی جگہ اپنی انگلی داخل کردی اور یوں رتھ کو بچالیا۔راجہ دسرتھ اپنی رانی کے ایثار سے بہت متاثر ہوا چنانچہ اس نے خوش ہو کر کہا ''مانگ مجھ سے کیا مانگتی ہے؟'' رانی کیکئی نے اس وقت تو کچھ نہ مانگا مگر جب رام چندر جی کو گدی پر بٹھایا جانے لگا تو اس نے اپنے خاوند کو اس کا وچن یاد دلایا اور کہا ''میری یہ خواہش ہے کہ آپ رام کو چودہ سال کے لیے جنگلوں میں بھیج دیں اور میرے لڑکے بھرت کو گدی پر بٹھا دیں۔'' چنانچہ رام چندر جی کا بن باس ہوا اور ان کی جگہ راون سے معرکہ خیز جنگ ہوئی۔

اس طرح اگر دروپدی طعن آمیز لہجے میں دریودھن سے یہ نہ کہتی کہ "آخر تم اندھے ہی کے لڑکے ہو تمہیں سجھائی کیسے دے گا" تو بہت ممکن ہے مہابھارت نہ لڑی ہوتی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ پانڈوں کے حصے میں بہت خراب زمین آئی تھی جس کو انہوں نے بڑی محنت سے صاف کیا اور کاریگری کے ایسے نمونے پیدا کئے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے ایسا فرش بنایا تھا کہ تالاب معلوم ہو اور ایسا تالاب بنایا تھا جو فرش معلوم ہو۔ پانڈوں نے جب کوروں کو اپنے یہاں دعوت دی تو وہ صنعت کے یہ نادر نمونے دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے۔ دریودھن تو بوکھلا سا گیا۔ ایک فرش کو اس نے یہ سمجھا کہ تالاب ہے چنانچہ اس نے اپنا لباس اوپر اڑس لیا۔ کہتے ہیں کہ اس موقعہ پر دروپدی نے یہ طعنہ زنی کی "آخر تم اندھے ہی کے لڑکے ہو، تمہیں سجھائی کیسے دے گا"۔۔۔۔ چنانچہ یہ طعنہ آگے چل کر مہابھارت کا موجب ہوا۔

اگر چنگیز خان پیدا نہ ہوتا تو مغرب کی بیداری میں ایک زمانہ صرف ہوتا، چینیوں کو مقناطیسی سوئی کا استعمال ایک مدت سے آتا تھا مگر نئے یورپ سے اس ایجاد کا تعارف چنگیز خاں کے حملوں کی بدولت ہوا۔ ظاہر ہے کہ اگر قطب نما جیسی اہم ایجاد کا علم صرف چین تک ہی محدود رہتا تو کولمبس اور واسکوڈے گاما اتنے لمبے سمندری سفر کبھی نہ کرتے۔ اگر چنگیز خاں پیدا نہ ہوتا تو آج روس کی شکل ہی اور ہوتی کیونکہ وہ منگولوں کی غلامی سے بچا رہتا۔

دشمن کے بحری بیڑے کا کھوج لگانے کے سلسلے میں جنرل نلسن مالٹا سے مصر تک گیا، یہ 1898ء کا ذکر ہے۔ 22 جون اور 28 جون کے درمیانی عرصے میں

انگریزوں کا جنگی بیڑہ فرانسیسیوں کے جنگی بیڑے کے پاس سے ہوکر گزرا مگر ان میں سے کسی کو ایک دوسرے کی موجودگی کا علم نہ ہوا۔۔۔۔۔بحیرہ روم کی ایک کالی رات میں دنیا کی سب سے بڑی ''اگر'' دیر تک کانپتی رہی۔ اگر طرفین کے کسی جہاز میں روشنی کی ہلکی سی شعاع نظر آ جاتی، کوئی آواز سنائی دے جاتی۔ کوئی فوج موج میں آ کر گیت گا دیتا اور نلسن کو دشمن کے بحری بیڑے کی موجودگی کا علم ہو جاتا تو دنیا نپولین کے نام سے بالکل ناآشنا ہوتی۔ اس کا نام جنگی تذکروں میں ایک ایسے جرنیل کے حیثیت سے لکھا جاتا جو کافی اہلیتوں کا مالک ہو اور بس۔۔۔۔۔روس پر نپولین کا ناکام حملہ نہ ہوتا اور نہ فرانس کے ایک لاکھ پچیس ہزار آدمی مارے جاتے، ایک لاکھ بتیس ہزار آدمی سردی اور تھکاوٹ کی بھینٹ نہ چڑھتے اور ایک لاکھ ترانوے ہزار فرانسیسی روسیوں کے قیدی نہ بنتے۔

اگر اسٹیفن چائے کی کیتلی کی ٹونٹی پر چمچہ نہ رکھتا تو اسے بھاپ کی طاقت معلوم نہ ہوتی اور ریلوے انجن کبھی نہ بنتا۔۔۔۔۔اگر درخت سے سیب نہ گرتا تو نیوٹن کشش ثقل کیسے دریافت کرسکتا۔۔۔۔اگر مہاتما گاندھی نہ ہوتے تو آج اس ونو بھابھوے کو کون جانتا۔۔۔ اگر مارکونی نہ ہوتا تو ریڈیو نہ ہوتے۔۔۔۔۔۔اگر ہٹلر نہ ہوتا تو یہ دوسری جنگ عظیم معرض وجود میں نہ آتی۔ اگر حضرت آدم بہشت سے نکالے نہ جاتے تو اس دنیا کے بجائے کوئی اور ہی دنیا ہوتی۔ اگر کچھ بھی نہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا اور اگر خدا نہ ہوتا تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

☆☆☆☆☆☆

ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ

ہم ایک عرصے سے یہ شور سن رہے ہیں۔ ہندوستان کو اس چیز سے بچاؤ، اس چیز سے بچاؤ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کو ان لوگوں سے بچانا چاہیے جو اس قسم کا شور پیدا کر رہے ہیں یہ لوگ شور پیدا کرنے کے ماہر ہیں اس میں کوئی شک نہیں مگر ان کے دل اخلاص سے بالکل خالی ہیں رات کو کسی جلسے میں گرما گرم تقریر کرنے کے بعد جب یہ لوگ اپنے پر تکلف بستروں میں سو جاتے ہیں تو ان کے دماغ بالکل خالی ہوتے ہیں ان کی راتوں کا خفیف ترین حصہ بھی اس خیال میں نہیں گزرا کہ ہندوستان کس مرض میں مبتلا ہے۔ دراصل وہ اپنے مرض کے علاج معالجے میں اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ انہیں اپنے وطن کے مرض کے بارے میں غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔

یہ لوگ جو اپنے گھروں کا نظام درست نہیں کر سکتے، یہ لوگ جن کا کریکٹر بے حد پست ہوتا ہے، سیاست کے میدان میں اپنے وطن کا نظام ٹھیک کرنے اور لوگوں کو اخلاقیات کا سبق دینے کے لیے نکلتے ہیں۔۔۔ کس قدر مضحکہ خیز چیز ہے!

یہ لوگ جنہیں عرف عام میں لیڈر کہا جاتا ہے، سیاست اور مذہب کو وہ لنگڑا، لولا اور زخمی آدمی تصور کرتے ہیں جس کی نمائش سے ہمارے یہاں گداگر عام طور پر بھیک مانگتے ہیں۔ سیاست اور مذہب کی لاش ہمارے یہ نام نہاد لیڈر اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں اور سیدھے سادھے لوگوں کو جو ہر بات مان لینے

کے عادی ہوتے ہیں جو اونچی سروں میں کہی جاتی ہے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ وہ اس لاش کو از سر نو زندگی بخش رہے ہیں۔

مذہب جیسا تھا ویسا ہی ہے اور ہمیشہ ایک جیسا رہے گا۔ مذہب کی روح ایک ٹھوس حقیقت ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوسکتی۔ مذہب ایک ایسی چٹان ہے جس پر سمندر کی خشمناک لہریں بھی اثر نہیں کرسکتیں۔ یہ لیڈر جب آنسو بہا بہا کر لوگوں سے کہتے ہیں کہ مذہب خطرے میں ہے تو اس میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ مذہب ایسی چیز ہی نہیں کہ خطرے میں پڑ سکے۔ اگر کسی بات کا خطرہ ہے تو وہ ان لیڈروں کا ہے جو اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے مذہب کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔

ہندوستان کو ان لیڈروں سے بچاؤ جو ملک کی فضاء بگاڑ رہے ہیں اور عوام کو گمراہ کر رہے ہیں آپ نہیں جانتے مگر یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے یہ نام نہاد لیڈر اپنی اپنی بغل میں ایک صندوقچی دبائے پھرتے ہیں۔ جس میں یہ لوگوں کی جیبیں کتر کر روپیہ جمع کرتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک لمبی دوڑ ہے۔ سرمائے کے پیچھے، ان کے ہر سانس میں آپ ریا کاری اور دغا بازی کا تعفن محسوس کر سکتے ہیں۔

لمبے لمبے جلوس نکال کر، منوں بھاری ہاروں کے نیچے دب کر، چوراہوں پر طویل طویل تقریروں کے کھوکھلے الفاظ بکھیر کر، ہماری قوم کے یہ نام نہاد راہ نما صرف اپنے لیے راستہ بناتے ہیں جو عیش و عشرت کی طرف جاتا ہے۔

یہ چند لوگ اکٹھے کرتے ہیں مگر کیا انہوں نے آج تک بے کاری کا حل پیش کیا ہے؟۔۔۔۔۔ یہ لوگ مذہب چلاتے ہیں مگر کیا انہوں نے خود کبھی مذہب کے احکام کی پیروی کی ہے؟۔۔۔۔۔ یہ لوگ جو خیرات میں دیئے ہوئے

مکانوں میں رہتے ہیں، چندوں سے پیٹ پالتے ہیں، جو مستعار اشیاء پر جیتے ہیں، جن کی روح لنگڑی، دماغ اپاہج، زبان مفلوج اور ہاتھ پیر شل ہیں ملک وملت کی راہبری کیسے کرسکتے ہیں۔

ہندوستان کو بے شمار لیڈروں کی ضرورت نہیں جو نئے سے نیا راگ الاپتے رہیں ہمارے ملک کو صرف ایک لیڈر کی ضرورت ہے جو حضرت عمر کا سا اخلاص رکھتا ہو، جن کے سینے میں اتاترک کا سپاہیانہ جذبہ ہو، جو برہنہ پا اور گرسنہ شکم آگے بڑھے اور وطن کے بے لگام گھوڑے کے منہ میں باگیں ڈال کر اسے آزادی کے میدان کی طرف مردانہ وار لئے جائے۔

یاد رکھئے! وطن کے خدمت شکم سیر لوگ کبھی نہیں کرسکیں گے۔ وزنی معدے کے ساتھ جو شخص وطن کی خدمت کے لیے آگے بڑھے، اسے لات مار کر باہر نکال دیجئے۔ حریر و پرنیاں میں لپٹے ہوئے آدمی ان کی قیادت نہیں کر سکتے۔ جو سخت زمین پر سونے کے عادی ہیں اور جن کے بدن نرم و نازک پوشاک سے ہمیشہ ناآشنا رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص ریشمی کپڑے پہن کر آپ کو غربت کا سدباب بتانے کی جرأت کرے تو اس کو اٹھا کر وہیں دیجئے جہاں سے نکل کر وہ آپ لوگوں میں آیا تھا۔

یہ لیڈر کھٹمل ہیں جو وطن کی کھاٹ میں چولوں کے اندر گھسے ہوئے ہیں ان کو نفرت کے ابلتے ہوئے پانی کے ذریعے باہر نکال دینا چاہیے۔ لیڈر جلسوں میں سرمائے اور سرمایہ داروں کے خلاف زہر اگلتے ہیں صرف اس لیے کہ وہ خود سرمایہ اکٹھا کرسکیں۔ کیا یہ سرمایہ داروں سے بدتر نہیں؟ یہ چوروں کے چور ہیں، رہزنوں

کے رہزن اب وقت آ گیا ہے کہ عوام ان پر اپنی بے اعتمادی ظاہر کر دیں۔

ضرورت ہے کہ پھٹی ہوئی قمیضوں والے نوجوان اٹھیں اور عزم کو خشم کو اپنی چوڑی چھاتیوں میں لے ان نام نہاد لیڈروں کو اس بلند مقام پر سے اٹھا کر نیچے پھینک دیں جہاں یہ ہماری اجازت لئے بغیر چڑھ بیٹھے ہیں ان کو ہمارے ساتھ، ہم غریبوں کے ساتھ ہمدردی کا کوئی حق حاصل نہیں۔۔۔یاد رکھئے! غربت لعنت نہیں ہے جو اسے لعنت ظاہر کرتے ہیں وہ خود ملعون ہیں وہ غریب اس امیر سے لاکھ درجے بہتر ہے جو اپنی کشتی خود اپنے ہاتھوں سے کھیتا ہے۔۔۔۔اپنے کشتی کے کھویا خود آپ بنئے۔۔۔۔اپنا نفع و نقصان خود آپ سوچئے اور پھر ان لیڈروں، ان نام نہاد راہ نماؤں کا تماشا دیکھئے کہ وہ زندگی کے وسیع سمندر میں اپنی زندگی کا وزنی جہاز کس طرح چلاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ایک اشک آلود اپیل

امرتسر کی تنگ گلیوں اور اس کے غلیظ بازاروں سے بھاگ کر جب میں بمبئی پہنچا تو میرا خیال تھا کہ اس خوبصورت اور وسیع شہر کی فضا فرقہ وارانہ جھگڑوں سے پاک ہو گی مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ چند مہینوں کے بعد ہی بمبئی میں ہندو مسلم فساد شروع ہوا اور دیر تک جاری رہا۔ فساد کا موضوع ہی تھا مندر، مسجد، کئی انسان اس فساد میں ہلاک ہوئے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ افسوس ناک مناظر دیکھے اور دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ پھر میں نے قلم اٹھایا اور ذیل کی اپیل اہالیان بمبئی کے نام شائع کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو ''غیرت مند'' مسلمان مجھے مارنے کے لئے آئے۔ میں ان کی مار سے کیسے بچا، یہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔۔۔۔۔۔

آخری وہی ہوا جس کا کھٹکا تھا۔ ''سبھا منڈپ'' کے قضیے نے افسوس ناک صورت اختیار کی اور بمبئی کی پرسکون فضاء میں ہنگامہ پیکار نے اضطراب پیدا کر دیا۔ ہماری آنکھوں نے ایسے ایسے مظالم اور انسانیت کش مناظر دیکھے جس پر ہر احساس قلب خون کے آنسو روئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چاقو چلے، پتھر پھینکے، لٹھ بازی ہوئی، ڈاکے ڈالے گئے اور آناً فاناً بمبئی کے گلی کوچوں میں خون کے چھینٹے اڑنے لگے۔

ہندوستان کے حصول آزادی کی منزل سے گھسیٹ کر ایک وسیع اور تاریک کھائی میں پھینک دیا گیا۔

ان افسوس ناک فسادات پر جتنا ماتم کیا جائے، کم ہے وہ حضرات جو آزادی

کی قدر کرتے ہیں اور جن کے قلب اس امر سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ اس قسم کے جھگڑے اور فساد ملک اور قوم کے لیے بے حد مہلک ہیں، یقیناً رو رہے ہوں گے ان کی افسردگی اور رنجیدگی حق پر مبنی ہے۔

کوئی ذی عقل اور صاحب ہوش وفہم انسان خون بہانا پسند نہیں کرتا سوائے ان کے جو اپنے اذہان کی آغوش میں بھیانک جرائم وشدائد کی پرورش کرتے ہیں۔ کوئی انسان اپنے بھائی کے گلے پر چھری پھیر کر اس کی رگوں سے بہتے ہوئے خون کا تماشا کرنے سے مسرور نہیں ہو سکتا۔ کسی شخص کی بھی یہ خواہش نہیں ہو سکتی کہ وہ لاشوں کے انبار پر فرطِ مسرت سے رقص کرے۔۔۔۔۔ پھر کیا وجہ ہے کہ چشمِ فلک نے بمبئی کے سینے پر خون کے دھبوں کو بکھرتے دیکھا؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں ان فسادات کے عواقب کو بغور دیکھنا چاہیے اور معلوم کرنے کی سعی کرنا چاہیے کہ ان خونی حادثات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔

دنیا میں جہاں اہلِ درد اور انسانیت دوست انسان ہیں وہاں ایسے بھی ہیں جن کا بیشتر وقت تلواروں اور چھروں کی دھاریں تیز کرنے میں گزرتا ہے اور جو ہر وقت ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ وہ اپنے تیز کیے ہوئے ہتھیار لوگوں کے ہاتھ میں دے کر خون ریزی کا سماں دیکھیں اور پھر خون کے اس تالاب سے اپنی حرص اور اپنے مفاد کی پیاس بجھائیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو جنگلی لوگوں کی بربریت کو ازسرِ نو ہندوستان کی فضاء میں تازہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو چاہتے کہ بازاروں میں دیگر اجناس کی طرح انسانی گوشت پوست کی دکانیں بھی موجود ہوں یہ وہ لوگ ہیں جو

ہندوستان کے ہر عضو کو مفلوج دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔جو اپنی مادر وطن کو آزاد دیکھنے کے خواہش نہیں۔۔۔۔۔جو مکار ہیں غدار ہیں، جن کی رگ رگ اور نس نس میں بدی کا خون موجزن ہے۔جن کی زندگی کا ہر سانس ان کی ریا کاری، دغا بازی، ابلہ فریبی اور انسان دشمنی کے ساتھ وابستہ ہے۔جن کے تنفس میں جہنم کی آگ کے جھونکے ہیں، بدی کے تعفن کے بھبکے ہیں۔تین دمڑی کا پیسہ جن کا خدا ہے اور جو اس معبود کی عبادت میں شب و روز مخمور رہتے ہیں۔

یہ لوگ لیڈر ہیں۔۔۔۔۔۔ملک وقوم کے نام نہاد راہنما۔۔۔۔بلی کے پنجے اوپر سے دیکھو تو نرم نرم روئیں اور اندر اندر تیز ناخن تقریریں سنئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام دنیا کا درد سمٹ کر ان کے سینوں میں جمع ہو گیا ہے اور جب ان کے اندر جھانک کر دیکھا جائے تو حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ان کا ایمان و ایقان ان کا جذبہ خدمت مذہب وملت، ان کی طہارت، ان کی بلند بانگ وعظ اور ان کے درد سب کچھ اصلی روپ میں نظر آجاتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کے دامن پر اس قدر بدنما دھبے بھی موجود ہیں۔

بمبئی کی موجودہ ہنگامہ خیزیاں اور خونریزیاں یقیناً رک سکتی تھیں اور ہندو مسلمانوں کے جذبات کو ان خراشوں سے بچایا جا سکتا تھا اگر جانبین تحمل اور بردباری سے کام لیتے اور ٹھنڈے دل سے تمام معاملے پر غور کر کے مفاہمت کی کوئی راہ نکالتے۔برادرانہ اخوت کا کام میں لا کر ملک کو اس مہلک ضرب سے بچانے کی کوشش کرتے۔

چند حضرات نے اس قسم کی کوششیں کیں مگر مقام تاسف ہے کہ ان سانپوں کی

پھنکاروں (میرا اشارہ حافظ علی بہادر خاں کی طرف تھا) نے بنا بنایا معاملہ بگاڑ دیا، جو اپنے زہریلے سانسوں کے مظاہرے کے لیے اس نوع کے لمحات کو بہت مناسب اور مقصد پرور خیال کرتے ہیں۔

جن لیڈروں نے مذہب کا ڈھنڈورہ پیٹ کر اور اپنا گلا پھاڑ پھاڑ کر شہریوں کے جذبات کو مشتعل کیا ہے اور یہاں کے گلی کوچوں کی سلوں پر ایک خونچکاں داستان کے نہ مٹنے والے حروف کندہ کیے ہیں، انہیں اس حقیقت سے باخبر رہنا چاہیے کہ ملک میں ایسی صاحب فہم و دانش جماعت موجود ہے جو ان کی شر انگیزیوں کو خوب سمجھتی ہے اور جو انہیں نفرت کی نظروں سے دیکھتی ہے۔

قصر آزادی کی تعمیر فرقہ وارانہ فساد کے شکار انسانوں کے لہو اور خود غرض لیڈروں کے نمائشی پیروپیگنڈے سے نہیں ہو سکتی اس لیے کہ ان لوگوں کا وجود نہ صرف آزادی اور اخوت کی راہ میں سنگ گراں ہے بلکہ انسانیت کے جسم پر ایک کاری ضرب ہے۔ یہ لوگ اصلی ہمدرد بن کر وطن کی گردنوں پر مرد تسمہ پا کی طرح سوار ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ ان فساد پرور لیڈروں کا مقاطعہ کیا جائے اور ہر چہار اکناف سے ان پر لعنتیں برسائی جائیں۔ جو ہر کام پر نوجوانان وطن کی امیدوں اور ان کے ولولوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

مجھے شکایت ہے

مجھے شکایت ہے ان لوگوں سے جو اردو زبان کے خادم بن کر ماہانہ، ہفتہ وار یا روزانہ پرچہ جاری رتے ہیں اور اس ''خدمت'' کا اشتہار بن کر لوگوں سے روپیہ وصول کرتے ہیں مگر ان مضمون نگاروں کو ایک پیسہ بھی نہیں دیتے جن کے خیالات وافکار ان کی آمدن کا موجب ہوتے ہیں۔

مجھے شکایت ہے ان ایڈیٹروں سے جو ایڈیٹر بھی ہیں اور مالک بھی جو مضمون نگاروں کی بدولت چھاپے خانے کے مالک بھی ہیں لیکن جب ایک مضمون کا معاوضہ دینا پڑ جائے تو ان کی روح قبض ہو جاتی ہے۔

مجھے شکایت ہے ان سرمایہ داروں سے جو ایک پرچہ روپیہ کمانے کے لیے جاری کرتے ہیں اور اس کے ایڈیٹر کو صرف پچیس یا تیس روپے ماہوار تنخواہ دیتے ہیں اور ایسے سرمایہ دار خود تو بڑے آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں لیکن وہ ایڈیٹر جو خون پسینہ ایک کر کے ان کی دولت میں اضافہ کرتے ہیں، ان کی آرام دہ زندگی سے ہمیشہ دور رکھے جاتے ہیں۔

مجھے شکایت ہے ان ناشروں سے جو کوڑیوں کے دام تصانیف خریدتے ہیں اور اپنی جیبوں کے لیے سینکڑوں روپے اکٹھے کر لیتے ہیں جو سادہ لوح مصنفین کو نہایت چالاکی سے پھانستے ہیں اور ان کی تصانیف ہمیشہ کے لیے ہڑپ کر جاتے ہیں۔

مجھے شکایت ہے ان سرمایہ دار جہلاء سے جو روپے کا لالچ دے کر غریب اور

افلاس زدہ ادیبوں سے ان کے افکار حاصل کرتے ہیں اور اپنے نام سے انہیں شائع کرتے ہیں۔

سب سے بڑی شکایت مجھے ان ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں سے ہے جو اخباروں اور رسالوں میں بغیر معاوضے کے مضمون بھیجتے ہیں۔ وہ کیوں اس چیز کو پالتے ہیں جو ایک کھیل بھی ان کے منہ میں نہیں ڈالتی۔ وہ کیوں ایسا کام کرتے ہیں جس سے ان کو ذاتی فائدہ نہیں پہنچتا۔ وہ کیوں ان کاغذوں پر نقش و نگار بناتے ہیں جو ان کے لیے کفن کا کام بھی نہیں دے سکتے۔

مجھے شکایت ہے ------- مجھے شکایت ہے ----- مجھے اس ہر چیز سے شکایت ہے جو ہمارے قلم اور ہماری روزی کے درمیان حائل رہی۔ مجھے اپنے ادب سے شکایت ہے جس کی کنجی صرف چند افراد کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے ادب کی کنجی پریس ہے جس پر چند ہوس پرست سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ چند ایسے تاجروں کا قبضہ ہے جو ادب سے اتنے ہی دور ہیں جتنے کہ وہ تجارت کے نزدیک مجھے اپنے ہم پیشہ ادیبوں سے شکایت ہے جو ان چند افراد کی ذاتی اغراض اپنے قلم سے پوری کرتے ہیں جو ان کے جائز اور ناجائز مطالبے پر اپنے دماغ کی قاشیں پیش کر دیتے ہیں۔ مجھے شکایت ہے، مجھے اپنے آپ سے بھی شکایت ہے اس لیے کہ میری آنکھیں بہت دیر کے بعد کھلی ہیں۔ بڑی دیر کے بعد یہ مضمون میں لکھنے بیٹھا ہوں جو آج سے بہت پہلے مجھے لکھ دینا چاہیے تھا۔

ہندی ہندوستانی اور اردو ہندی کے قضیے سے کوئی واسطہ نہیں ہم اپنی محنت کے دام چاہتے ہیں مضمون نویسی ہمارا پیشہ ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اس کے ذریعے سے

زندہ رہنے کا مطالبہ نہ کریں جو پرچے، جو رسالے، جو اخبار ہماری تحریروں کے دام ادا نہیں کر سکتے، بالکل بند ہو جانے چاہئیں۔ ملک کو ان پرچوں کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ادب ہی کو ان کی کوئی ضرورت ہے۔

ملک اور اس کے ادب کو لکھنے والے چاہئیں اور لکھنے والوں کو ایسے اخبار اور ایسے رسالے چاہئیں جو ان کی محنت کا معاوضہ ادا کریں۔ اخبار اور رسالے چھاپنا کوئی رضا کارانہ کام نہیں ہے وہ لوگ جو زبان اور ادب کی خدمت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، میری نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ زبان اور ادب کی خدمت کاغذ سیاہ کر دینے سے نہیں ہوتی۔ ہر مہینے کاغذ کا ایک پلندہ پیش کر دینے سے نہیں ہوتی۔ زبان اور ادب کی کوئی خدمت ہو سکتی ہے صرف ان کی محنت کا معاوضہ ادا کرنے ہی سے ہو سکتی ہے۔

پچھلے دنوں میں نے اپنا ایک مضمون ہندوستان کے ایک ایسے ماہانہ پرچے کو بھیجا جس کی آمدن سے پچیس لکھنے والوں کی مالی پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں۔ مضمون کے ساتھ میں نے ایک خط بھیجا جس میں یہ لکھا تھا کہ اگر آپ اس کا معاوضہ ادا کر سکتے ہوں تو اپنے پرچے میں چھاپیں ورنہ واپس بھیج دیں۔

جیسا کہ مجھے معلوم تھا، مضمون واپس بھیج دیا گیا، اس کے ساتھ ایڈیٹر صاحب نے جو خط بھیجا اس میں یہ لکھا تھا کہ چونکہ جنگ کے باعث بہت سے اخراجات کی کمی کرنا پڑی ہے اس لیے رسالہ کے مالکوں نے مضامین کی اجرت دینے کا سلسلہ بھی بند کر دیا ہے۔

یہ خط پڑھ کر میرے جی میں آئی کہ اس کا جواب اس طرح لکھوں ’’مجھے بہت

افسوس ہے کہ جنگ کے باعث آپ کی مالی حالت اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ آپ کو مضامین کے معاوضے کا سلسلہ بند کر دینا پڑا۔ میری رائے ہے کہ آپ پرچہ بند کر دیں خواہ مخواہ نقصان اٹھانے کی کیا ضرورت ہے جنگ ختم ہو جانے پر جب حالات موافق ہو جائیں تو پھر سے اپنا پرچہ جاری فرما دیجئے گا۔''

میں پھر کہتا ہوں کہ ہمارے یہاں ایسے پرچوں کا وجود ہی نہیں ہونا چاہیے جو معاوضہ ادا کرتے وقت اس قسم کی عذر لنگ پیش کریں۔ آخر ملک کو ایسے پرچوں کی ضرورت ہی کیا ہے میری رائے ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان کی اشاعت بالکل بند کر دی جائے تاکہ دوسرے پرچے جو ادیبوں کو ان کی محنت کا حق ادا کرتے ہیں، زیادہ پھل پھول سکیں ہمارے ادب کو دس ہزار اخباروں اور رسالوں کی ضرورت نہیں صرف دس کی ضرورت ہے جو ہماری ضروریات پوری کریں۔

وہ پرچے، وہ رسائل، وہ اخبار جو ہماری ضروریات پوری نہیں کرتے، آخر کس مرض کی دوا ہیں۔ ہم ان کی زندگی کے لیے کیوں جدوجہد کریں۔ جب وہ زندگی میں ہمارے مدد و معاون نہیں ہوتے۔

مضمون نگار دماغی عیاس نہیں افسانہ نگار خیراتی ہسپتال نہیں ہیں ہم لوگوں کے دماغ لنگر خانے نہیں ہیں ہم اس زمانے کو اور اس کی یاد تک کو ماضی کے تاریک گڑھوں میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دینا چاہتے ہیں جب شاعر بھک منگے ہوتے تھے اور جب صرف وہی لوگ عیاشی کے طور پر مضمون نگاری کیا کرتے تھے جن کے پاس کھانے کو کافی ہوتا تھا۔

ہم نئے زمانے، نئے نظام کے پیغامبر ہیں۔ ہم ماضی کے کھنڈروں پر مستقبل

کی دیواریں استوار کرنے والے معمار ہیں ہمیں کچھ کرنا ہے، ہمارے راستے میں مشکلات حائل نہیں ہونی چاہئیں۔ ہم گرسنہ شکم اور برہنہ پا نہیں رہ سکتے ہمیں اپنے قلم سے روزی کمانا ہے اور ہم اس ذریعے سے روزی کما کر رہیں گے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم اور ہمارے بال بچے فاقے مرتے رہیں اور جن اخباروں اور رسالوں میں ہمارے مضامین چھپتے ہیں، ان کے مالک خوش حال رہیں۔

ہم ادیب ہیں، بھڑ بھونجے نہیں، ہم افسانہ نگار ہیں، کنجڑے نہیں۔ ہم شاعر ہیں بھنگی نہیں، ہمارے ساتھ دنیا کو امتیازی سلوک روا رکھنا ہو گا ہم لوگوں کو مجبور کریں گے کہ وہ ہمارا احترام کریں ہم تاروں سے باتیں کرنے والے ہیں ہم ایسی باتیں ہرگز نہیں سنیں گے جو ہمیں پستی کی طرف لے جائیں۔ ہمارا رتبہ ہر لحاظ سے ان لوگوں سے بہتر ہے جو صرف روپے گننے کا کام جانتے ہیں ہم ہر جہت سے ان لوگوں کے مقابلے میں ارفع و اعلیٰ ہیں جو نہ بنا سکتے ہیں اور نہ ڈھا سکتے ہیں۔

ہم ادیب، ہم شاعر، ہم افسانہ نگار بنا بھی سکتے ہیں اور ڈھا بھی سکتے ہیں۔ ہمارے ہاتھ میں قلم ہے جو قوموں کی سوئی ہوئی تقدیریں جگا سکتا ہے۔ جو ایک ایک جنبش کے ساتھ انقلاب برپا کر سکتا ہے۔

ہماری عظمت ہماری بزرگی تسلیم کرنا ہو گی ان تمام لوگوں کو ماننا ہو گی جو ہمارے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں ہمارے لیے ہندوستانیوں کو ایک خاص جگہ بنانا ہو گی جہاں ہم آرام و اطمینان سے اپنا کام کر سکیں۔ ہم اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل چاہتے ہیں ہمیں تاج و تخت کی خواہش نہیں ہم کشکول لے کر پھرنے والے انسان نہیں ہیں ہم زر و دولت کے انبار نہیں چاہتے، ہم گداگر نہیں ہیں، ہم

انسانوں کی سی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ ہم انسان ہیں۔

ہم پر وہ دروازے کیوں بند کر دیئے جاتے ہیں جن میں سے گزر کر ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ان دروازوں کو مقفل کر کے پھر یہ رونا کیوں رویا جاتا ہے ''ہمارا ادب بہت پیچھے ہے، اس میں ترقی کیوں نہیں ہو سکتی۔ لکھنے والے بہت کم ہے وغیرہ وغیرہ'' لکھنے والے کیسے پیدا ہوں گے ادب میں کیسے ترقی ہو گی۔ جب ہر ایک صوبے سے سینکڑوں پرچے شائع ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک کے ماتھے پر ہمیں خدمت ادب کا لیبل نظر آتا ہے۔ پرچے پرچے نہیں ہیں، کاغذی کشکول ہیں جن میں ہم سے اور دوسرے لوگوں سے بھیک ڈالنے کے لیے کہا جاتا ہے، ایسے کشکول نہیں ہونے چاہئیں ان کے وجود سے ہمارا ادب بالکل اب پاک ہو جانا چاہیۓ، آج ہی، ابھی ابھی۔۔۔۔۔!

میں اپنے ان تمام ہم پیشہ بھائیوں سے جن میں خودداری و خود اعتمادی کا مادہ موجود ہے، کہوں گا کہ وہ ان تمام پرچوں سے اپنا تعلق قطع کر لیں جو ان کی محنت کے دام ادا نہیں کرتے۔ آج ہی ہمیں ان تمام پرچوں، رسالوں اور اخباروں کے وجود سے انکار کر دینا چاہیے جو مفت خور ہیں ان رسالوں اور مقبروں میں کیا فرق ہے جہاں کے مجاور ہر وقت جھولی پھیلائے نذر مانگتے پھرتے رہتے ہیں۔ ہمیں نہ ایسے مقبروں کی ضرورت ہے اور نہ ایسے رسالوں اور اخباروں کی، جن سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

پریس کو جہاں یہ پلندے چھپتے ہیں، روپیہ ادا کیا جاتا ہے۔کاتبوں کو جو لکھائی کرتے ہیں، معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔ان مزدوروں کو ہر روز، ہر ہفتے یا ہر مہینے

مزدوری ادا کی جاتی ہے۔ جوان کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں مگر مضمون نگاروں کو ان کی محنت کے دام ادا نہیں کیے جاتے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے۔

کیا مضمون نگار کی ضروریات زندگی نہیں؟ کیا اسے بھوک نہیں لگتی؟ کیا اسے پہننے کو کپڑے نہیں چاہئیں؟ کیا وہ انسان نہیں ہے؟ اگر وہ انسان ہے تو پھر اس سے حیوانوں کا سا سلوک کیوں روا رکھا جاتا ہے؟

میں بغاوت چاہتا ہوں ہر اس فرد کے خلاف بغاوت چاہتا ہوں جو ہم سے محنت کرتا ہے مگر اس کے دام ادا نہیں کرتا۔

میں بغاوت چاہتا ہوں، زبردست بغاوت چاہتا ہوں کہ ہمارے ادب سے یہ بدعت بالکل دور ہو جائے۔ جس کی موجودگی میں مضمون نگار اپنی محنت کا معاوضہ طلب کرتے جھجکتا ہے۔ میں اس حجاب کے خلاف بغاوت چاہتا ہوں جو سرمایہ دار طبقے نے ہم لوگوں پر ایک زمانے سے اپنے فائدے کے لیے طاری کر رکھا ہے، میں اس احساس کے خلاف بغاوت چاہتا ہوں جو اس حجاب نے ہمارے دلوں میں پیدا کر دیا ہے اس احساس کے خلاف جس کی موجودگی میں اکثر مضمون نگار یہ خیال کرتے ہیں کہ مضمون نگاری محض شغل ہے ایسا شغل جو محض بے کار آدمیوں کا کام ہے۔

ادب کی رونق ہمارے دم سے ہے۔ ان لوگوں کے دم سے نہیں جن کے پاس چھاپنے کی مشینیں، سیاہی اور ان گنت کاغذ ہیں۔ لٹریچر کا دیا ہمارے ہی دماغ کے روغن سے جلتا ہے۔ چاندی اور سونے سے اس کی بتی روشن نہیں ہو سکتی۔ اگر آج

ہم شاعر، افسانہ نگار اور مقالہ نویس اپنے قلم ہاتھ سے رکھ دیں تو کاغذوں کی پیشانیاں تلک سے محروم رہیں۔

اگر ہمیں مضمون نگاری کو ایک معزز پیشہ بنانا ہے تو ہمیں اپنا احترام مخالفین کی آنکھوں میں پیدا کرنا ہے۔ ہمیں لڑنا ہوگا ہمیں ایک زبردست جنگ کرنا ہوگی ہمیں ہڑتال کرنا ہوگی اپنے خیالات و افکار کی ہڑتال کرنا ہوگی ہمیں اس وقت تک اپنے جذبات و محسوسات اپنے اندر دبا کر رکھنا ہوں گے جب تک پیار کے مارے کاغذ کی زبان باہر لٹک نہ پڑے۔ بھوک کی شدت سے اس کا برا حال نہ ہو جائے۔

آؤ! ہم اپنا ایک محاذ بنائیں سب اکٹھے ہو جائیں اگر ہم سب اپنے قلم ایک جگہ پر رکھ دیں تو ایک پہاڑ کھڑا ہوسکتا ہے کیوں نہ تم تعاون سے اس بدعت کے خلاف آواز بلند کرسکیں جو ہمارے وقار پر ایک بدنما دھبہ ہے ہم سوسائٹی میں اپنے لیے جگہ چاہتے ہیں اور بس ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہماری محنت کو معاوضے کے قابل سمجھا جائے اور ہمیں وہ تمام سہولیات بہم پہنائی جائیں جن کے ہم حق دار ہیں۔ ہمارا مطالبہ جائز ہے پھر کیوں نہ ہم آج ہی سے اپنے حقوق مانگنا شروع کر دیں۔

آخر کب تک ادیب ایک ناکارہ آدمی سمجھا جائے گا کب تک شاعر کو ایک گپیں ہانکنے والا متصور کیا جائے گا۔ کب تک ہمارے لٹریچر پر چند خودغرض اور ہوس پرست لوگوں کی حکمرانی رہے گی کب تک؟

جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، مجھے شکایت ہے اپنے مضمون نگار بھائیوں

ہے جن کی تحریریں دوسروں کی روزی کا ذریعہ بنتی ہیں مگر ان کے لیے ایک دھیلا بھی پیدا نہیں کر سکتیں وہ مضمون لکھتے ہیں کسی اور حیلے سے پیٹ بھر کر وہ شعر لکھتے ہیں کسی دوسرے کنویں سے اپنی پیاس بجھا کر۔ وہ مقالے لکھتے ہیں مگر اپنی ستر پوشی کا سامان حاصل کرنے کے لیے انہیں کوئی اور ہی کام کرنا پڑتا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ان کے مضمون، ان کے شعر، ان کے مقالے ان لوگوں کی بھوک اور پیاس بجھاتے ہیں جو صرف انہیں کاغذ کے چند پرزوں پر چھاپ دیتے ہیں ان کی تحریریں دوسروں کا تن ڈھانکتی ہیں مگر ان کے لیے کپڑے کی ایک چندی بھی حاصل نہیں کر سکتیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے ایسا نہیں ہوگا۔

ہمیں حالات کو بدلنا ہے اور ہم حالات کو بدل کر رہیں گے ایک انقلاب برپا ہونا چاہیے جو حالات کو پلٹ دے ادیب اپنے قلم سے روزی کمائے سقف نیلوفری کے نیچے وہ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح خدا کی نعمتوں کو استعمال کریں اور لوگ اس کے پیشے کو احترام کی نظروں سے دیکھیں۔

زمانہ کروٹ بدل رہا ہے۔ آؤ ہم بھی کروٹ بدلیں اور ایک کروٹ میں وہ تمام بدعتیں جھٹک دیں جو ہمارے ساتھ چپک دی گئی ہیں۔ آؤ ہم ایک شان سے زندہ رہیں اور شان سے مریں۔ ہماری زندگی اور ہماری موت میں ایک امتیازی شان ہونا چاہیے اس لیے کہ ہم شاندار ہیں ہم ادیب ہیں، شاعر ہیں، ہم افسانہ نگار ہیں ہمارے ہاتھ میں قلم ہے جو تلوار سے زیادہ طاقتور ہے۔

حضرات! حالات بہت نازک ہو گئے ہیں اب تو یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ بعض اہل قلم لوگوں نے دکانیں کھول لی ہیں۔ جہاں وہ خریداروں کے ہاتھ

غزلیں، مضمون اور افسانے بیچتے ہیں آٹھ آٹھ آنے میں غزل بیچی جا رہی ہے۔ بیس بیس روپے میں ناول لکھنے کو لوگ تیار ہیں پانچ روپے افسانے کا نرخ ہے ایسی کئی دکانوں کا اشتہار آپ نے پرچوں میں پڑھا ہوگا۔ ان اشتہاروں کا معاوضہ یہ لوگ مضامین اور غزلوں کی صورت میں ادا کرتے ہیں یہ صرف اس لیے ہو رہا ہے کہ ہم لوگ غافل ہیں ہم نے اپنی پوزیشن خود گرا رکھی ہے۔

لیکن حالات ایک منٹ میں سدھر سکتے ہیں چٹکی بجانے کے عرصے میں ہم اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کر سکتے ہیں بہت ہی کم عرصے میں ہم اپنے لیے ایک خوبصورت دنیا بنا سکتے ہیں جس میں ہم کو ہر طرح کی آزادی ہوگی کیا ارادہ ہے آپ کا؟

میں کہتا ہوں اٹھو! اپنے سوئے ہوئے بھائیوں کو جھنجھوڑو ان کے کانوں تک میرا پیغام پہنچاؤ۔ ایک جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ۔ اپنا ایک محاذ بناؤ اور جنگ شروع کر دو۔ اپنے قلموں و کچھ عرصے کے لیے روشنائی سے روک دو۔ کاغذ کی دنیا تمہارے قدموں پر سر رکھ دے گی۔

☆☆☆☆☆

شریف عورتیں اور فلمی دنیا

جب سے ہندوستانی صنعت فلم نے کچھ وسعت اختیار کی ہے، سماج کے پیشتر حلقوں میں یہ سوال بحث کا باعث بنا ہوا ہے کہ شریف عورتوں کو اس ملکی صنعت سے اشتراک کرنا چاہیے یا نہیں؟

بعض اصحاب اس صنعت کو کسبیوں اور بازاری عورتوں کی ''نجاست'' سے پاک کرنے کے پیش نظر اس بات کے حق میں ہیں کہ شریف عورتیں بیش از بیش سینما کے نقرئی پردے پر آنے کی کوشش کریں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو سینما لائن سے شریف عورتوں کا اشتراک ایک لمحے کے لیے گوارا نہیں کرتے اور اسے ایک گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ اول الذکر ملکی صنعت کو پاک کرنے کے شاندار جذبے کے زیر اثر یہ بھول جاتے ہیں کہ جس نجاست کو وہ ایک چہرے سے دور کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے چہرے پر ویسی کی ویسی جمی رہتی ہے۔ فلمی کارخانوں سے کسبیوں کو باہر نکال دینے سے وہ بازار بند نہیں ہوتے جہاں یہ عورتیں مردوں کے پاس اپنی اجناس فروخت کرتی ہیں۔

موخر الذکر کو اسٹوڈیو کی گندی فضاء میں شریف عورتوں کو جانے کی اجازت نہیں دیتے اس مجلّا و مطہر جذبے کی شدت کے باعث یہ حقیقت بالکل بھول جاتے ہیں کہ وہ بدچلن عورتیں جو سینما کے پردوں پر آتی ہیں اور جن کے آرٹ سے وہ علم حاصل کرتے ہیں، کسی زمانے میں شریف عورتیں ہی تھیں۔

اگر چکلے کی کوئی عورت اپنا کاروبار چھوڑ کر فلم کمپنی میں داخل ہو جاتی ہے اور اس نئی لائن میں اپنا کام بطریق احسن کرتی ہے تو ہمیں یا آپ کو اس کے اس اقدام پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ بازاری عورتیں سماج کی پیداوار ہیں اور سماج کے وضع کردہ قوانین کی کھاد ان کی پرورش کرتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انہیں بیگانہ تصور کیا جائے اور کیوں ان کی موت کی تدابیر سوچی جائیں جب کہ وہ سماج کا ایک حصہ ہیں، اس کے جسم کا ایک عضو ہیں۔ اگر ان کو اچھا بنانا درکار ہے تو سارے جسم کے نظام کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک سماج اپنے قوانین پر از سر نو غور نہ کرے گا وہ ''نجاست'' دور نہ ہو گی جو تہذیب و تمدن کے اس زمانے میں ہر شہر اور ہر بستی کے اندر موجود ہے۔

سانس کا زیر و بم قائم رکھنے کے لیے دفتر کا بے ضرر کلرک سارا دن حساب کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور سینکڑوں کاغذ سیاہ کرتا ہے ٹھیک اسی طرح زندہ رہنے کے لیے شہر کا مے فروش دن بھر قانون کے سائے تلے شراب بیچتا ہے دونوں کا مقصد ایک ہے راستے جدا جدا ہیں، بہت ممکن ہے کہ اگر ہمارے دفتر کے بے ضرر کلرک کو ایسے ذرائع میسر آتے یا حالات کچھ اس قسم کے ہوتے تو وہ مے فروشی شروع کر دیتا۔ کیا وجہ ہے کہ عورتوں کا جسم بیچنا حیرت اور نفرت سے دیکھا جاتا ہے ایسی عورتوں کا وجود ہرگز حیرت خیز یا نفرت انگیز نہیں ہے۔

ہماری شریف عورتوں کی شرافت اس لیے برقرار ہے کہ انہوں نے بالکل جدا قسم کے ماحول میں پرورش پائی۔ والدین کے سایہ عاطفت سے نکل کر وہ اپنے کماؤ شوہروں کے پاس چلی آئیں اور زندگی کے پر پیچ راستوں سے بالکل الگ

تھلگ رہیں۔۔۔۔۔

جن شریف عورتوں کو والدین کا سایہ عاطفت نہ ملا۔ جو تعلیم سے بے بہرہ ہیں جن کو خود پیٹ بھرنے کا سامان کرنا پڑا وہ سڑک کے پتھر کی طرح جدا ہو گئیں انہیں لامحالہ ٹھوکریں کھانا پڑیں کچھ مقابلے کی تاب نہ لا کر مر گئیں کچھ سڑکوں پر بھیک مانگنے لگیں، کچھ ہسپتالوں میں داخل ہو گئیں، کچھ محنت مزدوری کے ذریعے سے اپنا پیٹ پالنے لگیں اور کچھ زندگی کی ایک آگ سے گزر کر ایک ایسے تنور میں جا گریں جو ہمیشہ گرم رہتا ہے یعنی وہ بیسوا بن گئیں۔

ویشیا پیدا نہیں ہوتی، بنائی جاتی ہے یا خود بنتی ہے۔ جس چیز کی مانگ ہو گی منڈی میں ضرور آئے گی۔ مرد کی نفسانی خواہشات کی مانگ عورت ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو چنانچہ اس مانگ کا اثر یہ ہے کہ ہر شہر میں کوئی نہ کوئی چکلہ موجود ہے اگر آج یہ مانگ دور ہو جائے تو یہ چکلے خود بخود غائب ہو جائیں گے۔

جو نظریہ ہمارے نام نہاد وقار پسند حضرات نے ویشیاؤں کے متعلق قائم کر رکھا ہے، بنیادی طور پر غلط ہے اس میں اپنے اپنے ذاتی وقار، ذاتی تعزز اور ذاتی تشخص برقرار رکھنے کے جذبے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ چونکہ مرد کے ہاتھ میں اکثر و بیشتر اختیارات کی باگ ڈور ہے، اس لیے وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ سوسائٹی کے اصولوں کے مطابق مرد مرد رہتا ہے خواہ اس کی کتاب زندگی کے ہر ورق پر گناہوں کی سیاہی لپی ہو مگر وہ عورت جو صرف ایک مرتبہ جوانی کے بے پناہ جذبے کے زیر اثر کسی اور لالچ میں آ کر یا کسی مرد کی زبردستی کا شکار ہو کر ایک لمحے کے لیے اپنے راستے سے بہک جائے، عورت نہیں رہتی۔ اسے حقارت

ونفرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ سوسائٹی اس پر وہ تمام دروازے بند کر دیتی ہے جو ایک سیاہ پیشہ مرد کے لیے کھلے رہتے ہیں۔

میں پوچھتا ہوں اگر عورت کی عصمت ہے تو کیا مرد اس گوہر سے خالی ہے؟ اگر عورت عصمت باختہ ہوسکتی ہے تو کیا مرد نہیں ہوتا؟ اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہمارے تیروں کا رخ صرف عورت کی طرف ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اسٹوڈیو میں ویشیاؤں کا داخلہ بند کر دیا جائے۔ کیا یہ کہنا دبی زبان میں اس بات کا اقرار نہیں کہ مردوں کو اپنے آپ پر قابو نہیں ہے اور کیا یہ اس حقیقت کا ثبوت نہیں کہ مرد عورتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کمزور اور آسانی سے بہک جانے والا ہے۔

اسٹوڈیوں میں عورتوں اور مردوں کا یک جا رہنا ضروری ہے۔ فریقین کے باہمی اختلاف خوشگوار نتائج کا موجب ہوسکتا ہے۔ اگر جسمانی خواہشات کی تکمیل کو فلم لائن کا ایک لازمی جزو خیال نہ کیا جائے اگر مرد اپنے جذبات قابو میں رکھے تو عورت کوشش کے باوجود فضا مکدر نہیں کرسکتی۔

جو حضرات شریف عورتوں کو فلم لائن میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں میں ان سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ شرافت سے ان کی کیا مراد ہے کیا وہ عورت جو قانون کی اس دنیا میں سر بازار اپنا مال بیچتی ہے اور کوئی دھوکا نہیں دیتی ہشریف نہیں ہے۔

اگر شرافت کے معنی باعصمت ہونے کے لیے جاتے ہیں تو میں ان لوگوں سے جو شریف عورتوں کو فلم اسٹوڈیو میں داخل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ

پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ ایکٹریس کے لیے باعصمت ہونا کیا ضروری خیال کرتے ہیں۔۔۔؟ کیا جذبات نگاری اور تمثیل نگاری کے لیے عورت میں عصمت کی برقراری ضروری ہے؟ اگر ان ایسا خیال ہے تو یہ بالکل باطل ہے اور ان کے ادراک کی کمزوری کا باعث ہے۔

جذبات نگاری اور ایکٹنگ کے لیے ایکٹر اور ایکٹریس کو دنیا کے بیشتر نشیب و فراز سے آگاہ ہونا ازبس ضروری ہے کوئی شریف عورت کیمرے کے سامنے اپنے فرضی عاشق کی جدائی کے اثرات اپنے چہرے پر پیدا نہیں کرسکتی، جب تک وہ اسی قسم کے حادثے سے پہلے دو چار نہ ہو چکی ہو۔ جو عورت غم سے ناآشنا ہے وہ غم کے اثرات خود پر کس طرح طاری کرسکتی ہے؟

ایکٹریس بننے سے پیشتر عورت کو عشق و محبت کی تلخیوں اور مٹھاسوں کے علاوہ اور بہت سی چیزوں سے آشنا ہونا چاہیے اس لیے کہ جب وہ کیمرے کے سامنے آئے تو اپنے کریکٹر کو اچھی طرح ادا کرسکے۔

حقائق ہمارے سامنے ہیں ان پر پردہ پوشی نہیں کی جاسکتی۔ اگر ہمیں فلمی فن کی ترفیع مقصود ہے، اگر ہم اس فن کو چمکانا چاہتے ہیں اور اسے غلط خطوط پر چلانے کے متمنی نہیں ہیں تو ہمیں اپنی نظر بلند رکھنا پڑے گی گناہ یا ثواب انسان کی ذات سے متعلق ہے، اس سے فن کو کوئی واسطہ نہیں۔ فلم لائن پر شریف عورتوں کا قبضہ ہو یا غیر شریف عورتوں کا مطلب صرف اس سے ہے کہ ہمارے فلم زندگی کے آئینہ دار ہوں

میں یہ نہیں کہتا کہ حسن فروشی اور جسم فروشی اچھی چیز ہے، میں اس بات کی وکالت بھی نہیں کرتا کہ ان ویشیاؤں کو فلم کمپنیوں میں جوق در جوق داخل ہونا چاہیے

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں یا جو کچھ میں کہہ چکا ہوں، نہایت واضح اور صاف ہے۔

کامیاب ایکٹریس بننے کے لیے ہر عورت کو آزمودہ کار ہونا چاہیے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ وہ تصویر زندگی کے روشن و تاریک دونوں پہلوؤں سے آشنا ہو۔ اس کے آئینۂ دل پر اگر حادثات نے لکیریں نہیں کھینچیں۔ اگر اس کے حافظے کی تختی پر متنوع حوادث کے نقوش موجود نہیں تو وہ کسی صورت میں اچھی اور کامیاب ممثلہ نہیں بن سکتی۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر لکھ چکا ہوں ایکٹریس بننے کے لیے عورت کو زندگی کی سرد اور گرم لہروں سے واقف ہونا بے حد ضروری ہے۔

ایکٹریس چکلے کی ویشیا ہو یا کسی باعزت اور شریف گھرانے کی عورت، میری نظروں میں صرف ایکٹریس ہے اس کی شرافت یا ذلت سے مجھے کوئی سروکار نہیں اس لیے کہ فن ان ذاتی امور سے بہت بالاتر ہے۔

چکلے کی ویشیا نہایت بلند پایہ ادیب ہو سکتی ہے، اس کے خیالات و افکار سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور ایک گرہستی تعلیم یافتہ عورت کی شرافت نہایت ہی مہلک نتائج کا موجب ہو سکتی ہے۔

بغاوت فرانس میں پہلی گولی پیرس کی ایک ویشیا نے اپنے سینے پر کھائی تھی۔ امرتسر میں جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے کی ابتداء اس نوجوان کے خون سے ہوئی تھی جو ایک ویشیا کے بطن سے تھا۔

خاکساران جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

☆☆☆☆☆

ہندوستانی صنعت فلم سازی

1913ء میں مسٹر ڈی جی پھالکے نے ہندوستان کا پہلا فلم بنایا اور اس صنعت کا بیج بویا۔ دادا پھالکے نے آج سے پچیس برس پہلے اپنی دھرم پتنی کے زیورات بیچ کر جو خواب دیکھا تھا، ان کی نگاہوں میں یقیناً پورا ہو گیا ہو گا مگر وہ خواب جو ملک کے ترقی پسند نوجوان دیکھ رہے ہیں، ابھی تک ان کی تعبیر عملی شکل میں نظر نہیں آئی اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ملک کی اس لطیف صنعت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جن کے دل و دماغ پر بڑھاپا طاری ہے جو صرف گردوپیش کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور جن کو آگے بڑھنے کی خواہش ہی نہیں ہوتی کسی صنعت کو بام رفعت تک پہنچانے کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہوتی جن کا تخیل زنگ آلود ہو اور جن کی زندگی ٹھہرا پانی بن کر رہ گیا ہو۔

نوجوانان وطن، جن کی میں نمائندگی کر رہا ہوں، ملک کے وہ نوجوان جو ساز حیات کے ہر تار کو چھیڑ کر نغمے پیدا کرنے چاہتے ہیں۔ وطن کے وہ نوجوان جو بلندیوں میں پرواز کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کے باغ کے وہ پرندے جو اپنے کترے ہوئے پروں کے باوجود اڑنا چاہتے ہیں۔ اپنے ملک کی اس صنعت کی موجودہ رفتار سے مطمئن نہیں وہ بے عقل بچے سہی، تجارتی رازوں سے ناواقف سہی، مفلس سہی لیکن جو تڑپ ان کے سینے میں ہے جو خواہش ان کے دل میں کروٹیں لیتی ہے، جو اضطراب ان کے تمتماتے ہوئے چہروں پر کھیلتا ہے، یقیناً قابل احترام ہے اور تمام وزنی جیبوں والے سرمایہ داروں کو جو انڈیشن موشن پکچر

کانگریس میں اپنی تجوریوں کو نمائش کرنے آئے تھے، ایک سیکنڈ کے لیے احتراماً ملک کے ان پاگل لونڈوں کے دیوانے جذبے کے آگے سر جھکا دینا چاہیے تھا۔

ہندوستان کے ان ترقی پسند نوجوانوں کو بیمار کہا جاتا ہے۔۔۔۔وہ بیمار ہیں، اس میں کوئی شک نہیں، پر یہ بیماری وہ عشق ہے جو ان کو اپنے وطن کے ذرے ذرے سے ہے۔ان کو دیوانہ کہا جاتا ہے،وہ دیوانے ہیں اس لیے کہ وہ اپنے وقت کے قائدین کی ہوش مندی سے مطمئن نہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ اپنے وطن کے رتھ میں سب کے سب جت کر اسے اس مقام پر پہنچا دیں جہاں دوسرے ملک کھڑے ہیں اور اس کے لیے وہ اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔یہ دیوانہ پن ہے مگر اس دیوانگی کا احترام کرنا چاہیے۔ہندوستان کی ہوشمندی، متانت اور سنجیدگی کے ٹھٹھرے ہوئے بند کو گرمانے کے لیے دیوانگی کی اس آگ کی ہر وقت ضرورت ہے۔

ہمیں اچھے فلم چاہئیں،ہمیں ایسے بلند فلم چاہئیں جو ہم غیر ممالک کے فلموں کے مقابلے میں پیش کر سکیں، ہم لوگوں کو یہ خبط ہے،اس بات کی دیوانگی ہے کہ ہمارے وطن کی ہر شے دوسروں کے مقابلے میں اچھی ہو یہ خبط ہماری زندگی کی اصلی گرمی ہے اور ہم اس گرمی کو علیحدہ نہیں کر سکتے۔

انقلاب سے پہلے روس کے حالات ہندوستان سے بدتر تھے،روس میں ادب اور شاعری کا نام ونشان تک نہ تھا مگر اس نے ایک نہایت ہی قلیل عرصے میں ولی پیدا کیے۔میر اور غالب پیدا کیے صنعت فلم سازی میں بھی ان کی ترقی قابل رشک ہے روس نے ایسے ایسے ڈائریکٹر پیدا کیے ہیں کہ ان پر فکر انسان ہمیشہ بجا طور پر

نازاں رہے گا ہمارے ملک نے ان پچیس برسوں میں جن کو نو ہزار ایک سو پچیس دن ہوتے ہیں، کیا کیا ہے؟

کیا ہم ان پچیس برس کا حاصل ان ڈائریکٹروں کی شکل میں پیش کر سکتے ہیں جو اپنے فلموں کا منہ مانگے ہوئے لقمے سے بھرتے ہیں؟۔۔۔۔کیا ہم ان افسانہ نویسوں پر تھوڑی دیر کے لیے بھی فخر کر سکتے ہیں جو دوسروں کی چچوڑی ہڈیوں پر ٹیڑھی بنگی لکیریں کھینچتے ہیں۔

کیا ہم ان فلموں کو دوسرے ممالک کے فلموں کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں جو امریکی فلموں کی ہزارویں کاربن کاپی معلوم ہوتی ہیں؟

ہرگز نہیں ہندوستان میں ٹھیٹ ہندوستانی فلم بننے چاہئیں۔ ہمارے وہ سوشل فلم وج آج کل سینکڑوں کی تعداد میں سینماؤں کے پردوں پر چلتے ہیں۔ کیا ہندوستانی تہذیب کے آئینہ دار ہیں؟ اس کا جواب موٹے قلم سے یہ ہونا چاہیے ''نہیں'' آپ ان فلموں میں کبھی ''ہندوستانیت'' کو امریکی لباس میں دیکھتے ہیں اور کبھی امریکہ دھوتی کرتے میں نظر آتا ہے، جو بے حد مضحکہ خیز ہے۔ ان کو سوشل فلم کہا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح ہر ایکٹر خود کو آرٹسٹ کہتا ہے۔

ہندوستان میں ابھی تک آرٹ کے صحیح معانی پیش نہیں کیے گئے۔ آرٹ کو خدا معلوم کیا چیز سمجھا جاتا ہے یہاں آرٹ ایک رنگ سے بھرا ہوا برتن ہے جس میں ہر شخص اپنے کپڑے بھگو لیتا ہے لیکن آرت یہ نہیں ہے اور نہ وہ تمام لوگ آرٹسٹ ہیں جو اپنے ماتھوں پر لیبل لگائے پھرتے ہیں۔ ہندوستان میں جس چیز کو آرٹ کہا جاتا ہے، ابھی تک میں اس کے متعلق فیصلہ نہیں کر سکا کہ کیا ہے؟

ہندوستانی صنعت فلم سازی میں جن دولفظوں کے ساتھ بہت برا سلوک ہوتا ہے، ان میں سے ایک آرٹسٹ ہے اور دوسرا شاہکار۔ ڈائریکٹر سے لے کر اسٹوڈیو میں تختے ٹھونکنے والے مزدور تک سب کے سب آرٹسٹ ہیں "ہریش چندر" سے لے کر "ستارہ" تک جتنے فلم بنے ہیں، سب کے سب شاہکار ہیں اس سے یہ ہوا کہ آرٹ اپنی قدر ومنزلت کھو بیٹھا ہے اور شاہکار شاہکار نہیں رہا۔

فلم اور پروڈیوسر

ہندوستانی صنعت فلم سازی کی دگرگوں حالت کے متعلق آئے دن اخبارات اور رسائل میں تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں مگر پریس کی اس آواز سے ملک کی اس صنعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے اکثر وبیشتر اخبارات کے پیش نظر ترفیع صنعت کے جذبے کے بجائے جلب منفعت ہے اس میں ایسے اخباروں اور اخبار نویسوں کا کوئی قصور نہیں، جن کے کاغذ اور جن کے قلم پروڈیوسروں کی میزانوں میں تلتے ہیں۔ دراصل ہر شخص کساد بازاری کے اس زمانے میں کسی نہ کسی حیلے سے اپنی روزی کمانا چاہتا ہے اور جب فلمی دنیا میں فلمی خداؤں کے آگے سر جھکانے سے چاندی کے سکے مل جاتے ہیں تو کورنشوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

ہندوستان میں سینکڑوں کی تعداد میں اخبارات ورسائل چھپتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ صحافت اس سرزمین میں ابھی تک پیدا نہیں ہوئی اگر ایسا ہوتا تو آج ہمیں متذکرہ صدر الفاظ میں اپنی کمزوریوں کا اظہار نہ کرنا پڑتا۔ صحافت اپنی فطری شکل خود بخود اختیار کرے گی جب ہمارے ملک سے جہالت دور ہو جائے گی اور

جہالت صرف اسی صورت میں دور ہو سکتی ہے جب دانش گاہوں کے سب دروازے عوام پر کھول دیئے جائیں گے۔

عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کے مختلف طریقے ہیں۔ ان سب میں سے فلم کو متفقہ طور پر بہت باا ثر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ سیلولائیڈ کے فیتے کے ذریعے سے ہم پبلک تک اپنا پیغام بطریق احسن پہنچا سکتے ہیں نصاب کی بھاری بھر کم کتابیں طلباء کے سینے پر بوجھ بن کر رہ جاتی ہیں سکول کے اوقات تعلیم میں ہمارے اکثر بچے دل سے سیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ لیکچر کالج کے بعض لڑکے لڑکیوں کے دماغ پر اثر کرنے کی بجائے ان کے اعصاب پر اثر انداز ہوتے ہیں مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ فلم سے بد دلی کا اظہار بہت کم کیا جاتا ہے جو بات مہینوں میں خشک تقریروں سے نہیں سمجھائی جا سکتی چٹکیوں میں ایک فلم کے ذریعے سے ذہن نشین کرائی جا سکتی ہے۔

فلم کے عالمگیر اور ہمہ رس اثر کے پیش نظر ہمارا خیال ہے کہ ہندوستانی عوام کے اذہان کو بیدار کرنے کے لیے ایسی فلموں کی ضرورت ہے جو کوئی نئی بات سکھائیں اور جن کو دیکھ کر تماشائی تفریح حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ سینما ہال سے باہر نکلتے وقت اپنے دماغوں کی آغوش میں غور و فکر کے جراثیم بھی لیتے جائیں جس طرح جسمانی صحت برقرار رکھنے کے لیے کسرت کی ضرورت ہے ٹھیک اسی طرح ذہن کی صحت برقرار رکھنے کے لیے ذہنی ورزش کی ضرورت ہے۔

مقام تاسف ہے کہ ہمارے فلمی پروڈیوسروں کے پیش نظر سوائے تجارت کے اور کچھ بھی نہیں۔ یہ درست ہے کہ تاجروں کو صرف حصول زر سے مطلب ہوتا ہے اور ہمیں اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں مگر ہم کور ذوقی اور پست مذاقی کا گلہ کیے بغیر

نہیں رہ سکتے۔ ہمارے اکثر پروڈیوسر اپنے نگار خانوں میں تیسرے درجے کے فلم بنا کر پردے پر پیش کرتے ہیں۔صرف اس خیال سے کہ اس قسم کے لچر فلم پبلک کے جیبوں سے زیادہ رقم وصول کر سکتے ہیں یہ خیال بالکل غلط ہے مذاق پیدا کیا جاتا ہے، خود پیدا نہیں ہوتا، اگر پبلک میں پست مذاق کے لوگ موجود ہیں تو اس کے ذمہ دار ہمارے پروڈیوسر ہیں جو مذاق کی پستی کی طرف لے جاتے ہیں۔

جادو کے لایعنی قصے اور پریوں کی فرضی کہانیوں میں اتنی دلچسپی نہیں ہے جتنی کہ ہمارے پروڈیوسر سمجھتے ہیں پبلک ایسی فلم چاہتی ہے جن کا تعلق براہ راست ان کے دل سے ہو۔جسمانی حسیات سے متعلق چیزیں زیادہ دیر پا نہیں ہوتیں مگر جن چیزوں کا تعلق روح سے ہوتا ہے، دیر تک قائم رہتی ہیں۔ماسٹر وٹھل کے اسٹنٹ تماشائیوں کے ذہن سے بالکل نکل چکے ہیں۔اب وہ روحانی خوراک کے لیے خالی ہیں۔

ہمیں اس وقت ایسے فلم درکار ہیں جو ہمیں کچھ سکھائیں۔ایسے فلم نہیں چاہئیں جو ہمیں سب کچھ بھلا دیں۔جو ہمارے اذہان کو زنگ آلود کر دیں۔ہمیں اپنی زبان سے پیار کرنا سکھایا جائے۔ہمیں اپنے وطن سے پیار کرنے کا سبق دیا جائے۔ ہمیں محبت کے حقیقی معنوں سے آشنا کرایا جائے، ہمارے سامنے کتاب انسانیت کے اوراق کھولے جائیں کے ہمارے پروڈیوسر ایسا نہیں کر سکتے ؟ کیا وہ اپنی تجارت کو ہماری مانگ کے ساتھ ساتھ اور زیادہ نہیں بڑھا سکتے۔

اختصار کی ضرورت

ہمارے یہاں خاموش فلموں کے زمانے سے لے کر اب تک جتنے فلم بنے

ہیں ان کی غیر معمولی طوالت دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ہمارے پروڈیوسر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ پبلک غیر معمولی طور پر لمبے فلم پسند کرتی ہے۔ ممکن ہے اس میں کچھ صداقت ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ ایسے طول طویل فلموں کی نمائش سے جہاں صنعت فلم سازی کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے، وہاں تماشائیوں کے اذہان پر بھی اس کا برا اثر پڑ رہا ہے۔ آج کل وہ زمانہ ہے جس میں اختصار کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، کم سے کم وقت میں مطلب حل کرنا آج کل ہر شخص کے پیش نظر ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں کے فلموں میں جو بات سات یا آٹھ ہزار فٹ سیلولائیڈ میں کہی جا سکتی ہے اسے پندرہ یا سولہ ہزار فٹ لمبے فیتے میں پھیلایا جاتا ہے اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

ایک افسانے کو جس کے سارے ابواب آٹھ ہزار فٹ لمبے فلم میں سما سکتے ہیں، اگر ربڑ کی طرح کھینچ کر سولہ ہزار فٹ لمبا بنا دیا جائے گا تو اس میں وہ بات نہ رہے گی جو اس کی فطری طوالت میں تھی۔ افسانے کی حدود سے جو کوئی باہر نکلنے کی کوشش کرے گا، اچھا افسانہ گو نہیں سکتا۔ جس طرح ربڑ کا فیتہ ایک خاص حد تک کھینچا جا سکتا ہے اسی طرح افسانے بھی ایک خاص حد تک کھینچ کر بڑے کیے جا سکتے ہیں اور اگر ہم اس حد سے گزر جائیں گے تو بے چارے افسانے کی ساری ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ جائیں گی اور سب کا سب منتشر ہو جائے گا۔

غیر فطری طور پر لمبے فلم میں ڈائریکٹر خواہ کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو۔ افسانے کو اپنے طور پر قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ فلم طویل ہو گا تو اس میں قدرتی طور پر ڈائیلاگ بھی لمبے لمبے ہوں گے اور ایکٹر ان کی ادائیگی میں یک آہنگی

برتنے لگیں گے۔ فلم طویل ہوگا تو اس کے حادثات اور واقعات بھی طویل ہوں گے۔ جس کے باعث فلم کی رفتار میں لنگڑا پن پیدا ہو جائے جو آنکھوں کو بہت برا معلوم ہوگا۔

طویل فلم کی تیاری میں زیادہ سٹیگ استعمال ہوتے ہیں۔ جن پر کافی روپیہ خرچ آتا ہے۔ اس طرح وہ فلم جو اپنی صحیح شکل میں ساٹھ یا ستر ہزار روپے میں بن سکتا ہے، ایک لاکھ روپے میں تیار ہوگا اور ناکام رہنے کی صورت میں پروڈیوسروں کی کمر توڑ کے رکھ دے گا۔ طویل فلم میں دلچسپی کا عنصر داخل کرنے کے لیے پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں کو بے موقعہ اور بے محل گیت گوانے اور ناچ نچوانے پڑتے ہیں۔ جو فلم کو خوبصورت بنانے کے بجائے نہایت بھدا بنا دیتے ہیں۔ روپیہ خرچ ہوتا ہے مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اس کا باعث صرف یہ حقیقت ہے کہ ہر شے کے لیے ایک مناسب و موزوں جگہ ہوتی ہے۔ جس سے ہٹ کر وہ اپنی تمام خوب صورتی کھو دیتی ہے تماشائیوں کو اگر ایسے طویل فلموں کا عادی بنا دیا گیا تو ان کے اذہان میں طوالت پسندی گھر کر جائے گی اور وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی اس عادت کو داخل کرنے کی کوشش کریں گے جس کے نتائج بہت تنزل آفریں ثابت ہوں گے۔

متذکرہ صدر امور کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ ہمارے پروڈیوسر اپنے فلموں کی تیاری میں اختصار سے کام لیں۔ آج کل سولہ سترہ ہزار فٹ لمبے فلم پر جو کچھ وہ خرچ کر رہے ہیں اگر وہی کچھ اس سے نصف طویل فلم پر خرچ کیا جائے تو ملک کی صنعت فلم سازی میں ایک انقلاب برپا ہو سکتا ہے اور ان لوگوں کی تمام شکایتیں

دور ہو سکتی ہیں جو اس وقت ہمارے فلموں کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔

سینما ہال میں تماشائیوں کے دو گھنٹہ کا پروگرام پیش کرنے کے لیے ہمارے پروڈیوسروں کو ان خطوط پر چلنا چاہیے جو ہالی وڈ کے پروڈیوسروں کے پیش نظر ہیں۔ سات آٹھ ہزار فٹ لمبے فلم کے ساتھ کارٹون یا خبروں کے ایک چرخے یا دو چرخے فلم تیار کیے جائیں جیسا کہ یورپ میں کیے جاتے ہیں۔ اس طرح پبلک جہاں قصے کہانیاں سنیں گی اور دیکھے گی وہاں دوسرے ممالک کے تازہ ترین حالات سے باخبر بھی رہے گی۔ ان لوگوں کے علم میں اضافہ ہوگا۔ اپنے ہمسایہ ممالک سینما ہال میں بیٹھے بیٹھے دیکھ لیں گے اور ان کے دل سے وہ تعجب دور ہو جائے گا جو عام طور پر فاصلہ پیدا کر دیا کرتا ہے بیس پچیس سال تک ہم طویل طویل فلم دیکھتے رہے ہیں اب وقت آ گیا ہے کہ اس بدعت کا خاتمہ کر دیا جائے اور بھاری بھرکم اور شیطان کی آنت کی طرح لمبے فلموں کی بجائے ایسے مختصر فلم پیش کیے جائیں جو ہمارے دماغوں پر وزن نہ ڈالیں۔ وطن کی اس صنعت کو رفعت بخشنے کے لیے اختصار کی بے حد ضرورت ہے۔

ستارے یا ستارہ شناس

تیس برس سے ہالی وڈ کے ارباب فکر اس بات کا فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ فلم سازی میں اسٹار کو زیادہ اہمیت حاصل ہے یا خود فلم کو۔ اس مسئلے پر اس قدر بحث کی جا چکی ہے کہ اب اس کے تصور ہی سے الجھن ہونے لگتی ہے۔ آخر متذکرہ صدر سوال کا فیصلہ کن جواب کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ یہ سوال سن کر یوں کہہ دیا جائے ”کیا فرمایا آپ نے؟“

مرغی پہلے پیدا ہوئی یا انڈہ؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔اگر اس کا جواب کچھ ہو سکتا ہے تو یقیناً اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا کہ اسٹار زیادہ اہمیت رکھتا ہے یا خود فلم۔

فرینک کیپرا کولمبیا فلم کمپنی کے ماہر فن ڈائریکٹر نے حال ہی میں اس مسئلے پر اپنے افکار انگریزی اخبارات میں شائع کئے ہیں مسٹر کیپرا کہتے ہیں ''میں ان لوگوں کا ہم خیال ہوں جو فلم کو سب سے اہم سمجھتے ہیں فلم اسٹار بناتے ہیں اور درخشاں سے درخشاں ستارہ کمزور یا برے فلم کو ناکامی سے بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔''

تجربے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ فلم ستارہ ساز ہے اور ستارے کمزور فلم کو تابانی نہیں بخش سکتے مگر ہمارے یا مسٹر کیپرا کے خیال سے سب متفق نہیں ہو سکتے۔ ایسے سینکڑوں اصحاب موجود ہوں گے جو اپنے نظریئے کے جواز میں اور مسٹر کیپرا کے نظریئے کے ابطال میں ٹھوس دلائل و براہین پیش کر سکتے ہیں۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ ستارے کیوں کر بنتے ہیں یا وہ کون سی چیز ہے جو ستارے بناتی ہے؟

مسٹر کیپرا نے اس سوال کا جواب نہایت دلچسپ انداز میں دیا آپ کہتے ہیں۔۔۔

''اگر دنیا کے تمام پروڈیوسر اپنا سرمایہ فلم جمع کر کے میرے حوالے کر دیں (جو یقیناً کافی ووافی ہوگا) اور مجھ سے یہ کہیں کہ ہمارے فلمی آسمان کے لیے تین ستارے چن کر لا دو تو میں یقیناً خالی الذہن ہو جاؤں گا اس لیے کہ مجھے وہ جگہ

معلوم ہی نہیں جہاں سے یہ ستارے مل سکتے ہیں۔''

خاموش فلموں کے زمانے میں ہالی وڈ کے آسمان فلم کے لیے ستارے عام طور پر ہوٹلوں، کارخانوں اور دفتروں سے آتے تھے لیکن اب کہ فلموں کی خاموشی تکلم میں تبدیل ہو چکی ہے اور اس صنعت کو کافی فروغ حاصل ہو چکا ہے، ستاروں کی سپلائی بہت کم ہوگئی ہے ہمارے یہاں صنعت فلم سازی کے آغاز میں قحبہ خانے، تھیٹر اور چکلے ستارے مہیا کیا کرتے تھے اور اب کہ ہماری صنعت کو کسی قدر فروغ حاصل ہوا ہے، علمی طبقے نے بھی ہمارے فلمی آسمان کے لیے ستارے پیش کرنے شروع کیے ہیں اور مستقبل بعید یا مستقبل قریب میں ایک ایسا وقت آئے گا، جب ہالی ووڈ کی طرح یہاں بھی ستاروں کی سپلائی کم ہو جائے گی مگر ہم یہ سوچ رہے تھے کہ وہ کون سی شے ہے جو ستارے بناتی ہے۔

مسٹر فرینک کیپرا کی (جن کی ڈائریکشن میں ہالی وڈ کے بڑے بڑے نامور ستارے کام کر چکے ہیں) رائے ہے کہ کرداروں کی صحیح تقسیم (یعنی موزوں و مناسب کاسٹ) ستارے بناتی ہے۔

ان کے نظریئے کے اعتبار سے چینی آدمی کا روپ صرف چینی ہی بطریق احسن دھار سکتا ہے اور لنگڑے یا کبڑے آدمی کا پارٹ صرف لنگڑا یا کبڑا آدمی ہی خوبی سے ادا کر سکتا ہے۔

ہمیں مسٹر کیپرا کے اس نظریئے سے اتفاق ہے۔ اسکرین پر کسی کریکٹر کی ادائیگی کے لیے اتنا ہی زیادہ انہیں کامیابی کا موقع ملے گا جس آسانی سے ہم اور آپ اپنے آپ یعنی اپنے اصل کو پیش کر سکتے ہیں۔ اس آسانی سے ہم کسی اور کی

نقل نہیں کر سکتے جہاں تصنع اور بناوٹ کو دخل ہو گا وہاں اصلیت برقرار نہیں رہ سکتی۔

اس نظریئے کے جواز میں مسٹر فرینک کیپرا نے بہت سی مثالیں پیش کی ہیں جن میں سے ایک گیری کوپر کی ہے۔ آپ کہتے ہیں ''گیری کوپر اسکرین پر اپنے آپ کو اصلی رنگوں میں پیش کرتا ہوں اور چونکہ وہ ایک خوش ذوق، عالی خیال اور صاحب فہم انسان ہے اس لیے وہ اپنی کوششوں میں کامیاب رہتا ہے۔''

ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ موزوں و مناسب کاسٹ ستارے بناتی ہے مگر یہ قطعی اور آخری فیصلہ نہیں ہے اس لیے کہ صرف کاسٹ کا موزوں و مناسب ہونا ہی کسی فلم کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔ فلم کی کامیابی کے لیے اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے جن کو آپ بخوبی سمجھتے ہوں گے مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب تک مشینری کے سب پرزے اپنی اپنی جگہ پر اچھا کام نہ کریں گے، فلم کامیاب نہیں ہو سکتا۔

کرداروں اور ٹیکنیشنوں کا باہمی اتحاد پکچر کی صحت کے لیے بہت ضروری ہے جس طرح قیمتی سے قیمتی گھڑی ایک ٹک کرنے سے بھی انکار کر دیتی ہے اس لیے کہ اس کے کسی پرزے کے ساتھ میل کا ایک ننھا سا ذرہ چمٹا ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح قیمتی سے قیمتی فلم، ایک حقیر اور معمولی سی فروگذاشت یا غلطی کے باعث فیل ہو جاتے ہیں۔

صحیح کاسٹ ستارے بنانے میں دیگر عناصر سے کہیں زیادہ ممد و معاون ہے۔ آپ تھوڑی دیر کے غور و فکر کے بعد یقیناً ہمارے ہم نوا ہو جائیں گے چنانچہ فلموں

کو کامیاب بنانے اور ستارے پیدا کرنے کے لیے ہمیں ستارہ شناس نگاہوں کی ضرورت ہے۔

اہل طرز ڈائریکٹر

ہندوستانی فلموں کی بے جانی کا سب سے بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں اہل طرز یعنی سٹائلسٹ ڈائریکٹر کی کمی ہے۔ افسانہ نگاری اور شعر گوئی کے لیے ایک اسٹائل کی ضرورت ہے جو ادب کے جملہ لوازمات میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے اسٹائل ہی ایک شاعر اور دوسرے شاعر کے شعروں کے درمیان حد تمیز کھینچتا ہے۔ اور اسٹائل ہی ایک افسانہ نگار کی کہانی کو دوسرے قصہ نویس کے افسانے کے مقالے میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح فلموں کے ڈائریکٹر کے لیے اسٹائل کی بہت ضرورت ہے۔ اگر ڈائریکٹروں کا اپنا اپنا اسٹائل نہ ہوگا تو فلم متحرک تصاویر کے یک آہنگ فیتے بن کر رہ جائیں گے۔

ہندوستانی فلم ایک عرصے سے اسکرین پر پیش ہو رہے ہیں۔ ان میں سے گنتی کے چند فلم ایسے ہیں جن میں ہمیں ڈائریکٹروں کا اسٹائل نظر آتا ہے۔ اسی اسٹائل کے ذریعہ سے ہم ان کے تشخص کے بارے میں کچھ جان سکے ہیں مگر دوسرے فلم دیکھ کر ہمیں ایک ہی طبقے سے جوڑی ہوئی اور ایک ہی نگاہ سے دیکھی ہوئی چیزیں نظر آتی ہیں۔ ان کے مشاہدے سے ہم صرف اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پبلک کی مانگ پر پروڈیوسروں نے چند نااہل ڈائریکٹر پکڑ کر اپنے سیلولائیڈ کے اوپر بے معنی نقش بنوا لیے ہیں جن کو نہ وہ خود سمجھ سکے اور نہ پبلک ہی سمجھ سکی۔

ہندوستان میں روزانہ سینکڑوں فلموں کی نمائش ہوتی ہے مگر مقام تاسف ہے

کہ ان میں سے بہت کم فلم، فلم ہوتے ہیں دراصل جو ڈائریکٹر یہ فلم تیار کرتے ہیں تخیل سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ وہ اسٹوری وک سامنے رکھ کر صرف کلوز اپ، مڈ شاٹ اور لانگ شاٹ میں کیمرہ رکھنے کا حکم دینا جانتے ہیں۔ اور بس وہ کیمرے کو ہیروئن کے چہرے کے قریب قریب بار بار لے آتے ہیں مگر ان کو کلوز اپ کی اہمیت قطعی طور پر معلوم نہیں ہوتی۔ ایسے ڈائریکٹر ان نام نہاد ادیبوں کے مترادف ہیں جو بے ربط عبارت لکھتے ہیں اور جنہیں الفاظ کی نشست برخواست کا کوئی سلیقہ نہیں ہوتا۔ ارنسٹ کیوبش کا فلم اگر اس کے نام کے بغیر پردے پر آئے تو آپ اس میں ٹھوس مزاح کے ٹچ اور معمولی سے معمولی اشیاء کے موزوں و مناسب استعمال کو فوراً کہہ دیں گے، ارنسٹ کیوبش پردے پر چل پھر رہا ہے۔ دلکش بیرونی مناظر اور پھولوں میں ہیروئن کو تیتری کی طرح پھڑ پھڑاتا دیکھ کر آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ پردے کے پیچھے ڈی، ڈبلیو، گرفتھ کا دل دھڑک رہا ہے، جو نیچر کی سحر کاریوں کا دلدادہ ہے اسی طرح ایرک فان مسٹر اہیم کی حقیقت پسندی چھپائے نہیں چھپ سکتی اس جواز میں اور بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ہالی وڈ کے قریب قریب ہر ڈائریکٹر کا ایک طرز یا اسٹائل ہے اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے مگر یہاں ہندوستان میں اہل طرز ڈائریکٹروں کا فقدان ہے اس وقت صرف دو ڈائریکٹر ایسے ہیں جنہیں صاحب طرز کہا جاسکتا ہے۔ دیوکی بوس اور شانتا رام دیو کی بوس کی مثالیت ہی ایک ایسی چیز ہے جو اسے دوسرے ڈائریکٹروں پر امتیاز بخشتی ہے۔ راج رانی میرا، پورن بھگت، آفٹر دی ارتھ کویک اور ودیاپتی میں آپ دیوکی بوس۔۔۔ خوب دیکھنے والے دیوکی بوس کو سیلولائیڈ کے ہر انچ میں دیکھ

سکتے ہیں۔اس کا اسٹائل اوریجنل ہےاوراسی وجہ سے کامیاب ہے۔

اشاریت اور عظمت پسندی شانتارام کے اسٹائل کے دو بڑے جزو ہیں۔جس فلم میں بھی آپ یہ دو چیزیں پہلو بہ پہلو دیکھیں گے،آپ کا خیال فوراً پربھات فلم کمپنی کے شانتارام کی طرف چلا جائے گا۔وہ اپنے سٹائل میں اور کوئی ثانی نہیں رکھتا اور یہی وجہ ہے کہ اسے ہندوستان کے ڈائریکٹروں کی صف اول میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

نیتن بوس کے نام کا یہاں اس لیے ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ اہل طرز ڈائریکٹر نہیں وہ ایک نہایت اچھا ''نمائش کار'' ہے اس کو اپنے خیالات اور افکار کی نمائش کرنے کا ڈھنگ بہت اچھی طرح یاد ہے اور یہی اس کی قابل رشک کامیابی کا باعث ہے۔

ایکٹنگ

ایکٹنگ یا کردارنگاری اس فن کا نام ہے،جس کے ذریعے سے مختلف انسانوں کے جذبات و محسوسات کا اظہار کیا جاتا ہے۔مصوری، سنگ تراشی، شاعری، افسانہ نویسی اور موسیقی کی طرح کردارنگاری کو بھی فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا ہے۔گو بعض مفکر اس میں اختلاف بھی رکھتے ہیں مثال کے طور پر تمام لوگ جو روس کے مشہور معلم اخلاق مصنف ٹالسٹائی کے مدرسہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں، اسٹیج اور اسکرین کو آرٹ کی شاخ تسلیم کرنے سے یکسر منکر ہوں گے فنون لطیفہ کے متعلق ٹالسٹائی کا نظریہ قریب قریب ہر مفکر کے نظریئے سے جداگانہ ہے۔وہ غایب درجہ حقیقت پسند تھا اور چونکہ اسٹیج پر اسکرین پر حقیقت بہ کم نظر آتی ہے اس لیے اس

کے نظریئے کے مطابق فلم اور اسٹیج پر کھیلے ہوئے ناٹک آرٹ سے بہت دور ہیں۔

اپنا اپنا خیال ہے۔۔۔۔کردار نگاری کا فن افسانہ گوئی کی طرح ہبوط آدم سے چلا آ رہا ہے۔ دوسرے کے دل پر بیتے ہوئے واقعات بیان کرنا اور کسی دوسرے قلب کی گہرائیوں کا اظہار کرنا کردار نگاری ہے۔ جب آپ کا چھوٹا بھائی یا کمسن بچہ رات کو سوتے وقت آپ کو بتاتا ہے کہ کس طرح اس کی دادی ماں چوہے سے ڈر کر غسل خانے میں چھپ گئیں اور مارے خوف کے ان کا سارا جسم کانپنے لگا تو اس وقت دراصل وہ ایک ایکٹر کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ اگر اس بچے کی قوت بیان کمزور نہیں اور وہ آپ پر اپنی دادی اماں پر بیتے ہوئے واقعات کو اس طرح بیان کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ آپ اپنے سامنے ایک تصویر سی دیکھنے لگتے ہیں اور آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ واقعی کی آنکھوں کے سامنے بچے کی دادی اماں فرط خوف سے تھر تھر کانپ رہی ہیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ بچہ ایک کامیاب ایکٹر ہے اور اس اظہار میں تعدیہ بدرجہ اتم موجود ہے۔

فلموں میں یہی چیز بڑے پیانے پر ہوتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں آپ کے چھوٹے بھائی یا کم سن بچے نے صرف اپنے دل کی خواہش کی بناء پر اپنی دادی اماں کی کیفیت بیان کی تھی اور یہاں کئی بچے، جوان، بوڑھے، عورتیں اور مرد جمع ہو کر ایک کہانی سن کر کسی کے کہنے پر آپ لوگوں کو سنا دیتے ہیں یہ فرق بظاہر معمولی ہے مگر چونکہ آپ کو بہت سی اندرونی باتیں معلوم نہیں اس لیے آپ نہیں جانتے کہ جب آپ کا بچہ یا بھائی اپنی دادی کی داستان سنا رہا تھا تو اس امر کے لیے کسی اور شخص نے اکسایا نہیں تھا یہ اکساہٹ خود بخود اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی اس

کے برعکس فلم بنانے سے پہلے ہر ایکٹر کے ہاتھ میں اس کا پارٹ دے دیا جاتا ہے اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس کو بطریق احسن نبھائے گا۔

ایک بات اور۔۔۔۔۔۔ بچہ جب اپنی کہانی سنا رہا تھا تو اس وقت اس کے پاس کوئی ہدایت دینے والا موجود نہیں تھا لیکن جب ایکٹر کسی افسانوی کردار کے جذبات کا چربہ اتارنے لگتے ہیں تو ان کے پاس ایک سے زیادہ ہدایت دینے والے موجود ہوتے ہیں جو اپنے خیال کے مطابق ان سے کام لیتے ہیں بچے نے جب کہانی سنائی تھی تو اس کی گفتگو اور اس کی جسمانی حرکات کے تسلسل میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی مگر یہاں کیمرے کے زاویے تبدیل کیے جاتے ہیں روشنی میں کمی یا زیادتی کی جاتی ہے اور پھر ایکٹر کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اسے ایک خاص حد تک رہ کر اپنا کام کرنا پڑتا ہے اسے جذبات نگاری کے دوران میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھنا پڑتے ہیں۔

1 اگر وہ مقررہ جگہ سے ایک انچ بھی ادھر سرک گیا تو کیمرے کی زد سے باہر ہو جائے گا۔

2 اگر اس نے منہ ادھر کو موڑ لیا تو کیمرہ مین اس کی ایکٹنگ کی تصویر میں وہ بات پیدا نہ کر سکے گا جو اس کے دماغ میں ہے

3 اگر اس نے مدھم آواز میں مکالمے کی ادائیگی کی تو اس کی صدا بندی نہ ہو سکے گی۔

اسی قسم کی اور بہت سی مشکلات ایکٹر کے سامنے حائل رہتی ہیں بہر حال کہنا یہ ہے کہ فلموں کے لیے ایکٹنگ یا کردار نگاری بہت مشکل کام ہے اور اس کے لیے

ایک مخصوص ذہن اور جسم کی ضرورت ہے ہالی وڈ میں جو صنعت فلم سازی کا باوا آدم ہے، کردار نگاری کے لیے بڑی چھان بین اور جستجو کے بعد ایسے آدمی تلاش کیے جاتے ہیں جو اپنے اندر ایک اعلیٰ کریکٹر کی اہلیتیں اور خوبیاں پنہاں رکھتے ہوں۔

اسٹار بنانے کے لیے جو کاوش ہالی وڈ کے پروڈیوسر کرتے ہیں اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ قریب قریب ہر کمپنی کے چند کارکن مختلف ممالک کی سیاحت میں مصروف رہتے ہیں اس طرح چل پھر کر وہ اپنے نگار خانوں کے لیے تازہ دم ایکٹر فراہم کرتے ہیں پھر ان کی تعلیم پر بے اندازہ روپیہ صرف کیا جاتا ہے اور جب وہ پردے پر لائے جاتے ہیں تو ایک ہی رات میں ان کی شہرت اکناف عالم میں پھیل جاتی ہے۔

ہندوستان میں جب صنعت فلم سازی کا آغاز ہوا تو میراثی، ربابی، طبلچی اور سارنگئے بطور ایکٹر اور بھنگنیں اور طوائفیں بطور ایکٹرسیں بھرتی کی گئیں اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی اس معیار میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ جس مرد کی آواز اچھی ہو اور وہ بازاری قسم کے گانے سریلی آواز میں گا لیتا ہو، اسے کامیاب ایکٹر متصور کر لیا جاتا ہے اور اس کو اسٹار بنا کر سال میں چھ چھ فلم تیار کر دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح عورت میں صرف حسن کو ایکٹنگ کے فن کا بہترین مظہر قرار دیا جاتا ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

ہمارے ملک میں صنعت فلم سازی کی بنیاد چونکہ غلط اصولوں پر رکھی گئی ہے اس لیے ایکٹنگ کا فن قریب قریب مفقود ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے یہاں اچھے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی کمی ہے ہندوستان میں یقیناً ایسے افراد موجود

ہیں جو مواقع بہم پہنچانے پر اپنے آپ کو اس فن کے استاد ثابت کر سکتے ہیں مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ ایسا کیا ہی نہیں جاتا۔

فلموں کا سادھو

اگر آپ فلموں کو غور سے دیکھنے کے عادی نہیں ہیں تو بھی آپ نے اپنے **ملک** کے فلموں میں ایک چیز ضروری نوٹ کی ہوگی جو بار بار دکھائی دیتی ہے۔ میری مراد اس فقیر یا سادھو سے ہے جسے ہمارے ڈائریکٹر کہیں نہ کہیں گوایا کرتے ہیں۔ منظر نامے میں یہ لکھا ہے کہ ہیروئن اداس بیٹھی ہے اور ڈائریکٹر صاحب کو یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ اداس ہے غمگین ہے اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے چونکہ کریکٹر کی ساری ذمہ داریاں اس کے سر پر ہیں اس لیے لازمی طور پر انہیں ایسی فضاء پیدا کرنی چاہیے جس سے تماشائیوں پر یہ واضح ہو جائے کہ ہیروئن اداس بیٹھی ہے۔۔۔

اداس!۔۔۔۔۔ڈائریکٹر صاحب سوچتے ہیں، تخیل کی کتاب کے سارے ورق پلٹتے ہیں اور اچانک ان کے دماغ میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے، نہایت ہی اچھوتا خیال وہ سوچتے ہیں ”کیوں نہ بازار سے یا ساتھ والے باغ سے کوئی سادھو پر درد گیت چمٹے پر گاتا ہوا گزرے۔ سادھو فلاں **فلم** میں آ چکا ہے مگر کیا ہوا۔۔۔ یہ سادھو نہ ہوگا، کوئی بھیک مانگنے والا ہوگا اور کیا بھکاری گا کر بھیک نہیں مانگتے۔ ان کے گیت بھی تو اکثر اوقات دردناک ہوتے ہیں اور کیا ان کے چہرے اداس نہیں ہوتے؟۔۔۔۔۔ یہ ٹھیک حقیقت پر مبنی ہوگا۔۔۔۔ یہ ٹھیک!“

ڈائریکٹر صاحب نے اپنا سر ہلا کر چٹکی بجائی اور ایک بھیک منگا گیت سمیت

تیار ہو گیا۔ اسٹوڈیو میں ایک آدھ گویا عام طور پر اسٹاک میں ضرور ہوتا ہے جسے جہاں چاہیں گوا دیا جاتا ہے اس کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیوں گاتا ہے اور کس لیے گاتا ہے وہ گانے کی ایک مشین ہے جس کو صرف چابی کی ضرورت ہے اور یہ چابی ہمارے ڈائریکٹر صاحب کے پاس محفوظ ہوتی ہے۔

میں ایک ایسے گویئے کو جانتا ہوں جو اسٹوڈیو کے ہر درخت کے نیچے ایک نہیں درجنوں گیت گا چکا ہے۔ سمندر کے پار دریا کے کنارے، گاڑی میں پیدل اور چل پھر کر اس بے چارے نے خدا معلوم کتنے گیت گائے ہیں کبھی اس کے چہرے پر داڑھی تھی، دو بالشت لمبی، کبھی اس کے سر پر چٹیاں تھیں یہ بڑی بڑی، کبھی اس کے ہاتھ میں کشکول تھا اور کبھی چمٹا کبھی اس کے بدن پر راکھ تھی اور کبھی پھٹے پرانے چیتھڑے۔

اس قسم کے سکہ بند گویئے کو ڈائریکٹر صاحب نے میک اپ ایکسپرٹ کے حوالے کیا۔ جس نے اس کے بدن پر سالہا سال کے پرانے اور بدبودار چیتھڑے چپکا دیئے۔ چہرے پر میک اپ کا روغن مل کر بڑھاپا پیدا کرنے کی خاطر چند ٹیڑھی بنگی لکیریں کھینچ دیں اور اسے آئینہ دکھلا کر سیٹ پر بھیج دیا گیت کی ریہرسل ہوئی۔ ستار کے تار کی آواز بلند ہوئی اور ہمارے اس گویئے کو کیمرے نے نگل لیا اور جب پروجیکٹر نے اس کو پردے پر اگلا تو ہم نے دیکھا کہ ہیروئن صوفے پر بیٹھی ہے۔۔۔۔ لانگ شارٹ کے بعد اس کا یہ بڑا کلوز اپ آیا ہیروئن نے اپنی آنکھوں سے گوہر کی طرح کے ڈھائی آنسو بہائے۔ دفعتاً طبلے کی تھاپ سنائی دی اور کسی کے گانے کی دردبھری آواز بلند ہوئی۔

"دل ناصبور اداس ہے۔۔۔۔۔۔

مجھے تیرے درس کی پیاس ہے

دل ناصبور۔۔۔ اداس ہے"

ہیروئن نے دو آنسو اور بڑی مشکل سے نکالے کٹ ہوا اور ہمیں ایک بازار میں وہی مصیبت کا مارا ہوا گویا بھکاری کے لباس میں راستہ ٹٹولتا اور گاتا دکھائی دیا۔

یہ گیت ساڑھے سات منٹ تک جاری رہا۔ اس دوران میں کبھی ہم نے ہیروئن کو آہیں بھرنے کی ناکام کوشش کرتے دیکھا اور کبھی اس بھکاری کو بے سری تانیں نکالتے ہوئے۔ جب گیت ختم ہوا تو ہیروئن کا باپ، جو دروازے کی اوٹ میں کھڑا یہ سب کچھ سن رہا تھا، اندر آیا اور کہنے لگا "بیٹا تجھے کیا دکھ ہے؟"

میں پوچھتا ہوں آخر یہ کیا حماقت ہے؟ کیا ہم جب اداس ہوتے ہیں تو ہماری اداسی کی خبر شہر کے بھکاری دوسروں تک پہنچایا کرتے ہیں؟ ایک دو مرتبہ ایسا ہو سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ چھ سات ڈائریکٹروں کو اس قسم کا "خون" معاف کر سکتے ہیں مگر ہمارے ذوق کی رگیں یقیناً ایسے جھٹکوں کو مسلسل برداشت نہیں کر سکتیں۔ فلموں میں گویئے سادھو اور بھکاری دیکھ دیکھ کر ہم بیزار ہو گئے ہیں۔

میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ آج سے چار یا پانچ سال قبل جب میں ہندوستانی فلم دیکھنے کا عادی نہ تھا۔ مجھے سادھوؤں اور بھکاریوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ مگر اب یہ حالت ہے کہ جب کبھی کسی سادھو یا بھکاری کو سڑک پر دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے فلموں کا گویا سادھو یاد آ جاتا ہے اور مجھے نفرت سے منہ پھیر لینا پڑتا ہے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، ہمارے فلموں میں اس سادھو مہاراج کی ضرورت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے ڈائریکٹروں کے ذہن اتنے عقیم ہیں کہ وہ کوئی دوسرا راستہ، کوئی نیا اسلوب پیدا نہیں کرسکتے۔ فلم میں جہاں کہیں ان کے دماغ تصویروں کے ذریعے سے افسانہ سنانے سے انکار کردیتے ہیں، وہ اس سادھو کو بلا کر گوا دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ایک ہی پتھر سے دو شکار کر لئے ہیں۔۔۔۔ ایک گیت بھی پیش ہوگیا اور افسانے کا ایک پہلو بھی واضح ہوگیا۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے سینمائی اصولوں کے پیش نظر یہ بہت بڑی غلطی ہے اس لیے کہ تماشائیوں کی توجہ افسانے کے تسلسل سے ہٹ کر اس سادھو کی طرف چلی جاتی ہے، جس کا افسانے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ چند منٹوں کے لیے پردے پر آتا ہے اور گا کر چلا جاتا ہے اور افسانہ ایک جگہ کھڑا ہو کر رہ جاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہاں کسی ایسے فلم نے ضرور غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے جس میں اس قسم کا ایک سادھو گایا ہے اور ہمارے پروڈیوسروں نے فلموں کی مقبولیت اور کامیابی کا راز یہ سمجھ لیا ہے کہ ان میں سادھو اپنے گیت سمیت ضرور ہونا چاہیے، کتنی بڑی حماقت ہے۔ ممکن ہے کہ اس سادھو نے بڑا اچھا گایا ہو مگر یہ ضروری نہیں کہ اس فلم کی کامیابی کا سارا دارومدار اسی پر اور اس کے گیت پر ہو۔ اس کے دوسرے محاسن چھوڑ کر صرف ایک اچھی چیز لے لینا جو صرف اسی میں اچھی دکھائی دے سکتی تھی، ہمارے ڈائریکٹروں اور پروڈیوسروں کے دماغی افلاس کا مظہر ہے۔

کور ذوق پروڈیوسروں کو تو برطرف رکھئے ہمارے یہاں کے اچھے اچھے با

سلیقہ فلم ساز بھی اپنے فلموں میں اس سادھو کو پیش کر رہے ہیں۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس سادھو کی آہستہ آہستہ باکس آفس پر قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کی اہمیت ان لوگوں نے اور بھی زیادہ کر دی ہے حالانکہ اگر یہ چاہیں تو چشم زدن میں یہ بدعت جو سارے فلموں پر ایک بدنما دھبے کی صورت اختیار کر گئی ہے، دور ہو سکتی ہے۔ یہ سادھو ان لوگوں ہی کی تخلیق ہے اور یہی لوگ اسے کفنا کر کسی گہری قبر میں دفن کر سکتے ہیں۔

وہ لوگ جو ذوق صحیح کے مالک ہیں، ان سادھوؤں سے تنگ آ گئے ہیں۔ گذشتہ برس ہمارے پروڈیوسروں نے درجنوں کے حساب سے ایسے سادھو پردے پر پیش کر چکے ہیں۔

آئندہ جو فلم پیش کیے جائیں، ان سے پاک ہوں۔

فلموں کے ولن

ہمارے فلموں پر ایک پرانے امریکی فلموں کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ اب بھی جب کہ ہندوستانی صنعت فلم سازی اپنا جشن سیمیں منانے والی ہے، ہم ان میں وہ چیزیں جواب یعنی جدید خیالات و رجحانات کے اس دور میں عجیب و غریب اور نامانوس معلوم ہوتی ہیں، دیکھتے ہیں۔ صنعت فلم سازی کے آغاز میں جو خطوط یورپ میں اختیار کیے گئے تھے، ہم آج بھی انہیں ہندوستانی سیلولائیڈ پر دیکھ رہے ہیں جس سے ہماری طبیعتوں کے جمود کا پتہ چل سکتا ہے۔ اب تک جس قدر فلم ہمارے یہاں تیار ہوئے ہیں، ان میں اکثر ایسے ہیں جو کولہو کے بیل معلوم ہوتے ہیں۔ ان سب کا محور ایک ہی ہے راقم الحروف کو بیشتر اوقات ایسے کئی فلم دیکھنے کا

اتفاق ہوا ہے کہ اگر ان کے کیریکٹروں کے نام بدل دیئے جائیں تو ان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ ایک ہی افسانہ، ایک ہی مطلب اور ایک ہی تیکنیک، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو تین شخص ایک ہی قطار میں کھڑے ہو کر ایک کہانی بیان کر رہے ہیں۔ یہ یکسانیت، یہ یک آہنگی بالخصوص جدت پسند طبیعتوں پر ایک نہایت ہی ناگوار بوجھ ڈالتی ہے جس کو دور کرنا ازبس لازم ہے۔

شروع شروع میں فلمی افسانے تین اہم کرداروں پر استوار کئے جاتے تھے۔ ہیرو، ہیروئن اور ولن یہ بدعت ابھی تک جاری ہے پردے پر ابھی تک یہ تثلیث چپکی ہوئی ہے ہوش مند سے ہوش مند پروڈیوسر فلم بنانے پر ہیرو کے ساتھ ہیروئن اور پھر ان کے جلو میں ولن ضروری ہوگا اس میں کوئی شک نہیں کہ شیرینی کے ساتھ تلخی بھی ہونی چاہیے اور روشنی کے ساتھ سائے بھی دکھانے چاہئیں پر اس کا سلیقہ ہونا چاہیے۔

میں ہیروئن اور ولن کے وجود پر معترض نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ افسانے کے اہم جزئیات ہیں۔ پر مجھے ایسے ہیرو، ایسے ولن اور ایسی ہیروئن دیکھنے سے سخت نفرت ہے جن کے ماتھوں پر پہلے ہی سے لیبل لگا دیئے گئے ہوں اور ان کو علیحدہ علیحدہ کر کے بتایا گیا ہو۔ میں ادب اور فلم کو ایک ایسا خانہ سمجھتا ہوں جس کی بوتلوں پر کوئی لیبل نہیں ہوتا۔ جو لطف، انکشاف اور دریافت میں ہے۔ دوسروں کو فوراً بتا دینے میں نہیں ہے۔ میں ساری بوتلوں میں سے ایک ایک گھونٹ پی کر خود فیصلہ کرنے کا اختیار چاہتا ہوں کہ ان میں سے کون سی دو آتشہ ہے۔ اگر مجھ سے یہ اختیار چھین لیا گیا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ میرے مذاق کے تمام دروازوں پر

تالے جڑ دیئے گئے ہیں، جن کی کنجیاں میرے پاس نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔۔!

پھر میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ ہمارے سب افسانوں کا ہیرو ایک ہی قسم کا ہو۔خوبصورت شکیل، نوجوان، بہادر، رحم دل وغیرہ وغیرہ جو شروع سے لے کر آخر تک لڑتا رہے۔اس کی تلوار میں ایسی طاقت ہو کہ بڑے بڑے جغادریوں کے گلے کاٹ کر رکھ دے۔پر دوسروں کی تلواریں اس کے گلے پر چل ہی نہ سکیں۔ اس کا پریم اس کی محبت سچی ہو اور بے چارے ولن کا عشق بالکل جھوٹا ہو۔ایسے ہیرو میرے قیاس سے بہت بالاتر ہیں۔میں پردے پر جب اس قسم کے لوگ دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک بہت بڑی گپ سن رہا ہوں۔میری طبیعت ایسی حقیقت سے بعید چیزوں کو قبول ہی نہیں کر سکتی۔

میری نظروں میں ہیرو وہی ہے جسے میرا دل قبول کر لے جس کے لیے میرے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں ہمدردی پیدا ہو۔جس کے دل کی دھڑکنیں ایک بار میرے دل کی دھڑکنوں میں گھل مل جائیں۔میرا ہیرو وہ ہے جو انسان ہو انسانیت کا صحیح نمونہ، برائیوں اور اچھائیوں سمیت۔میرا ہیرو فرشتہ نہیں ہے اس لیے کہ میں زمین پر رہتا ہوں۔میرا طائرِ فکر آسمان کی انتہائی بلندیوں پر پرواز کرے گا لیکن تمام وقت اس کی نگاہیں اپنے آشیانے پر جمی رہیں گی جو مٹی کی گود میں ہے۔وہ ستاروں کی تابانی کی طرف بڑھے گا مگر صرف اس لیے کہ وہ ان کو نوچ کر زمین کے ننگے سینے میں جڑ دے۔مجھے بے کاخ و کو دنیا کے فرشتوں سے نفرت نہیں ہے مگر اپنے بھائی انسانوں سے زیادہ محبت ہے جو اس رنگ و بو کی دنیا میں رہتے ہیں۔

اپنے یہاں کے فلموں میں نیکو کار اور فرشتہ ہیروں کو دیکھ دیکھ کر مجھے بعض اوقات سخت تعجب ہوتا ہے اور میں ان کو ایک ایسی دنیا کے باشندے سمجھنے لگتا ہوں جو میری حد نظر سے بہت دور ہے۔ اور جب میں ان کے ساتھ ساتھ ولن دیکھتا ہوں تو میرا تعجب اور بھی بڑھ جاتا ہے یہ مخلوق بھی مجھے اس دنیا کی معلوم نہیں ہوتی۔

ہمارے فلمی افسانوں میں جس قدر کیریکٹر بھی پیش کیے جاتے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ صرف ایک افسانہ بنانے کی خاطر مٹی کے ان ٹیلوں کو جو چاہے شکل دے دی جاتی ہے۔ اور ہیروئن اور ولن کے مختلف لیبل لگا دیئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات عورت کو اس طور پر پینٹ کیا جاتا ہے کہ وہ آسمانی حور معلوم ہوتی ہے اور بعض اوقات اس کی تصویر کو اس قدر تاریک بنا دیا جاتا ہے کہ وہ چڑیل اور ڈائن معلوم ہوتی ہے عورت جیسی کہ یہ ہے بہت کم افسانہ نگاروں کے تخیل میں ہے۔ اس کی وجہ اس کی حقیقت کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے یہاں عورت اور مرد کے درمیان ایک زمانے سے موٹا پردہ حائل ہے۔ ہمارے افسانوی ادب میں جن عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے اسی فی صدی ایسی ہیں جو حقیقت سے کوسوں دور ہیں۔ ان میں اور اصل عورتوں میں وہی فرق ہے، جو ٹکسالی روپے اور جعلی روپے میں ہوتا ہے۔ دونوں کا وزن برابر ہو سکتا ہے۔ بادی النظر میں دونوں ایک جیسے ایک شکل کے معلوم ہوتے ہیں پر وہ کھنکھناہٹ جو ٹکسالی روپے میں ہوتی ہے، اس روپے میں نہیں ہوتی۔ ہمارے ان افسانوں کی یہ عورتیں عورتیں ہوتی ہیں مگر ان میں وہ عورت پن نہیں ہوتا۔ جو عورت کو صحیح عورت بناتا ہے۔

انسانوں میں بے شمار سیاہ کار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں اس دنیا میں لاکھوں بلکہ کروڑوں ایسے لوگ موجود ہیں جو بے رحم قصائیوں سے کہیں زیادہ بے رحم اور ظالم ہیں پست سے پست ذہنیت کے لوگ موجود ہیں اس دنیا میں گناہ گاروں کی بھی کمی نہیں پر جو گناہ گار، جو سیاہ کار، جو ظالم ہم پردے پر ولن کی شکل میں دیکھتے ہیں، کم ازکم میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ یہ لوگ مجھے ایسے اذہان کی تخلیق معلوم ہوتے ہیں جو گناہ اور ثواب، سزا اور جزا، ظلم اور رحم میں تمیز ہی نہیں کر سکتے۔ ایک اور بات جوان پر ایک قسم کا رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔ وہ خوف کھانے لگتے ہیں اگر انہیں اپنے کردار سے کوئی گناہ کرانا ہو تو وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں گویا وہ خود کوئی گناہ کر رہے ہیں۔

یہ جھجک یہ کرنے اور نہ کرنے کی درمیانی چیز جب ہم پردے پر دیکھتے ہیں تو افسانہ نگار صاحب کا ولن ہمیں ایک نامکمل سا کھلونا نظر آتا ہے۔ پردے پر کرداروں کی بھاگ دوڑ کے علاوہ ہم افسانہ نگار کا ذہن بھی دیکھتے ہیں۔ چنانچہ جب متذکرہ صدر قسم کے کریکٹر ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہیں تو ہمیں ان کے بنانے والے کا دماغ بھی ساتھ ساتھ نظر آتا ہے۔ جو ایک ایسی کل ایک ایسی مشین معلوم ہوتا ہے جس کے پرزے صرف پرانی رسموں، پرانے عقیدوں اور کہنہ خیالات کے گاڑھے تیل کے بغیر چلتے ہی نہیں۔ یہ تیل جس کو کولہو میں پیڑا گیا تھا، اب اس کا وجود بھی باقی نہیں۔ کیا اب نئی چکناہٹ تلاش نہ کرنا چاہیے۔

ہمارے افسانہ نگاروں کی سب سے مضحکہ خیز تخلیق ولن ہے جس کی ساری عمر

گناہ میں بسر کرائی جاتی ہے اور آخر میں اسے نیکی کے سمندر میں غوطہ دے دیا جاتا ہے تاکہ ہمارے فاضل افسانہ نگار کا اخلاقی پہلو تنقید سے بچا رہے۔ ان کے پیش نظر اپنے کردار کے تشخص کے بجائے اپنا تشخص رہتا ہے۔ اگر ان کا کوئی کریکٹر برا کام کرے تو وہ سمجھتے ہیں کہ خود ان سے کوئی بری حرکت سرزد ہو گئی ہے چنانچہ ہم ان کے افسانوں سے محسوس کر سکتے ہیں کہ انہوں نے اسے چھپانے کی کوشش بھی کی تھی اسی طرح اگر ان کے کریکٹر سے کوئی اچھا کام ہو جائے تو وہ یہ سمجھتے ہیں خود انہوں نے کوئی اچھا کام کیا ہے چنانچہ ان کی مسرت ہمیں ان کے کریکٹر کے چہرے پر نظر آ سکتی ہے اس قسم کا بچپن، اس قسم کی سستی جذباتی کیفیت اعلیٰ درجے کے ادب میں نہیں آنا چاہیے۔

افسانے کی بساط شطرنج کی بساط نہیں، جس پر صرف مقررہ مہرے چلتے ہیں۔ افسانے کی بساط اس وسیع دنیا کی بساط ہے جس پر ان گنت مہرے چل رہے ہیں۔ افسانے، ہیرو، سائیڈ ہیرو، ہیروئن، سائیڈ ہیروئن، ولن، سائیڈ ولن و ہیمپ اور سائیڈ و ہیمپ کے بغیر بھی۔۔۔ افسانے ہو سکتے ہیں پر ذرا سمجھ کی ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆

زندگی

(اسی نام کے ایک فلم پر ریویو)

بلوری چوڑیوں نے کھنکھناہٹ سے پوچھا ''میں خوبصورت ہوں کہ تو ؟''عود کا دھواں آگ کے بستر سے پریشان ہو کر اٹھا۔

ہوا میں سانپ کی طرح اس نے بل کھا کر کہا ''تو میرے سینے کا راز ہے یا میں؟'' فرشتے آسمان کی ہلکی پھلکی فضاؤں میں پر تول کر رہ گئے۔

ابر بہار نے خزاں کی مٹھی کھولی اور بلند درختوں سے سرگوشیاں شروع کر دیں

طلوع آفتاب کی آڑھی ترچھی کرنوں کے شور سے اندھیارا گھبرا کے اٹھا اور بھاگ گیا۔

☆☆☆☆☆

گاگر نے چھلکتے ہوئے پانی سے کہا ''تو اتنا بے صبر کیوں ہے؟''

گھونگھٹ کے نیچے ایک کنوارے چہرے پر نہ معلوم کتنے رنگ آئے اور چلے گئے۔سوسن کے پھولوں میں شہد کی بھوری مکھیاں پڑی اونگھتی رہیں۔

آس شبنم کی بوندوں کی مانند اس کے دل پر ٹپک رہی تھی۔دروازے نے ہولے سے آہ بھری اور دہلیز کے ساتھ بغل گیر ہو گیا، تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں پر ایک کپکپی منجمد ہوتے ہوتے رہ گئی۔

یہ نثر کی شاعری کا ایک نہایت ہی لطیف نمونہ ہے۔ چند سطروں میں زندگی کا تمام رس نچوڑ کر بھر دیا گیا ہے۔ پہلی سطور میں تصوف کا رنگ ہے بلوری چوڑیوں کا اپنی کھنکھناہٹ سے پوچھنا ''میں خوبصورت ہوں کہ تو؟'' کتنا اچھوتا خیال ہے اور تصوف کے چہرے پر سے یہ نقاب کو کس دلکش انداز سے اٹھاتا ہے۔ شاعر کا سینہ قدرت کی رنگینیوں سے معمور ہے۔ وہ فرشتوں تک پہنچتا ہے مگر فوراً ہی زمین پر ابر بہار اور بلند درختوں کی سرگوشیاں سننے کے لیے دوڑ آتا ہے۔ نیچریت کا ایسا اچھا نمونہ ہندوستانی شاعری میں ملنا محال ہے اور ان کی قید سے آزاد یہ منثور نظم دیہاتوں میں چلنے والی ہوا کی مانند ہلکی پھلکی اور معطر ہے۔ اس میں زندگی ہے اور اس زندگی کے اندر حرکت ہے، ایک لطیف حرکت، ایک پیارا ارتعاش ہے جو کنواری لڑکیوں کے جسم پر طاری ہوا کرتا ہے۔

الفاظ کی نشست، برخواست بہت اچھی ہے۔ موزونیت بھی نہایت عمدہ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم منثور کے مصنف نے دلہن کی ساڑھی میں تارے بڑی احتیاط سے ٹانکے ہیں۔ ہر ایک لفظ چمکتا ہے لیکن یہ چمک خیرہ کن نہیں آنکھوں کو کھلتی نہیں۔ بہت پیاری معلوم ہوتی ہے۔

اس نظم پر اسی طرح اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے ہر ایک لفظ کے کئی کئی معنی نکالے جاسکتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم منثور محض دماغی عیاشی ہے۔ لکھتے وقت اس کے مصنف کے پیش نظر صرف یہ بات تھی کہ لفظ خوبصورت ہوں اور ان کی ترتیب بھی سندر ہو مگر مطلب کچھ نہ ہو۔ چنانچہ یہ نظم پڑھنے کے بعد مزا تو آجائے گا مگر مطلب ہرگز ہرگز سمجھ میں نہیں آئے گا کیوں کہ یہ اس غرض سے لکھی ہی نہیں

گئی۔

یہ نظم میں نے لکھی ہے اور اس پر صرف دو منٹ صرف کیے ہیں۔

ہندوستانی ادب میں اب ایسی نظموں کا فیشن عام ہو گیا ہے یورپ کا لٹریچر چونکہ بہت وزنی ہو چکا تھا اس لیے لوگوں نے اس قسم کی ہلکی پھلکی منشور شاعری کی طرف توجہ دی اور یورپ کا قاری جو کہ بوجھ افکار سے تنگ آ چکا تھا، ایسی نظموں کا دلدادہ ہو گیا چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپی لٹریچر میں یہ ''ادب لطیف'' داخل ہو گیا۔ ہندوستان چونکہ تقلید کا شروع سے عادی ہے اس لیے اس کے ادب نے اس نئی قسم کی شاعری کو قبول کر لیا چنانچہ آج ہم پردۂ سیمیں پر نیو تھیٹرز کا فلم زندگی دیکھتے ہیں جو اس قسم کے ادب لطیف کا ایک ٹکڑا ہے۔

خواجہ عباس صاحب اور جلیل انصاری صاحب کہتے ہیں کہ زندگی بہت اچھا فلم ہے اس لیے میں بھی کہتا ہوں یہ فلم بہت اچھا ہے مگر میں ''زندگی'' دیکھنے گیا تھا زندگی میرا خیال ہے جمیل انصاری صاحب اس کا مطلب بخوبی سمجھتے ہوں گے۔ ہال میں اندھیرا ہوا اور زندگی شروع ہوئی تو مجھے اس کی رفتار دیکھ کر محسوس ہوا کہ شراب خانے میں ویٹر نے تیز و تند شراب کی بجائے غلطی سے میرے ہاتھ میں سکنجبین کا گلاس تھما دیا ہے۔ اب میں نہ اسے واپس کر سکتا ہوں اور نہ پھینک سکتا ہوں چونکہ یہ ہماری زندگی کے ادب کے منافی ہے۔ چنانچہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک میں کھٹے میٹھے شربت کو آہستہ آہستہ پیتا رہا۔ کھٹ میٹھا شربت اگر اس میں کافی برف ڈالی ہو، بدذائقہ نہیں ہوتا۔

زندگی اچھا فلم ہے اس لیے کہ اس میں زندگی کے سوا سب کچھ ہے اس میں

کھوٹی دونی تھی جو صرف بروا ہی چلا سکتا ہے۔ اس میں گیت تھے جو صرف سہگل ہی گا سکتا تھا۔ اس میں مکالمے تھے جو صرف جمنا ہی ادا کر سکتی تھی۔ اس میں مدہوشی تھی جو پہاڑی کی ہوشمندی پر غالب نہ آ سکی۔ اس میں فلسفہ تھا جو جمیل انصاری صاحب نے سمجھ لیا اور اس میں موم بتی بجھنے کا ٹچ تھا جو فنی لحاظ سے بہت ہی بلند ہوا اور جسے خواجہ عباس صاحب نے بھی بہت پسند کیا اور ان سب کے اوپر اس میں ٹیلی پیتھی ہے جو میاں کاردار صاحب کو بہت پسند ہے اور جو فلم میں باکس آفس ویلیو پیدا کرتی ہے!

زندگی اچھا فلم ہے اس لیے کہ اسے ڈائریکٹر بروا نے تیار کیا ہے اور نیو تھیٹرز نے پیش کیا ہے اس میں سہگل اور جمنا ہیں۔

پشاور سے بمبئی تک کئی ریل گاڑیاں چلتی ہیں۔ ان میں کچھ تیز رفتار ہیں اور کچھ سست رفتار۔ اگر آپ بمبئی سے پشاور پہنچنا چاہتے ہیں خواہ دس پندرہ دن صرف ہو جائیں تو آپ کو ''زندگی'' بہت پسند آئے گی یہ ایک ایسا ٹھہرا ہوا پانی ہے جس میں کبھی کبھی درخت کا کوئی پتہ گرنے سے بھنور پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی سڑک ہے جس میں کوئی موڑ نہیں آتا جو کہ سیدھی چلی گئی ہے موت کے دھانے تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا مصنف اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنی کھینچی ہوئی لکیر پر ہولے ہولے چل رہا ہے اور آخر میں دھڑام ایک گہری کھائی میں گر پڑتا ہے۔

زندگی۔۔۔۔ زندگی کی شکایت ہے موت سے ایسا معلوم ہے کہ زندگی گھٹنے ٹیک کر موت کے دامن سے آنسو پونچھ رہی ہے ''زندگی''۔۔۔ ایک ایسی زندگی

ہے جو کبھی زندگی تھی ایسے انسانوں کو جو میکسم گورکی کے لفظوں میں کبھی انسان تھے یہ فلم زندگی کی ارتھی ہے جو ہم بروا کے ناتواں کاندھوں پر دیکھتے ہیں اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مردہ چیز کا وزن بہت زیادہ ہو جایا کرتا ہے فلم کے کئی حصوں میں آپ محسوس کریں گے کہ بروا اس بوجھ کو اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا ہے۔ اس کا دم پھول گیا ہے اور ستانے کے لیے ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گیا ہے۔

مجھے حرکت سے پیار ہے ہر تیز رو چیز کو دیکھ کر میرے اندر حرکت پیدا ہو جاتی ہے دوڑتی ہوئی موٹریں، دندناتی ہوئی ریل گاڑیاں، تیزی سے گھومتے ہوئے پنگوڑے، یہ سب مجھے پیارے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب میری نبض حیات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کو دیکھ کر میرے دل میں کوئی اکتاہٹ پیدا نہیں ہوئی۔ میری زندگی کے گھوڑے کو ایڑ نہیں لگی۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہال میں جیسا گیا تھا، ویسے کا ویسا باہر آ گیا۔ میں زندگی دیکھنے گیا تھا مجھے موت نظر آئی میں مانتا ہوں کہ زندگی کا انجام موت ہے لیکن موت میں بھی تو زندہ ہے موت مردہ تو نہیں ہوتی وہ موت جو زندگی کو اپنے کھردرے ہاتھوں میں مسل دیتی ہے جو رگ حیات کو دبا کر اس کا پھڑکنا بند کر دیتی ہے، کیسی بے جان ہو سکتی ہے۔ میرے خیال کے مطابق موت زندگی سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔ زندگی سے کہیں زیادہ زندگی سے بھرپور ہے مگر جو موت مجھے زندگی میں نظر آئی، بے جان تھی زرد بالکل زرد۔۔۔۔۔۔۔۔۔

فلم کا افسانہ ایک بے کار گریجوایٹ نوجوان اور ایک ستم رسیدہ عورت (جس کا شوہر شرابی اور بدکار ہے) کے کرداروں پر استوار کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ

نگار نے ایک دلدل پر عمارت کھڑی کی ہے جو ہر اینٹ کے دباؤ سے نیچے دبی جاتی ہے افسانے کی ہیروئن دکھی ہے اس لیے کہ اس کی شادی ایک ایسے مرد سے کر دی گئی ہے جو شرابی ہے۔ وہ اپنی استری کے حقوق کو پائمال کرتا ہے شراب پیتا ہے، اپنی دھرم پتنی کو مارتا ہے، اس کو ٹھکرا کر گھر سے نکال دیتا ہے۔ شریمتی ہیروئن گھر سے باہر نکل آتی ہے۔ یہ افسانے کی معراج قرار دی گئی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شریمتی ہیروئن نے کون سا بہادری کا کام کیا۔ جس عورت کی زندگی اجیرن تھی۔ جس کو دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا۔ اس نے اپنے پتی کا گھر بار چھوڑنے کی بہادری کیسے کی؟ وہ تو ایک بے کار شے سمجھ کر باہر پھینک دی گئی تھی خود باہر نکلنے کی اس نے ہمت نہیں کی۔

اور پھر جب وہ پتی کا گھر چھوڑ کر باہر نکلتی ہے اور رتن لعل آوارہ گرد سے ملتی ہے تو وہ چھپی کیوں بیٹھی ہے؟ اور رتن لعل کیوں پتہ کھڑکنے پر بھڑک اٹھتا تھا، رتن لعل بے کار کیوں تھا؟ ــــ میں نے اس کے حلق سے اتنے سریلے گانے سنے ہیں۔ وہ ان کی بدولت کما سکتا تھا اگر ''زندگی'' اس زمانے کی کہانی ہے تو وہ نیو تھیٹرز ہی میں بڑی آسانی کے ساتھ نوکری حاصل کر سکتا تھا۔ اچھے گانے والوں کی ہر فلم کمپنی کو ضرورت ہے۔ پھر وہ بے کار کیوں رہا سارا فلم دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ وہ بے کار رہنا چاہتا تھا یا اسے زبردستی افسانہ نگار نے بے کار رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کا کینوس افسانہ نگار نے بہت ہی محدود کر دیا ہے۔ زندگی ایک تنگنائے نہیں، چوڑا سمندر ہے جس میں بڑے بڑے جہاز میں چلتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی ــــ مگر اس فلم، میں تو رتن لعل اور شریمتی ہیروئن اپنی کشتیوں کو الٹ کر اس

کے پیندوں میں سوراخ بناتے رہے ہیں۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ''زندگی'' رتن لعل اور شریمتی کی ایک شکایت ہے سماج سے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے نہ مل سکے۔ انہیں ایک دوسرے کا وصل نصیب نہ ہو سکا لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یہ وصل ہی زندگی کا واحد نصب العین ہے؟ کیا جنسی عشق ہی زندگی کا محور ہے؟ کیا اسی محور کے اردگرد زندگی گھومتی ہے؟

شریمتی ہیروئن شادی شدہ ہے چونکہ ہندو مذہب میں طلاق نہیں ہے اس لیے وہ اپنے بے کار عاشق سے شادی نہیں کرسکتی اور بے کار با کار اس لیے نہیں بن سکتا کہ وہ شریمتی ہیروئن سے شادی نہیں کرسکتا۔ بس یہ زندگی کا پلاٹ ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ محبت بہت طاقتور ہے۔ وہ بے کاروں کو نوکری بھی دلوا سکتی ہے۔ وہ ان کے سینے میں زندہ رہنے اور کچھ کر گزرنے کی اکساہٹ بھی پیدا کرسکتی ہے مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ شریمتی ہیروئن اور شریمان ہیرو کی محبت کون سی نوعیت کی تھی۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں کہ ان کا پریم محض جنسی تھا اور سچ پوچھئے تو فی زمانہ مرد اور عورت کا پریم ہوتا ہی جنسی ہے۔ اگر ان دونوں کا پریم جنسی دائرے سے باہر ہوتا تو مجھے یقین تھا کہ رتن لعل کچھ کرتا۔ گانے کے علاوہ وہ تنازع للبقاء میں حصہ لینے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا اس لیے کہ محبت فالج کی قسم کی بیماری نہیں ہوسکتی۔

اور پھر شریمتی ہیروئن نے کیا کیا۔ وہ پڑھی لکھی ہوش مند عورت تھی، اپنے دل کو اچھی طرح سمجھتی تھی، اپنی مشکلات سے واقف تھی۔ اس میں اتنی جرأت بھی تھی کہ اپنے باپ کے گھر جانے کی بجائے ایک نامحرم مرد کے ساتھ ایک ہی کمرے میں

رات بسر کرے۔ بازاروں اور گلیوں میں اس کے ساتھ گھومتی پھرے۔ وہ اپنے حقوق کے لیے لڑسکتی تھی جیسا کہ اس کی خواہش تھی۔ نوکری تلاش کرسکتی تھی اگر وہ جرأت کرتی تو وہ اپنے عاشق کو اپنا بھی سکتی تھی لیکن اس نے کچھ بھی نہ کیا۔ وہ ڈرتی رہی کیوں؟ اس کا جواب بروا صاحب نے آخر میں دیا ہے۔ جب کہ شریمان رتن لعل کارداری انداز میں سماج کو گالیاں دیتا ہے۔

سماج کو گالیاں ضرور دی جائیں۔ اگر ہو سکے تو اس کو پھٹے ہوئے جوتوں کا ہار بھی پہنا دیا جائے۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی مگر سوال یہ ہے کہ سماج ہے کیا؟۔۔۔۔۔ کیا شریمتی ہیروئن اور شریمان ہیرو اس سماج ہی کا ایک حصہ نہیں۔

سماج اگر ایک اڑیل خچر سمجھ لیا جائے تو افسانے کا ہیرو رتن لعل اس کی دم ہے جو مکھیاں ہٹانے کی کوشش میں ہلتی رہتی ہے۔

کہتے ہیں ''زندگی'' ایک بہت بڑا سماجی فلم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں اس لیے کہ اس میں ایک بار سماج کا ذکر آیا ہے اور سماج کے اس قانون کو بھی توڑنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر شادی شدہ عورت جس کی شادی غلط مرد سے کر دی گئی ہو، کسی دوسرے مرد سے رومان لڑا سکتی ہے۔ میں اس کے حق میں ہوں مگر میں ایک باقاعدہ جنگ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کوئی چیز توڑ دی جائے یا اس کے توڑنے کی تمنا دل میں پیدا ہو تو میں آنکھوں میں آنسو اور حلق میں آہیں دیکھنے کا قائل نہیں۔ ہتھوڑا لیا جائے اور بڑھ کر اسے توڑ دیا جائے۔ چلو چھٹی ہوئی۔

شریمتی ہیروئن تو جب چاہے اس قانو کو توڑ سکتی ہے اس لیے کہ اس کے پاس دولت کا وزنی ہتھوڑا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس موقع کی تلاش میں تھی لیکن یہاں ایک

بات اور کہنا پڑتی ہے کہ زندگی میں مواقع پیدا کیے جاتے ہیں۔ خود بخود پیدا نہیں ہوتے۔

یہی وجہ ہے کہ میں ''زندگی'' کو زندگی بخش نہیں سمجھتا۔ میرے خیال میں یہ فلم ایک جنسی تھکان ہے جو بروا یا افسانہ نگار پر طاری ہے۔ اب یہ سوچنا ہے کہ اس قسم کی تھکاوٹ طاری ہونا ہی زندگی ہے؟ اس کا جواب شاید جمیل انصاری صاحب دے سکیں۔ ایک بات اور کھٹکتی ہے وہ یہ کہ شریمتی ہیوئن گھر سے باہر نکال دیئے جانے پر اپنے باپ کے گھر جانے کی بجائے شریمان ہیرو کے ساتھ چپک جاتی ہے اور جب سینمائی اتفاق سے اس کی ملاقات اپنی بہن سے ہوتی ہے اور وہ اپنے قریب المرگ باپ سے ملتی ہے تو وہ بستر مرگ پر اس کی جرأت کی داد دیتا ہے'' میں بہت خوش ہوا ہوں بیٹی کہ تو نے اپنے بدکردار پتی کا گھر چھوڑ دینے کی ہمت کی'' چنانچہ اس ہمت اور جرأت کے انعام میں وہ اپنی ساری جائیداد اس کے حوالے کر دیتا ہے وہ یہ نہیں پوچھتا کہ تم اتنے دن کہاں رہیں۔ تم نے یہاں قدم رنجہ کیسے فرمایا؟

افسانے میں ایک اور ٹکڑا بہت ہی عجیب وغریب ہے۔ یہ بتانے کے لیے کہ رتن لعل کے دل و دماغ میں شریمتی ہیروئن کا خیال سمایا ہوا ہے۔ بروا صاحب نے ایک نہایت ہی بھونڈا اپچ دیا ہے۔ رتن لعل بازار میں جا رہا ہے کہ ایک دوست سے اس کی مڈ بھیڑ ہو جاتی ہے دوست کہتا ہے ''اماں اتنے روز تم کہاں رہے؟ چلو میرے ساتھ چلو۔ آج ہم نے دعوت دی ہے تم ذرا جادو کے کھیل دکھانا'' جادو کے کھیل نہیں دکھائے جاتے کیوں کہ ان سے ڈائریکٹر کا مطلب پورا نہیں ہوسکتا

تھا۔ چنانچہ وہ آوازوں کا نقال بنتا ہے اور شریمتی ہیروئن سے بات چیت کرتا ہے میرے خیال میں یہ ٹچ بروا جیسے ڈائریکٹر کے شایانِ شان نہیں ہے۔ تکنیکی نقطہ نگاہ سے بھی یہ غایت درجہ خام ہے اور اس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈائریکٹر کہانی سناتے سناتے تماشائیوں کے کان میں یہ کہنا شروع کر دیتا ہے۔

''ناظرین! یہ یاد رکھئے گا کہ ہمارے ہیرو کے دماغ میں اس وقت ہیروئن بسی ہوئی ہے۔ ہیروئن ۔۔۔۔۔۔۔ سمجھ لیا ۔۔۔ ہیروئن؟''

مختصر الفاظ میں زندگی کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک آہ ہے جو واہ میں لپیٹ کر پیش کی گئی ہے۔ اس کا پیکنگ اچھا ہے۔ مسٹر بروا یورپ سے نمائش کاری کا یہ طریقہ شاید حال ہی میں سیکھ کر آئے ہیں اور زندگی کی دم میں نمدہ باندھنے کا کام بھی بروا صاحب نے بڑے سلیقے سے کیا ہے جس کی داد دیئے بغیر میں یہ مضمون ختم نہیں کر سکتا۔ ہندوستانیوں کی اوہام پرستی کو بروا صاحب نے بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ جس کے متعلق بعض نقادوں کا خیال ہے کہ یہ ایک بہت بڑا طنز ہے۔ مثال کے طور پر وہ مندر والا سین جو مجھے بے حد پسند ہے۔ سہگل نے گانے بہت اچھے گائے ہیں۔ ایک اپنی مرضی سے باقی ہماری مرضی سے جب کبھی جمنا نے اس سے کہا مجھے وہ گیت سناؤ تو سہگل نے انکار نہیں کیا۔ فوراً ہی بیچارے نے شروع کر دیا۔ ایسے ہیرو خاص طور پر ہیروئن کو بہت پسند ہوتے ہیں جو کبھی انکار نہ کریں۔

زندگی میں ایک کریکٹر بہت دلچسپ ہے شرابی کا جو پہاڑی صاحب نے ادا کیا ہے۔ افسانے میں اس کا کام صرف شراب پینا یا ایک کسبی سے اپنا دل بہلانا ہے۔

پہاڑی کو شرابی کے لباس میں دیکھ کر اس خشکی کے زمانے میں بھی کئی شرابیوں کو بہت غصہ آیا ہوگا اس لیے کہ وہ صحیح شرابی نہیں تھا۔

فلم میں شرابی اور آوارہ گردی کی تعریف بروا صاحب نے اچھوتے انداز میں کی ہے جو آرٹ کہلائی جا سکتی ہے۔

پس لفظ

(اس ریویو کے بعد میں نے پھر ذیل کی سطور لکھیں) میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ ''زندگی'' میں زندگی نہیں ہے۔ اس میں موت ہے اور وہ بھی بے جان موت'' زندگی'' دیکھنے کے بعد اب میں جب کبھی اس کا تصور کرتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے ربڑ کا رنگین غبارہ آ جاتا ہے، جس کی ہوا آہستہ آہستہ نکل رہی ہو'' زندگی'' ہوا بھرا غبارہ نہیں۔ ایک ایسا غبارہ ہے جس میں بہت زیادہ ہوا بھر کر اسے آہستہ آہستہ خالی کر دیا گیا ہو اور آخر میں چیچھڑا سا بن کر رہ گیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ افسانے میں سماج کے خلاف بغاوت ہے۔ ایک کمزور عورت اپنے نازک ہاتھوں سے سماج کے بندھن توڑتی ہے ''زندگی'' میں نے ان دنوں آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مجھے یہ بغاوت اور یہ جرت کہیں بھی نظر نہیں آئی بلکہ بزدلی ہی بزدلی دکھائی دی ہے۔ فلم کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک جرأت کا نام و نشان تک نہیں۔

افسانے کا آغاز شریمان رتن لعل ہیرو کے مکان سے ہوتا ہے، جس کا کرایہ ادا نہیں کیا گیا۔ مالک مکان کی آواز سن کر ہیرو ڈر کے مارے بھاگ اٹھتا ہے۔ اس کے بعد فلم میں جو منظر بھی آتا ہے اس میں آپ شریمتی ہیروئن اور شریمان ہیرو

دونوں کو دشمنوں سے بھاگتے چھپتے پائیں گے۔

میں ''زندگی'' کے افسانہ نگار سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ انہیں ڈر کس بات کا تھا؟ ان کے دشمن کون تھے؟ ان کا تعاقب کرنے کی کسی کو کیا ضرورت تھی؟ وہ اتنے اہم لوگ نہیں تھے کہ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوتے۔ پھر وہ چھپتے کیوں تھے؟ وہ ارتعاش خفی کیا تھا جو ہر وقت ہیرو اور ہیروئن پر طاری رہتا تھا؟ ذرا سی آہٹ پر ان کا دل سینے سے اچھل کر باہر آجاتا تھا، اس کی وجہ کیا تھی؟ ــــــ شاید یہ کیفیت اس جرأت نے پیدا کر دی تھی جو وہ دونوں اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یہ جرأت کس لیے پیدا کی جا رہی تھی ــــــ اس سوال کا جواب اگر عباس صاحب یا جمیل صاحب سے پوچھا جائے تو وہ ایسا ہی جواب دیں گے جیسا کہ میں ''زندگی'' اپنے موضوع سے متعلقہ سوالوں کا جواب دیتی ہے مگر مجھ سے پوچھئے، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ کیوں ہاں اور ناں کے درمیان تھے؟ کیوں وہ ایک دم بزدل اور جرأت مند تھے؟ کیوں ہر وقت ان کا ضمیر ششں وپنج کی حالت میں رہتا تھا کہ وہ ''وہ'' نہیں تھے جو کہ ہونا چاہیے تھا مرد اور عورت کے درمیان سوائے وصل کے اور چیز ہی کیا ہے۔ شریمتی ہیروئن اپنے خاوند سے بے زار تھی اس لیے کہ اس نے دھکے مار مار کے باہر نکال دیا تھا۔ وہ محبت کرنا چاہتی تھی محبت کرنے کی جسمانی طاقت اس کے دل و دماغ میں اتنی شدت اختیار کر گئی تھی کہ اس نے اس پہلے مرد سے عشق کرنا شروع کر دیا جو گھر سے باہر نکل کر اسے ملا۔

پردے پر عشق کا اظہار شریمتی ہیروئن کی طرف سے دیکھتے ہیں اور یہ ہونا چاہیے تھا اس لیے کہ وہ بھوکی تھی اور یہ بھوک یکسر جنسی تھی۔ اس نے شریمان رتن

لال کو اپنے مقفل عشق کی چابیاں دیتے وقت یہ نہیں سوچا کہ وہ کون ہے اور کیا ہے؟ وہ بس ایک مرد چاہتی تھی جس کے ساتھ وہ کئی دنوں تک گھومتی پھرتی رہی۔ ایک رات وہ اس کے گھر میں بھی سوئی۔ اتنی جرأت اس نے کی لیکن اس کو آزادانہ طور پر اپنا بنا لینے کی جرأت نہیں تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ فلم میں رونا کس بات کا رویا گیا ہے؟ جب اس کو اتنی جرأت تھی تو کیا باقی چیزوں کی تکمیل کے لیے وہ مزید جرأت نہیں کر سکتی تھی اور پھر سماج کو کیوں برا بھلا کہا گیا ہے۔ جب شریمتی ہیروئن رات کو رتن لعل کے گھر میں سونے کا ارادہ کر رہی تھی تو سماج نے کھاٹ تو نہیں الٹ دی تھی۔ جب وہ ہیرو کے ساتھ کھلے بندوں بازاروں میں چلتی پھرتی تھی تو سماج نے اس کی راہ میں کانٹے تو نہیں بچھا دیئے تھے خواجہ عباس صاحب کچھ بھی کہیں مگر یہ ظاہر ہے کہ وہ دونوں جنسی تعلقات پیدا کرنے کے لیے مضطرب تھے اور چاہتے تھے کہ ان تعلقات پر سماج کو اعتراض نہ ہو۔

اس افسانے میں یہ جنسی سوال صرف دو افراد سے متعلق ہے۔ وہ جو چاہے کرتے ان کے اعمال کا سماج کی چوڑی چھاتی پر کیا بوجھ پڑ سکتا ہے۔ کیا شرابی شوہروں کی دھتکاری ہوئی بیویاں غیر مردوں کی آغوش میں نہیں چلی جاتیں؟ ان کے ایسا کرنے سے زندگی کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سماج کے چہرے کا رنگ ان کے اس فعل سے نہیں بدلتا۔ دنیا میں کوئی بھونچال نہیں آتا۔ کوئی قیامت برپا نہیں ہوتی پھر ایک ایسے موضوع پر فلم تیار کرنا کیا معنی رکھتا ہے جس کا عمومی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ''زندگی'' خاص افراد کے جنسی ملاپ کی ناکامی کا افسانہ ہے، اسے باقی سب لوگوں کا کیا سروکار ہو سکتا ہے۔

زندگی گندے خون کے نکاس کا نام نہیں ہے۔ زندگی کا مفہوم مسئلہ ازدواج تک محدود نہیں ہے زندگی مرد اور عورت کے ملاپ کا نام نہیں زندگی نام ہے حرکت کا، زندگی نام ہے کشمکش کا زندگی بے نام ہے بے باکی کا زندگی نام ہے زندہ رہنے کا۔ زندگی نام ہے زندہ رہنے کے مطالبے کا ایک بے کار محض بے کار ست آدمی جس کی رگ رگ اور نخ نخ میں کاہلی سرایت کر گئی تھی۔ ایک ایم اے جو اتنا اچھا گاتا تھا کہ ہزاروں روپے ماہوار کما سکے۔ جادو کے کھیل جانتا تھا، بے کار تھا اور جوئے میں ایک کھوٹی دونی جیت کر بازاروں میں گھومتا رہتا تھا ایسا شخص ایک الف لیلہ کے مرد تسمہ پا کی طرح زندگی کی گردن پر سوار نہیں تھا مجھے افسوس ہے کہ آخر میں افسانہ نگار کے ہاتھ شریمتی ہیروئن کی موت واقع ہوئی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ایسے ناکارہ اور فضول شخص کے بوجھ سے زندگی کو ہلکا کر دیا جاتا۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ یہ شخص عشق بھی کرتا ہے اور سماج کو ایک ہی سانس میں دو دو سو گالیاں بھی دیتا ہے۔ اگر میں سماج ہوتا تو اس کے منہ پر ایسا ''زندگی'' بھرا چانٹا مارتا کہ اس کو بے کار رہنے کی کبھی جرأت نہ ہوتی۔

ایک اور بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب شریمتی ہیروئن کا باپ اس بات سے خوش ہو کر کہ اس نے بہت بڑی جرأت کی ہے، اپنی ساری جائیداد اس کے حوالے کر دیتا ہے تو وہ خیرات دینا شروع کر دیتی ہے۔ ممکن ہے اس خیرات کا شریمتی ہیروئن کے ساتھ کوئی نفسیاتی رشتہ ہو مگر میری سمجھ سے یہ بالاتر ہے خیرات میں روپیہ صرف کر کے وہ کس قسم کی پیاس بجھانی چاہتی تھی؟ کیا وہ اپنی عاقبت سنوارنا چاہتی تھی؟ کیا وہ سورگ میں اپنے لیے کوئی اچھا سا بنگلہ ریزرو کرنا چاہتی تھی؟ آخر حاتم طائی کو شرمندہ کرنے کی ضرورت اسے کیوں لاحق ہوئی؟ خواجہ عباس صاحب

کہتے ہیں کہ جو ''زندگی'' دیکھنے جائے، وہ اپنے ساتھ دو رومال لے کر جائے۔ بالکل درست ہے۔ ایک اپنے آنسو پونچھنے کے لیے اور دوسرا برو کے۔۔۔۔۔۔۔!

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

عصمت فروشی

عصمت فروشی کوئی خلاف عقل یا خلاف قانون چیز نہیں ہے۔ یہ ایک پیشہ ہے جس کو اختیار کرنے والی عورتیں چند ساجی ضروریات پوری کرتی ہیں۔ جس شے کے گاہک موجود ہوں اور وہ مارکیٹ میں نظر آئے تو ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیے۔ اگر ہمیں ہر شہر میں ایسی عورتیں نظر آتی ہیں جو اس جسمانی تجارت سے اپنا پیٹ پالتی ہیں تو ہمیں ان کے ذریعہ معاش پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے اس لیے کہ ہر شہر میں ان کے گاہک موجود ہیں۔

عصمت فروشی کو گناہ کبیرہ یقین کیا جاتا ہے ممکن ہے یہ بہت بڑا گناہ ہو مگر ہم مذہبی نقطہ نظر سے اس کو جانچنا نہیں چاہتے۔ گناہ اور ثواب، سزا اور جزاء، کی بھول بھلیوں میں پھنس کر آدمی کسی مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کر سکتا۔ مذہب خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، اگر اس میں لپیٹ کر کسی اور مسئلے کو دیکھا جائے تو ہمیں بہت ہی مغز دردی کرنی پڑے گی اس لیے مذہب کو عصمت فروشی سے الگ کر کے ہم نے ایک طرف رکھ دیا ہے۔

عصمت فروشی کیا ہے؟۔۔۔۔۔عصمت کو بیچنا یعنی اس گوہر کو بیچنا یعنی اس گوہر کو بیچنا جس کو عورت کی زندگی کا سب سے قیمتی زیور یقین کیا جاتا ہے، اس زیور کی قدر اس لیے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے کہ تجربے نے ہمیں بتایا کہ عورت جب ایک بار اس کو کھو دیتی ہے تو سماج کی نگاہوں میں اس کی کوئی عزت نہیں رہتی۔ یہ گوہر کئی طریقوں سے ضائع ہوتا ہے۔ جب عورت کی شادی ہو جائے تو یہ گوہر

خاوند کی جیب میں چلا جاتا ہے۔بعض اوقات مرد اسے زبردستی حاصل کر لیتے ہیں اور بعض اوقات شادی کے بغیر عورتیں اسے اپنے دل پسند مردوں کے حوالے کر دیتی ہیں بعض حالات سے مجبور ہو کر اسے بیچ دیتی ہیں اور بعض اس کی تجارت کرتی ہے۔

ہم ان عورتوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔جو پیشے کے طور پر اپنی عصمت بیچتی ہیں حالانکہ یہ بالکل واضح چیز ہے کہ عصمت صرف ایک بار کھوئی یا بیچی جا سکتی ہے، بار بار اس کو بیچا یا کھویا نہیں جا سکتا لیکن چونکہ اس پیشے کو عرف عام میں عصمت فروشی کہا جاتا ہے اس لیے ہم اسے عصمت فروشی ہی کہیں گے۔

عصمت فروش عورت ایک زمانے سے دنیا کی سب سے ذلیل ہستی سمجھی جاتی رہی ہے۔مگر کیا ہم نے غور کیا ہے کہ ہم میں سے اکثر ایسی ذلیل وخوار ہستیوں کے در پر ٹھوکریں کھاتے ہیں؟۔۔۔۔۔کیا ہمارے دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ ہم بھی ذلیل ہیں۔

مقام تاسف ہے کہ مردوں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا۔مرد اپنے دامن پر ذلت کے ہر دھبے کو عصمت فروش عورت کے دل کی سیاہی سے تعبیر کرے گا، حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔عورتوں میں خواہ وہ کسبی ہوں یا غیر کسبی ہوں، ننانوے فی صد ہی ایسی ہوں گی جن کے دل عصمت فروشی کی تاریک تجارت کے باوجود بدکار مردوں کے دل کی بہ نسبت کہیں زیادہ روشن ہوں گے موجودہ نظام کے تحت جس کی باگ ڈور صرف مردوں کے ہاتھ میں ہے، عورت خواہ یہ عصمت فروش ہو یا باعصمت، ہمیشہ دبی رہی ہے۔مرد کو اختیار ہو گا کہ وہ اس کے متعلق جو

چاہے رائے قائم کرے۔

ہم نے متعدد بار اپنے کانوں سے تعیش پسند امیروں کو اپنا مال و اسباب شہوت کے تنور میں ایندھن کے طور پر جلا کر یہ کہتے سنا ہے کہ فلاں طوائف یا فلاں ویشیا نے ان کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔۔۔یہ معمہ ابھی تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

ویشیا یا طوائف اپنے تجارتی اصولوں کے ماتحت ہر مرد سے جو اس کے پاس گاہک کے طور پر آتا ہے، زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش کرے گی، اگر وہ مناسب داموں پر یا حیرت انگیز قیمت پر اپنا مال بیچتی ہے تو یہ اس کا پیشہ ہے بنیا بھی تو سودا تولتے وقت ڈنڈی مار جاتا ہے۔بعض دکانیں زیادہ قیمت پر اپنا مال بیچتی ہیں،بعض کم قیمت پر۔۔۔

تعجب تو اس بات کا ہے کہ جب صدیوں سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ ویشیا کا ڈسا ہوا پانی نہیں مانگتا۔تو ہم کیوں اپنے آپ کو اس سے ڈسواتے ہیں اور پھر کیوں خود رونا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ویشیا ارادے یا کسی انتقامی جذبے کے زیر اثر مردوں کے مال وزر پر ہاتھ نہیں ڈالتی۔وہ سودا کرتی ہے اور کماتی ہے۔مرد اپنی جسمانی خواہشات کی تکمیل کا معاوضہ ادا کرتے ہیں اور بس۔

ممکن ہے ویشیا کسی مرد سے محبت کرتی ہو لیکن ہر وہ گاہک جو ایک خاص جذبے کے زیر اثر اس کی دکان میں جاتا ہے، دل میں یہ خواہش بھی پیدا کر لے کہ وہ اس سے سچی محبت کرے تو کیونکر ممکن ہے؟۔۔۔۔۔ہم اگر کسی دکان سے ایک روپے کا آٹا لینے جائیں تو ہماری یہ توقع قطعی طور پر مضحکہ خیز ہو گی کہ وہ ہمیں اپنے گھر میں مدعو کرے گا اور سر کے گنج کا کوئی لاجواب نسخہ بتائے گا۔

ویشیا اپنے اس گاہک کے روبرو جو اس سے محبت کا طالب ہے، اپنے چہرے پر مصنوعی محبت کے جذبات پیدا کرے گی۔ یہ چیز گاہک کو خوش کر دے گی مگر یہ عورت اپنے سینے کی گہرائیوں سے ہر مرد کے لیے جو شراب پی کر اس کے کوٹھے پر جھومنے لگتا ہے اور رومان کی ایک نئی دنیا بسانا چاہتا ہے، محبت کی پاک اور صاف آواز نہیں نکال سکتی۔

ویشیا کو صرف باہر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے رنگ روپ اس کی بھڑکیلی پوشاک اور اس کے مکان کی آرائش و زیبائش دیکھ کر یہی نتیجہ مرتب کیا جاتا ہے کہ وہ خوش حال ہے یہ درست نہیں۔

جس عورت کے دروازے شہر کے ہر اس شخص کے لیے کھلے ہیں جو اپنی جیبوں میں چاندی کے چند سکے رکھتا ہو۔ خواہ وہ موچی ہو یا بھنگی، لنگڑا ہو یا لولا، خوبصورت ہو یا کریہہ المنظر اس کی زندگی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ایک بد صورت مرد جس کے منہ سے پائیوریا لگے دانتوں کے تعفن کے بھبکے نکلتے ہیں، ایک نفاست پسند ویشیا کے ہاں آتا ہے۔ چونکہ اس کی گرہ میں اس ویشیا کے جسم کو ایک خاص وقت تک خریدنے کے لیے دام موجود ہیں۔ وہ نفرت کے باوجود اس گاہک کو نہیں موڑ سکتی۔ سینے پر پتھر رکھ کر اس کو اپنے گاہک کی بدصورتی اور اس کے منہ کا تعفن برداشت کرنا ہی پڑے گا وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کا ہر گاہک اپولو نہیں ہو سکتا۔

ٹائپسٹ عورتوں کو حیرت سے نہیں دیکھا جاتا۔ وہ عورتیں جو دایہ گیری کا کام کرتی ہیں، انہیں حیرت اور نفرت سے نہیں دیکھا جاتا، وہ عورتیں جو گندگی سر پر

اٹھاتی ہیں، ان کی طرف حقارت سے نہیں دیکھا جاتا۔ لیکن تعجب ہے کہ ان عورتوں کو جو اچھے یا بھونڈے طریقے سے اپنا جسم بیچتی ہیں، حیرت، نفرت اور حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔

حضرات! یہ جسم فروشی ضروری ہے آپ شہر میں خوبصورت اور نفیس گاڑیاں دیکھتے ہیں ۔۔۔۔۔ یہ خوبصورت اور نفیس گاڑیاں کوڑا کرکٹ اٹھانے کے کام نہیں آسکتیں ۔گندگی اور غلاظت اٹھا کر باہر پھینکنے کے لیے اور گاڑیاں موجود ہیں جنہیں آپ کم دیکھتے ہیں اور اگر دیکھتے ہیں تو فوراً اپنی ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں ۔۔۔۔۔ ان گاڑیوں کا وجود ضروری ہے اور ان عورتوں کا وجود بھی ضروری ہے جو آپ کی غلاظت اٹھاتی ہیں ۔اگر یہ عورتیں نہ ہوتیں تو ہمارے سب گلی کوچے مردوں کی غلیظ حرکات سے بھرے ہوتے۔

یہ عورتیں اجڑے ہوئے باغ ہیں، گھورے ہیں جن پر گندے پانی کی موریاں بہہ رہی ہیں ۔ یہ ان گندی موریوں ہی پر زندہ رہتی ہیں ۔۔۔۔۔ ہر انسان کیسے ایک جیسے شاندار طریقے پر زندگی بسر کر سکتا ہے؟

ذرا خیال فرمایئے! شہر کے ایک کونے میں ایک ویشیا کا مکان ہے، رات کی سیاہی میں ایک مرد جو اپنے سینے میں اس سے بھی زیادہ دل رکھتا ہے، اپنے جسم کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے بے دھڑک اس کے مکان میں چلا جاتا ہے ۔ویشیا اس مرد کی سیاہی سے واقف ہے اس سے نفرت بھی کرتی ہے، اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کا وجود دامن انسانیت پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ وہ از منہ بربریت کا ایک خوف ناک نمونہ ہے مگر وہ اپنے گھر کے دروازے اس پر بند

نہیں کر سکتی ۔۔۔۔ جو دروازے معاشی کشمکش نے ایک دفعہ کھول دیئے ہوں، بہت مشکل سے بند کیے جا سکتے ہیں۔

یہ ویشیا جو عورت پہلے ہے ویشیا بعد میں ۔۔۔۔۔۔۔ اس مرد کو چند سکوں کے عوض اپنا جسم حوالے کر دیتی ہے لیکن اس کی روح اس وقت جسم میں نہیں ہوتی، ایک ویشیا کے الفاظ سنیئے ''لوگ مجھے باہر کھیتوں میں لے جاتے ہیں ۔۔۔۔۔ میں لیٹی رہتی ہوں بالکل بے حس و بے حرکت، لیکن میری آنکھیں کھلی رہتی ہیں میں بہت دور بہت دوران درختوں کو دیکھتی رہتی ہوں جن کی چھاؤں میں کئی بکریاں آپس میں لڑ جھگڑ رہی ہوتی ہیں، کتنا پیارا منظر ہوتا ہے ۔۔۔ میں بکریاں گننا شروع کر دیتی ہوں یا پیڑوں کی ٹہنیوں پر کوؤں کو شمار کرنے لگتی ہوں ۔۔۔۔ انیس، بیس، اکیس، بائیس ۔۔۔۔ اور مجھے معلوم نہیں ہوتا کہ میرا ساتھی اپنے کام سے فارغ ہو کر ایک طرف ہانپ رہا ہے۔''

مشاہدہ بتاتا ہے کہ ویشیا میں عام طور پر خدا ترسی ہوتی ہے۔ ہر ہندو ویشیا کے مکان پر کسی نہ کسی کمرے میں آپ کو کرشن یا گنیش مہراج کی مورتی یا تصویر نظر آئے گی۔ وہ اس مورتی کی اسی صدق دل سے پوجا کرتی ہے جتنی ایک باعصمت گھریلو عورت کر سکتی ہے۔ اسی طرح وہ ویشیا جو مسلمان ہے وہ رمضان میں روزے ضرور رکھے گی، محروم میں اپنا کاروبار بند رکھے گی، سیاہ کپڑے پہنے گی، غریبوں کی مدد کرے گی اور خاص خاص موقعوں پر خدا کے حضور عجز و نیاز کا نذرانہ بھی ضرور پیش کرے گی۔ بادی النظر میں عصمت باختہ عورتوں کا مذہب سے یہ لگاؤ ایک ڈھونگ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں یہ ان کی روح کا وہ حصہ پیش کرتا ہے جو سماج کے

زنگ سے یہ عورتیں بچا بچا کے رکھتی ہیں۔

دوسرے مذہب کی ویشیائیں بھی آپ کو روحانی طور پر اپنے اپنے مذہب کے ساتھ بڑی مضبوطی کے ساتھ جکڑی نظر آئیں گی۔ کرسچین ویشیا گرجے میں نماز کے لیے ضرور جائے گی۔ کنواری مریم کی تصویر کے پاس دیا ضرور جلائے گی۔ دراصل اس تجارت میں ویشیا اپنے جسم کو لگاتی ہے نہ کہ روح کو بھنگ یا چرس بیچنے والا ضروری نہیں کہ ان منشیات کا عادی ہو، ٹھیک اسی طرح ہر مولوی یا پنڈت پاک باز نہیں ہو سکتا۔

جسم داغا جا سکتا ہے مگر روح نہیں داغی جا سکتی۔

ویشیا اپنی تاریک تجارت کے باوجود روشن روح کی مالک ہو سکتی ہے۔ وہ اپنے جسم کی قیمت بڑی بے دردی سے وصول کرتی ہے مگر غریبوں کی وسیع پیمانے پر مدد بھی کر سکتی ہے۔ بڑے بڑے امیر اس کے دل میں اپنی محبت پیدا نہ کر سکے ہوں مگر وہ سڑکوں پر سونے والے ایک آوارہ گرد کی پھٹی ہوئی جیب میں اپنا دل ڈال سکتی ہے۔

ویشیا دولت کی بھوکی ہوتی ہے لیکن کیا دولت کی بھوکی محبت کی بھوکی نہیں ہو سکتی؟ یہ ایسا سوال ہے جس کے جواب میں ہمیں تفصیل سے کام لینا پڑے گا۔ خاندانی ویشیا اور نو کسبی ویشیا میں بہت فرق ہے۔ اور پھر وہ عورتیں یا لڑکیاں جو اپنے غریب ماں باپ یا اپنے بچوں کی پرورش کے لیے مجبوراً اپنا جسم چھپ چھپ کر فروخت کرتی ہے ان کی حیثیت متذکرہ صدر اقسام سے بالکل جداگانہ ہے۔

خاندانی ویشیا سے ہماری مراد وہ کسبی عورت ہے جو ویشیا کے بطن سے پیدا ہوتی

ہے اور اسی کے گھر میں پالی پوسی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ عورت جس کو خاص اصولوں کے تحت ویشیا بننے کی تعلیم دی جاتی ہے ایسی عورتیں جو اس ماحول میں پرورش پاتی ہیں، عشق و محبت کو عام طور پر ایسا سکہ تصور کرتی ہیں جو ان کے بازار میں نہیں چل سکتا۔ یہ نظریہ درست ہے اس لیے کہ اگر وہ ہر اس مرد کو جو ان کے پاس چند لمحات گزارنے کے لیے آئے، اپنا دل حوالے کر دیں تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے کاروبار میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ اس سکول کی ویشیاؤں کے سینے میں عشق و محبت کا عنصر کم ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ دوسری عورتوں کے مقابلے میں مردوں سے عشق کرنے میں بڑی احتیاط اور بڑے بخل سے کام لیتی ہیں۔ مردوں سے روزانہ میل جول ان کے دل میں ایک نا قابل بیان تلخی پیدا کر دیتا ہے، وہ مردوں کو حیوانوں سے بدتر سمجھنے لگتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اس ضمن میں ایک حد تک ''منکر'' ہو جاتی ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا سینہ محبت کے لطیف جذبات سے خالی ہوتا ہے۔

جس طرح بھنگن کی لڑکی کو گندگی کا پہاڑ اٹھاتے وقت گھن نہیں آئے گی۔ اسی طرح اپنے پیشے کا پہلا قدم اٹھاتے وقت ایسی ویشیاؤں کو بھی حجاب محسوس نہیں ہو گا۔ آہستہ آہستہ حیاء اور جھجک سے متعلقہ قریب قریب تما جذبات ان میں گھس گھسا کر مٹ جاتے ہیں۔۔۔۔ چکلے کے اندر جہاں شہوت پرست مردوں کے لیے ان عورتوں کے مکان کھلے رہتے ہیں، لطیف جذبات کیسے داخل ہو سکتے ہیں۔

جس طرح باعصمت عورتیں ویشیاؤں کی طرف حیرت اور تعجب سے دیکھتی

ہیں، ٹھیک اسی طرح وہ بھی ان کی طرف اسی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اول الذکر کے پیش نظر یہ استفہام ہوتا ہے "کیا عورت اس قدر ذلیل ہو سکتی ہے؟" موخر الذکر یہ سوچتی ہیں "یہ پاکباز عورتیں کیسی ہیں۔۔۔۔کیا ہیں؟"

ویشیا جس کی ماں ویشیا تھی، جس کی دادی ویشیا تھی، جس کی پردادی ویشیا تھی، جس نے ویشیا کا دودھ پیا، جو عصمت فروشی کے گہوارے میں پلی، وہیں بڑی ہوئی جس کی تجارت کا آغاز بھی وہیں سے شروع ہوا، عصمت اور باعصمت عورتوں کے متعلق کیا سمجھ سکتی ہے۔

ان سو لڑکیوں میں سے جو ویشیاؤں کے گھر میں پیدا ہوتی ہیں شاید ایک دو کے دل میں اپنے گرد و پیش کے ماحول سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے جسم کو صرف ایک مرد کے حوالے کرنے کا تہیہ کرتی ہیں لیکن باقی سب اسی راستے پر چلتی ہیں جو ان کی ماؤں نے ان کے لیے منتخب کیا ہوتا ہے۔

جس طرح ایک دکاندار کا بیٹا اپنی نئی دکان کھولنے کا اشتیاق رکھتا ہے اور اس شوق کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح ویشیاؤں کی جوان لڑکیاں اپنا پیشہ شروع کرنے کا بڑا چاؤ رکھتی ہیں۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ ایسی لڑکیاں نت نئے طریقوں سے اپنے جسم اور حسن کی نمائش کرتی ہیں۔ جب وہ اپنی تجارت کا آغاز کرتی ہیں تو باقاعدہ رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ ایک خاص اہتمام کے تحت یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ دوسری تجارتی کاموں کی بنیاد رکھتے وقت خاص رسوم کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

ان حالات کے تحت جیسا کہ ظاہر ہے، متذکرہ صدر قسم کی ویشیاؤں کے دل

میں عشق پیدا ہونا مشکل ہے۔ یہاں عشق سے ہماری مراد وہی عشق ہے جو ہمارے یہاں عرصہ دراز سے رائج ہے، ہیر رانجھا اور سسی پنوں والا عشق۔

ایسی ویشیائیں عشق کرتی ہیں مگر ان کا عشق بالکل جدا قسم کا ہوتا ہے۔ یہ لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھے والا عشق نہیں کر سکتیں اس لیے کہ یہ ان کی تجارت پر بہت برا اثر ڈالتا ہے اگر کوئی ویشیا اپنے اوقات تجارت میں سے چند لمحات ایسے مرد کے لیے وقف کر دے جس سے اسے روپے پیسے کا لالچ نہ ہو تو ہم اسے عشق و محبت کہیں گے۔ اصولاً ویشیا کو صرف مرد کی دولت سے محبت ہوتی ہے۔ اگر وہ کسی مرد سے اس کی دولت کی خاطر نہیں بلکہ صرف اسی کی خاطر ملے تو یہ اصول ٹوٹ جائے گا اور اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہو جائے گا کہ اس ویشیا کی جیب نہیں بلکہ اس کا دل کارفرما ہے۔ جب دل کارفرما ہو تو عشق و محبت کے جذبے پیدا ہونا لازمی ہے۔

چونکہ عام طور پر عورت سے عشق و محبت کرنے کا واحد مقصد جسمانی لذت ہوتا ہے اس لیے ہم یہاں بھی جسمانی لذتوں ہی کو عشق کے اس جذبے کا محرک سمجھیں گے گو اس کے علاوہ اور بہت سی چیزیں اس کی تخلیق و تولید کی مہیج ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ویشیا جو اپنے کوٹھے پر ہر مرد پر حکم چلانے کی عادی ہوتی ہے غیر مختتم ناز برداریوں سے سخت تنگ آ جاتی ہے۔ اس کو آقا بننا پسند ہے مگر کبھی کبھی وہ غلام بننا بھی چاہتی ہے۔ ہر فرمائش پوری ہو جانے میں اس کو بہت فائدہ ہے مگر انکار میں اور ہی لذت ہے۔ وہ ہر طرف سے دولت سمیٹتی ہے۔ یہ کام اس کا معمول بن جاتا ہے اس لیے کبھی کبھی اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی کسی کے لیے خرچ کرے۔ اگر سب اس کی خوشامد کرتے ہیں تو وہ بھی کسی کی خوشامد کرے۔

اگر وہ ضد کرتی ہے تو کوئی اس سے بھی ضد کرے۔ وہ سب کو دھتکارتی ہے تو کوئی اسے بھی دھتکارے، ستائے، مارے پیٹے۔ تمام چیزیں مل کر اس کے دل میں ایک خاص مرد کو اپنا رفیق بنانے پر مجبور کرتی ہیں چنانچہ وہ انتخاب کرتی ہے۔

انتخاب کا یہ وقت بہت نازک ہوتا ہے۔ بہت ممکن ہے وہ کسی رئیس زادے پر اپنے دل کے خاص دروازے کھول دے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے کوٹھے پر چلمیں بھرنے والے چرس نوش میراثی کے غلیظ قدموں میں اپنا وہ سر رکھ دے جس کے بالوں کو چومنے کے لیے بڑے بڑے راجاؤں اور مہاراجوں نے کئی کئی ہزار اشرفیاں پانی کی طرح بہا دی تھیں اور پھر اس وقت بھی کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے، جب وہ غلیظ آدمی اس سر کو ٹھوکر مار کر پرے ہٹا دے۔ اس قسم کے واقعات دیکھنے اور سننے میں آچکے ہیں۔

ہمارے یہاں ایک مشہور طوائف اس وقت تک موجود ہے، جس کے عشق میں ایک نواب مدتوں لٹو بنا رہا مگر وہ ایک نہایت ہی معمولی آدمی کے عشق میں گرفتار تھی۔ طوائف نواب کے عشق کا مضحکہ اڑاتی تھی اور ادھر اس کے اپنے عشق کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ نواب طوائف کے عشق میں رسوا ہوا اور طوائف اس آدمی کے عشق میں بدنام ہوئی۔

ایسے بازاروں میں جہاں یہ عورتیں رہتی ہیں، آپ کو متذکرہ صدر قسم کی کئی کہانیاں سننے میں آسکتی ہیں خاص کر ان تعیش پسند امیروں کو جن کی تھیلیوں کے منہ ان جسم فروش عورتوں کے کوٹھوں پر کھلتے ہیں، ایسی کہانیاں ازبر ہیں جن کو وہ اکثر مزے لے لے کر دوسروں کو سنانے کے عادی ہیں۔ سارنگئے، میراثی، طبلچی اور وہ

لوگ جن کی آمد و رفت ایسے کوٹھوں پر عام رہتی ہیں، آپ کو بہت دلچسپ قصے سنائیں گے۔

انہی لوگوں سے سنے سنائے قصوں میں ہم ایک ایسی ویشیا کی کہانی مثال کے طور پر سکتے ہیں جو کہ ہزاروں اور لاکھوں میں کھیلتی تھی۔ مگر اس کا دل ایک چیتھڑے لٹکائے مزدور کے کھردرے پیروں تلے ہر روز روندا جاتا تھا۔ وہ ہر شب اپنے دولت مند پرستاروں سے سیم و زر کے انبار جمع کرتی تھی مگر ایک مزدور کے میلے کچیلے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ نازک بدن اس مزدور کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کئی بار سڑک کے پتھروں پر سوئی۔

اس قسم کا تضاد و تخالف جو عشق و محبت کا اصلی رنگ ہے، قحبہ خانوں میں دیکھا جائے تو بہت شوخ پر اسرار حد تک رومانی نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ صرف عقبی مناظر ہے جو پیش منظر کے ہر نقش کو ابھارتا ہے۔ چونکہ عام طور پر ویشیا کے بارے میں یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سونا کھودنے والی کدال ہے اور محبت کے جذبات سے قطعی طور پر عاری ہے اس لیے جب کبھی کسی ویشیا کے عشق کی ایسی داستان سننے میں آتی ہے تو بڑی عجیب و غریب اور پر اسرار معلوم ہوتی ہے۔ ہم ایسی داستانوں کو اسی وجہ سے عام عورتوں اور مردوں کے معاشقوں کی بہ نسبت زیادہ دلچسپی سے سنتے ہیں جیسے کسی مافوق العادت حادثے کی تفصیل سن رہے ہیں۔ حالانکہ دل اور اس کی دھڑکنوں سے عصمت فروشی یا عصمت مآبی کا کوئی تعلق نہیں۔۔۔۔ ایک با عصمت عورت کے سینے میں محبت سے عاری دل ہو سکتا ہے اور اس کے برعکس

چکلے کی ایک ادنیٰ ترین ویشیا محبت سے بھرپور دل کی مالک ہوسکتی ہے۔

ہر عورت ویشیا نہیں ہوتی لیکن ہر ویشیا عورت ہوتی ہے اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔

ویشیاؤں کے عشق میں ایک خاص بات قابل ذکر ہے ان کا عشق ان کے روز مرہ کے معمول پر بہت کم اثر ڈالتا ہے۔ ایسی بہت کم طوائفیں ملیں گی جنہوں نے اس جذبے کی خاطر اپنا کاروبار قطعی طور پر بند کر دیا ہو (کسی شریف لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو کر شہر کا شریف دکاندار بھی اپنی دکان بند نہیں کرے گا) عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ اپنے عشق کے ساتھ ساتھ اپنا کاروبار بھی جاری رکھتی ہیں دراصل مال و دولت حاصل کرنے کی ایک تاجرانہ طلب ان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ نت نئے گاہک بنانا اور ہر روز اپنا مال بیچنا ایک عادت سی بن جاتی ہے اور یہی عادت بعد میں طبیعت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس طور پر کہ پھر اس کو زندگی کے دوسرے شعبوں سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ جس طرح گھر کے نوکر جھٹ پٹ اپنے آقاؤں کے بستر لگا کر اپنے آرام کا خیال کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح یہ عورتیں بھی اپنے گاہکوں کو نمٹا کر اپنی خوشی اور راحت کی طرف پلٹ آتی ہیں۔

دل ایسی شے نہیں جو بانٹی جا سکے اور مرد کے مقابلے میں عورت کم ہرجائی ہوتی ہے چونکہ ویشیا عورت ہے اس لیے وہ اپنا دل تمام گاہکوں میں تقسیم نہیں کر سکتی۔ عورت کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنی زندگی میں صرف ایک مرد سے محبت کرتی ہے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بہت حد تک ٹھیک ہے ویشیا صرف اسی مرد پر اپنے دل کے تمام دروازے کھولے گی جس سے اسے محبت ہو ہر آنے جانے والے مرد کے لیے وہ

ایسا نہیں کر سکتی۔

ویشیاؤں کے بارے میں عام طور پر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ وہ بڑی بے رحم اور جلاد صفت ہوتی ہیں۔ ممکن ہے سو میں سوے پانچ چھ اس نوعیت کی ہوں مگر سب کی سب ایسی نہیں ہوتیں بلکہ یوں کہیے کہ نہیں ہو سکتیں ویشیا اور با عصمت عورت کا مقابلہ ہرگز ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ ان دونوں کا مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ویشیا خود کماتی ہے اور با عصمت عورت کے پاس کما کر لانے والے کئی موجود ہوتے ہیں۔

ہمارے کانوں میں ایک ویشیا کے یہ لفظ ابھی تک گونج رہے ہیں جو اس کے دل کی تمام گہرائیاں پیش کرتے ہیں آپ بھی سنئے

"ویشیا ایک بے کس اور بے یار و مددگار عورت ہے۔ اس کے پاس ہر روز سینکڑوں مرد آتے ہیں، ایک ہی خواہش لے کر۔۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے چاہنے والوں کے ہجوم میں بھی اکیلی رہتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ بالکل تن تنہا۔۔۔۔۔ وہ رات کے اندھیرے میں چلنے والی ریل گاڑی ہے جو مسافروں کو اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچا کر ایک آہنی چھت کے نیچے خالی کھڑی رہتی ہے بالکل خالی دھوئیں اور گرد و غبار سے اٹی ہوئی۔۔۔ لوگ ہمیں برا کہتے ہیں معلوم نہیں کیوں؟۔۔۔۔۔ وہی مرد جو رات کی تاریکی میں ہم سے راحت مول لے کر جاتے ہیں، دن کے اجالے میں ہمیں نفرت و حقارت سے دیکھتے ہیں۔۔۔۔ ہم کھلے بندوں اپنا جسم بیچتی ہیں اور اس کو راز بنا کر نہیں رکھتیں وہ ہمارے پاس یہ جنس خریدنے کے لیے آتے ہیں اور اس سودے کو راز بنا کر رکھتے ہیں۔۔۔ سمجھ میں

نہیں آتا کیوں؟''

ذرا اس ویشیا کا تصور کیجئے جس کا اس دنیا میں کوئی بھی نہ ہو۔ نہ بھائی، نہ بہن، نہ ماں، نہ باپ اور نہ کوئی دوست اپنے گاہکوں سے فراغت پا کر جب وہ کمرے میں اکیلی بالکل رہ جاتی ہو گی تو اس کے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہو گی؟۔۔۔۔۔۔۔ یہ تاریکی اس اندھیرے میں اور کتنی تاریک ہو جاتی ہو گی۔

اگر سارا دن نوکری ڈھونڈنے کے بعد مزدور کو اپنی تھکان دور کرنے کا کوئی ذریعہ نظر نہ آئے، اپنی دل بستگی کے لیے بیوی کی باتیں اسے نصیب نہ ہوں اور نہ اس کی ماں ہو جو اس کے تھکے ہوئے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی تمام کلفتیں دور کر دے تو بتائیے اس مزدور کی کیا حالت ہو گی؟

اس مزدور اور اس ویشیا دونوں کی حالت ایک جیسی ہے

ویشیا ایک رنگین شے نظر آتی ہے۔۔۔۔۔ کیوں؟

اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں اپنا دل ٹٹولنا پڑے گا یہ کمزوری ہم مردوں کی نگاہوں کی ہے اور اس کمزوری کے اسباب تلاش کرنے کے لیے ہمیں اپنے آپ ہی سے بات چیت کرنا پڑے گی اس بارے میں غور و فکر کے بعد ہم جو معلوم کر سکے ہیں، یہ ہے۔

ویشیا کا نام لیتے وقت ہمارے دل و دماغ میں ایک ایسی عورت کا تصور پیدا ہوتا ہے، جو مرد کی شہوانی خواہشات اس کی مرضی اور ضرورت کے مطابق پوری کر سکتی ہے۔ گو عورت اور ویشیا پن دو بالکل جدا چیزیں ہیں مگر جب ہم کسی ویشیا کے بارے میں کچھ سوچتے ہیں تو اس وقت عورت معہ اپنے پیشے کے سامنے آ جاتی

ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان پر اس کے ماحول اور اس کے پیشے کا بہت اثر پڑتا ہے مگر کوئی وقت ایسا بھی ہوتا ہے جب وہ ان تمام چیزوں سے ہٹ کر صرف انسان ہوتا ہے اسی طرح کوئی ایسا وقت بھی ضرور آتا ہو گا جب ویشیا اپنے پیشے کا لباس اتار کر صرف عورت رہ جاتی ہو گی مگر افسوس ہے کہ ہم ہر وقت عورت اور ویشیا کو ایک ہی جگہ دیکھنے کے عادی ہیں۔

جب ویشیا کو ہم اس عینک سے دیکھیں تو ہمیں اس کے ساتھ ہی وہ چیز بھی نظر آتی ہے جسے ہم مرد عیش و عشرت سے تعبیر کرتے ہیں اور عیش و عشرت کا مطلب عام طور پر جسمانی لذت ہوتا ہے۔

جسمانی لذت کیا ہے؟

ایک وقتی حظ جو ہمیں اپنی بیوی کیا کسی اور عورت کی مدد سے حاصل ہوتا ہے اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ شادی شدہ مرد اپنی بیویاں چھوڑ کر اس وقتی لذت کے لیے بازاری عورتوں کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ جب ان لوگوں کی جسمانی خواہشات گھر میں پوری ہو سکتی ہیں تو وہ اس کے لیے باہر کیوں مارے مارے پھرتے ہیں۔

اس سوال کا جواب مشکل نہیں۔ آپ کو ایسے کئی آدمی نظر آئیں گے جو گھر کے مرغن اور لذیذ کھانے کا چھوڑ کر ہوٹلوں میں جاتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کو ہوٹلوں کے کھانے کی چاٹ پڑ جاتی ہے۔ ہوٹل کی چیزوں میں غذائیت کم ہوتی ہے مگر ان میں ایک اور شے ہوتی ہے جو ان لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اسے ہم ”ہوٹلیٹ“ کہہ سکتے ہیں، ایک ایسی برائی جو وصف بن جاتی ہے بلکہ یوں

کہیے کہ ایک کشش بن جاتی ہے اس میں ہوٹل کے مالکوں کے فن کا دخل بھی ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ جو ماحول ہوٹل میں میسر آ سکتا ہے انہیں اپنے گھر میں نصیب نہیں ہوسکتا انسان طبعاً تنوع پسند ہے اس لیے جب وہ اپنے روزمرہ کے پروگرام میں تبدیلی چاہتا ہے تو تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہوٹلوں میں ان لوگوں کو اچھا کھانا نہیں مل سکتا اور اس میں کسی شک کی گنجائش کہاں! یہاں گھر کی بہ نسبت زیادہ خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے مگر یہی چیز تو یہ لوگ چاہتے ہیں۔

یہی فرق تو انہیں گھر سے کھینچ کر ہوٹلوں میں لاتا ہے۔ یہ نادانی ہے مگر لطف یہ ہے کہ انہیں اسی نادانی میں تو مزا آتا ہے۔

ان شادی شدہ مردوں کا بھی یہی حال ہے جو اپنی بیویاں چھوڑ کر بازار عورتوں کی آغوش میں لذت تلاش کرنے آتے ہیں۔ اب آپ پوچھیں گے کہ آیا ان لوگوں کو اس تلاش میں کامیابی ہوتی ہے؟۔۔۔۔۔ہم کہیں گے یقیناً۔۔۔۔۔۔۔جن عورتوں کے پاس یہ لوگ جاتے ہیں، اس فن کی ماہر ہوتی ہیں وہ یہی چیز تو بیچتی ہیں ان کا پیشہ ہی یہ ہے کہ گھریلو عورتوں سے مختلف رنگ کی لذت پیش کریں اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کا کاروبار کیسے چل سکتا ہے؟

جیسا کہ ہم اس مقالے کے آغاز میں کہہ چکے ہیں عصمت فروشی خلاف عقل چیز نہیں۔

☆☆☆☆☆

میکسم گورکی

1880ء سے لے کر 1890ء کا درمیانی زمانہ جو خاص طور پر عقیم ہے، روس کی تاریخ ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے دوستووسکی 1881ء میں سپرد خاک ہوا۔ تورگنیف 1883 ء میں راہی ملک عدم ہوا اور تالستائی کچھ عرصہ کے لیے صناعانہ تصانیف سے روکش رہا۔ جب اس نے قلم اٹھایا تو ''اینا کرینیا'' اور ''وار اینڈ پیس'' کے مصنف نے بالکل جدا اسپرٹ میں اپنے افکار کو پیش کیا۔ اسی دوران میں روسی معاشرت میں کلی تبدیلیاں نمایاں طور پر ظاہر ہو گئیں 1863ء میں مزارعوں کی آزادی کے بعد ملک کی صاحب اقتدار جماعت نے رفتہ رفتہ معاشی اقبال اور سیاسی اہمیت سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ بیشتر سرمایہ دار قریب قریب تباہ ہو چکے تھے اور ان کی جائیداد نو کسیبہ تاجروں کے ہاتھوں میں جا رہی تھی۔

الگزنڈر سوئم (1881-94) کا عہد حکومت اور نکولس دوئم (1893,4-1917) کی حکمرانی کے پہلے چند سال روس کی اندرونی سیاسیات کا بدترین زمانہ ہے۔ جذبہ اصلاح کا وہ جوش جو الگزنڈر دوم کے عہد میں روسی معاشرہ کی رگوں میں موجزن تھا، اب سرد ہو چکا تھا۔ مہذب روسی معاشری سوالات سے دور ہٹ کر صرف اپنے ذاتی معاملوں پر غور کرتے تھے۔ دوسری طرف انیسویں صدی کے آخری برسوں میں مصنوعات نے بڑی ترقی کی اور بیشتر کسانوں نے کارخانوں کی مزدوری اختیار کر لی۔ یہ کسان اپنا گھر بار چھوڑ کر

شہروں میں آباد ہو گئے مگر پھر بھی ان کا اپنے دیہاتوں سے تعلق قائم رہا۔ جہاں وہ ٹیکس ادا کرتے تھے ملک میں خانہ بدوش مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ مزدوروں کی یہ جدید جماعت مارکس کے اشتراکی پیروپیگنڈے کے لیے بہت موزوں تھی جو بعد میں روسی انقلاب کی محرک ہوئی۔

دو مصنف جو روس کے اس متبدل معاشرتی نظام کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ چیخوف اور گورکی ہیں۔

چیخوف کی وفات سے قبل یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تصانیف سے حقیقت نگاری کے سنہرے زمانے کا افتتاح کیا ہے جس کا وہ انجام کار صرف پیش آہنگ تھا۔

1895ء سے 1905ء کے درمیانی عرصے میں بہت سے نوجوان ادیب یکے بعد دیگر روسی فضاء میں ابھرے ان ادباء نے مقامی شہرت حاصل کرنے کے علاوہ اکناف عالم میں بھی اپنے نام کا ڈنکا بجوایا۔ دوستوفسکی اور تورگنیف سے بڑھ کر ان کو مقبولیت حاصل ہوئی، جن میں گورکی اور اینڈریف کے نام خاص مرتبہ اور حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم اس عصر کے ادیبوں کی اجتماعی ادبی سرگرمیوں کو گورکی اینڈریف سکول کہیں گے اس لیے کہ وہ تمام انشاء پرداز جو اس سکول میں شامل تھے، اپنے ہمراہ ایسی مشترکہ خصوصیات رکھتے ہیں جو افسانہ نگاری کے قدیم ''پری چیخوف'' سکول سے کوئی تعلق نہیں رکھتی ہیں۔

جس سکول کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں گورکی کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ ہمیں اس سکول کے اکثر اراکین کی تحریروں پر اس کے افکار کا اثر نظر آتا

ہے۔اس اثر کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ گورکی ہی پہلا شخص تھا جس نے روسی حقیقت نگاری سے ''ملائم'' اور ''مطہر'' عناصر یک قلم خارج کر دیئے۔

روسی حقیقت نگاری اخلاقیات کے معاملہ میں ہمیشہ نرم و نازک رہی تھی۔ روسی ادیب، فرانسیسی ناولسٹوں کی خام کاری اور حد سے متجاوز صاف گوئی سے پرہیز کرتے تھے۔ اس زمانے کا روسی ادب کسی حد تک انگریزی وکٹورین ناول سے مشابہت رکھتا ہے بھدا پن، نجاست اور صنفی رشتوں کا شہوانی پہلو روسی مصنف کے لیے ہمیشہ شجر ممنوع رہا تھا۔

یہ ادبی معاہدہ ''تالسٹائی'' نے منسوخ کیا جس نے پہلی مرتبہ موت اور بیماری کی جسمانی ہیبتوں کو اپنا موضوع قرار دے کر ''ایوان الیچ کی موت'' نامی ایک تمثیل سپرد قلم کی اور محبت کی شہوانی پہلو کی ''کروتز رسوینٹا'' کے اوراق میں نقاب کشائی کی تالسٹائی نے ان دو کتابوں کے تعارف سے درحقیقت انیسویں صدی کے ممنوعات اور اعتقادات کی بنیادیں قطعی طور پر ہلا دیں۔ وہ کام جو تالسٹائی نے شروع کیا تھا۔ گورکی اینڈریف نے آرٹی بے شیف کے ہاتھوں تکمیل حاصل کرتا رہا۔ علاوہ بریں جدید آرٹ کا بانی ہونے کی حیثیت میں بھی تالسٹائی کا اثر کافی ووانی تھا۔۔۔ افسانہ نگاری کے مافوق الطبعی مسئلے نے جو اس کے زیر نظر تھا، خاص طور پر اینڈریف اور آرٹی بے شیف کے ہاتھوں خوب نشوونما حاصل کی۔

ادب پر چیخوف کا اثر جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ ایک حد تک مختصر افسانہ نگاری کو روس میں مروج و مقبول کرنے کا سہرا اسی کے سر ہے۔ بیشتر نوجوان افسانہ نگاروں نے چیخوف کا چربہ اتارنے یعنی اس کی صناعانہ باریک روی کو اپنانے کی

کوشش کی مگر اس فن میں اس کا کوئی مد مقابل نہ ٹھہر سکا۔ گو ہمیں ان نقال افسانہ نگاروں کی عبارت میں چیخوف کی دل پسند ترکیب اور اظہار خیال کی مخصوص طرز ملتی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کی صنعت بیانی کو وہ ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔

1900ء اور 1910ء کے درمیانی عرصہ میں روسی ادب دو مختلف حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اولاً گورکی اینڈ ریف سکول ثانیاً اشارہ نگار اور ان کے پیرو یہ لوگ ایسے جدید کلچر کے مبلغ تھے جس نے روسی اذہان کی خوب تربیت کی اور طبقہ علمی کو بہ یک وقت یورپی اور قومی بنا دیا۔

روسی ادب کی حیات تازہ میں میکسم گورکی کا نام بلند ترین مرتبہ رکھتا ہے جدید انشاء پردازی میں صرف گورکی ہی ایسا ادیب ہے جو تالسٹائی کی طرح اکناف عالم میں مشہور رہے اس کی شہرت چیخوف کی مقبولیت نہیں جو دنیا کے چند ممالک کے علمی طبقوں تک محدود ہے۔

گورکی کا کردار فی الحقیقت بہت حیرت افزاء ہے غریب گھرانے میں پیدا ہو کر وہ صرف تیس سال کی عمر میں روسی ادب پر چھا گیا۔

طبقہ ادنیٰ کا شاعر بیسویں صدی کا بائرن میکسم گورکی زندگی کی تاریک ترین گہرائیوں کے بطن سے جو جرائم، مصائب اور بدیوں کا مسکن ہے، پیدا ہوتا ہے۔ اس نے فقیروں کی طرح ہاتھ پھیلا پھیلا کر روٹی کے سوکھے ٹکڑوں کے لیے التجا نہ کی اور نہ جوہری کی طرح اپنے بیش قیمت جواہرات کی نمائش سے لوگوں کی آنکھوں میں چکا چوند ہی پیدا کرنا چاہی۔ نزہنی نو گورد کا یہ معمولی باشندہ اپنے حریت پسند افکار سے روسی ادب کی اندھی شمع کو تابانی بخشنے کا آرزومند تھا۔ مردہ

زرد اور بے جان ڈھانچوں میں حیات نو کی تڑپ پیدا کرنا چاہتا تھا۔

میکسم گورکی کا اصل نام الیکسی میکسی موخ پیشکلوف ہے۔ اس کا باپ میسکم پیشکلوف ایک معمولی دکاندار تھا جو بعد ازاں اپنی اعلیٰ ہمتی اور محنت کشی سے استرا خاں میں جہاز کا ایجنٹ بن گیا۔ اس نے نزنی نوو گورو کے ایک رنگ ساز و سیلی کیشرن کی لڑکی سے شادی کی۔ جس کے بطن سے میکسم گورکی 14 مارچ 1969ء کو پیدا ہوا پیدائش کے فوراً بعد ہی باپ اپنے بچے کو استرا خاں لے گیا۔ یہاں گور کی نے ابھی اپنی زندگی کی پانچ بہاریں دیکھی تھیں کہ باپ کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ اب گورکی کی ماں اسے پھر سے اس کے دادا کے گھر لے آئی۔

گورکی نے اپنے بچپن کے زمانے کی داستان اپنی ایک تصنیف میں بیان کی ہے۔ اس میں نے اس نے اپنے جابر دادا اور رحم دل داری کے کرداروں کی نہایت فن کاری سے تصویر کشی کی ہے جس کے نقوش قاری کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہو سکتے۔ جوں جوں کم سن گورکی کو بڑا ہوتا گیا اس کے گردو پیش کا افلاس زدہ ماحول تاریک سے تاریک تر ہوتا گیا۔ اس کی ماں نے جیسا کہ گورکی لکھتا ہے ''ایک نیم عاقل شخص سے شادی کر لی''

اس شخص کے متعلق گورکی کوئی اچھی رائے نہیں ہے

کچھ عرصے کے بعد اس کی والدہ بھی اسے داغ مفارقت دے گئی اور ساتھ ہی اس کے دادا نے اسے خود کمانے کے لیے اپنے گھر سے رخصت کر دیا۔ قریباً دس سال تک نوجوان گورکی روس کی سرحدوں پر فکر معاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ کشمکش زیست کے اس زمانے میں اسے ذلیل سے ذلیل مشقت سے آشنا ہونا پڑا۔

لڑکپن میں اس نے ایک کفش دوز کی شاگردی اختیار کر لی۔ یہ چھوڑ کر وہ ایک مدت تک دریائے والگا کی ایک دخانی کشتی میں کھانا کھلانے پر نوکر رہا۔ جہاں ایک بوڑھے سپاہی نے چند ابتدائی کتابیں پڑھائیں اور اس طرح اس کی ادبی زندگی کا سنگ بنیاد رکھا۔

ان کتابوں میں سے جو گورکی نے تختہ جہاز پر بوڑھے سپاہی سے پڑھیں۔ ایک کتاب ''اڈلفو کے اسرار'' تھی ایک مدت تک اس کے زیر مطالعہ ایسی کتب رہیں جن کے اوراق عموماً کشت وخون اور شجاعانہ رومانی داستانوں سے لبریز ہوا کرتے تھے۔ اس مطالعہ کا اثر اس کے اوائل تحریروں میں نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔

پندرہ برس کی عمر میں گورکی نے قازان کے ایک سکول میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ان دنوں مفت تعلیم دینے کا رواج نہیں تھا۔ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا بلکہ اسے بھوکوں مرنے سے بچاؤ حاصل کرنے کے لیے ایک بسکٹوں کے کارخانے میں کام کرنا پڑا۔ یہ وہی کارخانہ ہے جس کی تصویر اس نے اپنے ''چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ'' میں نہایت فن کاری سے کھینچی ہے۔

قازان میں اسے ایسا طلباء سے ملنے کا اتفاق ہوا جنہوں نے اس کے دماغ میں انقلابی خیالات کی تخم ریزی کی۔ قازان کو خیرباد کہنے کے بعد وہ جنوب مشرق اور مشرقی روس کے میدانوں میں آوارہ پھرتا رہا۔ اس زمانہ میں اس نے ہر نوعیت کی مشقت سے اپنا پیٹ پالا۔ اکثر اوقات اسے کئی کئی روز فاقے بھی کھینچنے پڑے۔

1890ء میں وہ نزہنی میں رنگروٹ بھرتی ہونے کے لیے آیا خرابی صحت کی بناء پر اسے یہ ملازمت تو نہ مل سکی مگر وہ نزہنی کے ایک وکیل مسٹر ایم اے لینن کے یہاں منشی کی حیثیت میں نوکر ہو گیا۔ اس وکیل نے اس کی تعلیم کی طرف بہت توجہ دی تھوڑے عرصہ کے بعد ہی گورکی کے ذہنی تلاطم نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ منشی گیری چھوڑ کر روس کی سرحدوں پر آوارہ پھرے۔۔۔۔ دراصل قدرت کو یہ منظر نہ تھا کہ مستقبل قریب کا ادیب اتنے عرصے تک دنیا کی نظروں سے روپوش رہے۔

خانہ بروشی کی اس سیاست کے زمانے میں گورکی نے اپنا قلم اٹھایا ''1892ء جب کہ وہ تفلس کے ایک ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھا اس کا پہلا افسانہ ''ماکا رشدرا'' جو ایک نہایت دلچسپ رومانی داستان تھی مقامی روزنامہ ''قفقاز'' میں شائع ہوا، اس افسانے میں اس نے خود کو اپنے قلمی نام گورکی سے متعارف کرایا۔''

کچھ عرصہ تک وہ اپنے صوبے کے اخباروں میں مضامین چھپوانے کے بعد اس قابل ہو گیا کہ اپنی تحریروں سے روپیہ پیدا کر سکے۔ مگر اعلیٰ ادب کے ایوان میں وہ اس وقت داخل ہوا جب اس نے دوبارہ نزہنی میں اقامت اختیار کر لی۔

کورلنکو ان دنوں نزہنی میں تھا اس نے گورکی کا ایک افسانہ چلکاش اپنے اثر و رسوخ سے اس وقت کے ایک موقر مجلّہ میں شائع کرایا۔ گو میکسم گورکی نے پروانشل پریس کی قلمی اعانت جاری رکھی مگر پیٹرزبرگ کے رسائل بھی اس کے مضامین شکریہ کے ساتھ شائع کرنے لگے۔۔۔ 1895ء میں اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہوا، ان افسانوں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ فی الحقیقت روسی انشاء پرداز کے لیے اس قسم کی شاندار کامیابی غیر

مسبوق تھی۔ اس کتاب کے تعارف کے ساتھ ہی گورکی ایک غیر معروف جرنلسٹ سے ملک کا مشہور ترین انشاء پرداز بن گیا۔

گورکی کی شہرت پہلے انقلاب تک قابل رشک تھی۔ ملک کے تمام اخبار اس کی تصاویر اور اس کے ذکر سے بھرے ہوئے تھے۔ ہر شخص اس کی سراپا کو ایک نظر دیکھنا اپنا فرض سمجھتا تھا بین الملی شہرت بھی فوراً ہی نوجوان مصنف کی قدم بوسی کرنے لگی جرمنی بالخصوص اس پر لٹو ہو گیا۔۔۔۔ 1903ء اور 1906ء کے درمیانی عرصہ میں گورکی کی ایک شاہکار تمثیل ''تاریک گہرائیاں'' برلن کے ایک تھیٹر میں متواتر پانچ سو راتوں تک سٹیج ہوتی رہی۔

پیٹرزبرگ میں گورکی کا بیشتر وقت مارکیسوں کی صحبت میں گزرا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مارکسی بن گیا۔ اور اس نے اپنی دو تصانیف ''وہ تینوں'' اور ''فورما'' ایک مارکسی مجلّہ کے سپرد کر دیں۔ یہ دونوں کتابیں اس رسالے میں بالاقساط شائع ہوئیں گورکی کے ایک گیت کی اشاعت کی وجہ سے یہ رسالہ حکومت نے ضبط کر لیا یہ گیت آنے والے انقلاب کی ایک بے نقاب تمثیل تھی۔

میکسم گورکی اب روس کی جمہوریت پسند دنیا کی سب سے زیادہ اہم اور مشہور شخصیت تھی۔ مالی نقطہ نظر سے بھی اسے بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس کی تصانیف کا پیدا کردہ روپے کا بیشتر حصہ انقلاب کی تحریک میں صرف ہوتا رہا۔ خرچ کا یہ سلسلہ 1918ء کے اختتام تک جاری رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورکی اپنی کتابوں کی مقبولیت اور حیرت افزا فروخت کے باوجود اپنی محنت کے ثمر سے پوری طرح حظ نہ اٹھا سکا

1900ء میں اسے ''امپریل اکیڈمی آف سائنس'' کا اعزازی رکن منتخب کیا گیا مگر چونکہ اکیڈمی پولیس کی زیرنگیں تھی اس لیے حکومت نے فوراً ہی اس انتخاب کو رد کر دیا۔ اس پر کورلنکو اور چیخوف سخت مشتعل ہوئے اور احتجاج کے طور پر اکادمی سے علیحدہ ہو گئے۔

پہلے انقلاب میں گورکی نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا جنوری1905ء میں اسے گرفتار کرلیا گیااس گرفتاری نے اکناف عالم میں گورکی کے چاہنے والے پیدا کر دیئے۔

رہائی کے بعد گورکی نے ایک روزنامہ اخبار شائع کیا، جس کے کالم باشیوک تحریک کی نشوو ارتقاء کے لیےمخصوص تھے۔ اس روزنامے میں گورکی نے بیسیویں صدی کے تمام روسی ادباء کو بےہودہ قرار دیتے ہوئے مقالوں کا تانتا باندھ دیا ان انشاءپردازوں میں جو اس کے نزدیک فضول تھے۔ تالشائیا اور دوستووسکی بھی شامل تھے۔وہ انہیں ادنی سرمایہ دار کا نام دیتا ہے۔

اس زمانے میں روس کے غیر ملکی قرضوں کی بہت مخالفت ہو رہی تھی۔ گورکی نے اس تحریک میں بڑی گرمجوشی سے حصہ لیا اور دسمبر میں ماسکو کی مسلح بغاوت کی ہر ممکن طریق پر مدد کی۔

1906ء میں روس چھوڑ کر وہ امریکہ چلا گیا۔ اس کا فن لینڈ اور سیکنڈے نیویا کا سفر ایک پرشکوہ اور ظفر مند جلوس کی صورت میں تھا۔ امریکہ میں اس کا استقبال نہایت شاندار طریقے پر کیا گیا۔ مگر فوراً ہی وہاں کے لوگوں کو پتہ چل گیا کہ گورکی جس عورت کے ہمراہ رہتا ہے اور جسے اپنی منکوحہ بیوی بتاتا ہے فی الحقیقت اس کی

ہوئی نہیں۔ اس واقعہ نے امریکیوں کے دلوں میں اس کے خلاف نفرت پیدا کر دی۔ اسے ہوٹل چھوڑ دینے کے لیے کہا گیا اور ایک دعوت میں جو اس کے اعزاز میں دی جا رہی تھی مارک ٹوین نے صدارت سے انکار کر دیا۔ قدرتی طور پر گورکی طہارت کے اس غیر متوقع جذبے سے سخت رنجیدہ ہوا جو ایک روسی کے لیے نا قابل فہم تھا اس ذہنی تکدر نے اسے چند امریکی افسانے سپرد قلم کرنے پر مجبور کیا1970ء میں ''پیلے بھوتوں کا شہر'' کے معنی خیز عنوان سے شائع ہوتے رہے۔

یورپ واپس آنے پر وہ ''کیپری'' میں سکونت پذیر ہوا۔ جہاں وہ جنگ سے کچھ عرصہ پہلے تک مقیم رہا یہاں کے لوگوں میں اسے بہت ہر دلعزیزی نصیب ہوئی۔

میسینا کی ہولناک آفت کے بعد ریلیف کے کاموں میں حصہ لینے کی وجہ سے اٹلی گورکی کا گرویدہ ہو گیا۔ اسی عرصہ میں روس کے ادبی حلقوں میں اس کی شہرت کم ہونے لگی ''تاریک گہرائیاں'' کے بعد تصانیف کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی جو ہونا چاہیے تھی رفتہ رفتہ گورکی جو1900ء تک بڑا ہر دل عزیز مصنف تھا، بالشویک پارٹی کا پٹھو بن کر رہ گیا۔

(''پرنس ڈی ایس میرسکی کونٹیمپریری رشین لٹریچر'')

گو ادبی حلقوں میں اس کی شہرت کو اس طرح زوال پہنچا مگر دوسری طرف اس کے افکار روسی مزدوروں کے دل و دماغ میں گھر کرنے لگے۔ روسی مزدوروں کی وہ ذہنیت جو ہمیں1918ء تک نظر آتی ہے۔ دراصل گورکی کی تصانیف کی مرہون منت ہے۔ روس واپس آنے پر اس نے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا مگر یہ مقبول نہ

ہوا۔

جنگ عظیم چھڑنے پر گورکی نے بین الملی پوزیشن اختیار کر لی۔ 1918ء میں اس نے اپنے قدیم دوستوں یعنی بالشویکوں کی مدد کی مگر یہ امداد غیر مشروط نہ تھی گو اس کا اثر لینن اور اس کی پالیسی کے حق میں تھا مگر اس نے اس دفعہ خود کو پارٹی کا طرفدار ظاہر نہ کیا بلکہ غیر جانبدار اور امن پسند رہنے کی کوشش کی، اس کی یہ بھاری بھر کم برتری اور مشفق مگر حرف گیر علیحدگی دیر تک قائم رہی۔

بالشویکوں نے اس رویئے پر ضرورت سے زیادہ سرگرمی کا اظہار نہ کیا لیکن ایک طرف گورکی کے بالشویک پارٹی کے سرکردہ لیڈروں سے ذاتی تعلقات دوسری طرف اس کی بیرونی شہرت کی فراوانی نے اسے ایک اعلیٰ حیثیت بخشی 1918ء سے لے کر 1921ء تک قطعی طور پر سوویٹ روس میں پبلک کی آزاد قوت صرف گورکی ہی تھا۔

گورکی کے غیر جانبدارانہ رویہ کو قابل تحسین قرار نہ دیا جائے۔ مگر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس ہولناک زمانہ میں اس کی سرگرمیاں قابل صد آفرین ہیں۔ اگر وہ اس سے قبل امن پسند اور تہذیب وتمدن کا حامی بننے کا جھوٹا دعویٰ کر رہا تھا تو اس نے اس مرتبہ فی الواقع اپنے آپ کو ایسا ثابت کر دکھایا روسی تمدن درحقیقت گورکی کی اخلاص کیشانہ سرگرمیوں کا شرمندہ احساس ہے 1981ء اور 1921ء کے دوران میں ہر وہ کوشش جو روسی انشاء پردازوں اور دیگر صحافیوں کو گرسنگی سے بچانے کے لیے عمل میں لائی گئی، صرف گورکی کی توجہ کا نتیجہ تھی اس نے اس غرض کے لیے اپنے سیاسی دوستوں کی مدد سے ایک ایسا مرکزی ادارہ قائم کیا، جہاں

روسی ادباء سے غیر ملکی زبانوں کے تراجم کرائے جاتے تھے اور اس طرح انہیں پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہو جاتا تھا۔

1919ئمیں گورکی نے تالسٹائی کی یاد کی جھلکیاں شائع کیں اس تصنیف سے ایک بار پھر یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ فی الواقع اعلیٰ پائے کا مصنف ہے مگر اس کے باوجود وہ اپنی پہلی سی عظمت دوبارہ حاصل نہ کر سکا۔

1922ء میں اس نے روسی کسانوں پر ایک زبردست مقالہ لکھا جس میں اس نے اس جماعت کو غیر معمولی ترش الفاظ میں ملامت کرتے ہوئے اسے ہر برائی کا مسکن قرار دیا ہے۔ گورکی اس جماعت کے افراد کو اس لیے بھی موردالزام ٹھہراتا ہے کہ انہوں نے قومی تہذیب کی تاسیس میں کوئی حصہ نہ لیا۔

1922ء کے آخر میں گورکی نے روس کو خیر باد کہہ کر جرمنی میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کی صحت جو پہلے ہی بہت خراب تھی اور زیادہ خراب ہو گئی لیکن اس کے باوجود اس نے قلم اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ ایک رسالے کی ادارت کے فرائض انجام دیتا رہا۔

اخباری اور محض سیاسی تحریروں کو شامل نہ کرتے ہوئے ہم گورکی کی باقی تصانیف تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

1 وہ مختصر افسانے جو1892ء اور 1899ء کے درمیانی عرصہ میں سپرد قلم ہوئے اور جن کی وجہ سے اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔

2 اس کے معاشرتی ناول اور ڈرامے جو1899ء اور 1912ء کی درمیانی مدت میں لکھے گئے ہیں۔

3 1912ء سے لے کر اس وقت تک تمام تحریریں جو زیادہ تر سوانح حیات اور تذکروں کی شکل میں ہیں۔

گورکی کی تصانیف کا پہلا اور آخری دور درمیانی زمانے کی تحریروں کی نسبت زیادہ اہمیت رکھتا ہے ان تحریروں میں ہم اس کی تخلیقی قوت ایک حد تک ضعیف دیکھتے ہیں

گورکی کی اوائل تصانیف کی حقیقت نگاری میں رومانیت بدرجہ اتم موجود ہے رومانیت کا یہی عنصر روس میں اس کی مقبولیت کا باعث ہوا لیکن اس کے برعکس غیر ممالک میں اس کی شہرت کا باعث اس کی حقیقت نگاری ہے۔

اس کے پہلے افسانوں کی تازگی روسی قاری کی نظر میں صرف اس کے جوان اور بے باک افکار تھے، لیکن غیر ملکی قاری اس خام اور ستم کار انداز بیان میں تازگی محسوس کرتا تھا جس کے ذریعے اس نے اپنی دوزخ نما دنیا کی تصویر کشی کی ہے۔

(کونٹمپریری رشین ناولسٹن سرگ پرسکی)

ان سطور سے ہمیں اوائلی گورکی کے متعلق روسی اور غیر روسی قاری کی پسندیدگی کے تقابل کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اس تضاد کی وجہ فی الحقیقت عقبی مناظر کا تخالف ہے۔ روسیوں نے اس کے افکار کو چیخوف اور 1880ء کے دیگر انشاء پردازوں کے گرائے ہوئے مغموم اور یاس آفرین پردے پر دیکھا اور غیر ملکیوں نے عہد وکٹوریہ کی مروج و پرسکون حقیقت نگاری کے پردے پر۔

گورکی کے شروع شروع کے افسانے بالکل رومانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں، ان افسانوں میں ''ماکار شدرا'' اور ازرگل بڈھا آدمی کے نام قابل ذکر ہیں۔

ان افسانوں کی رومانیت نمائشی اور تھیٹری ہے لیکن اسی رومانیت نے چیخوف سے اچاٹ روسی قاری کی نظر میں گورکی کا رتبہ پیدا کیا اس کی یہ رومانیت ایک ایسے فلسفے کی شکل اختیار کر گئی جسے اس نے بڑے خام اور سادہ انداز میں اپنی ایک کہانی میں بیان کیا ہے اس کہانی کا مطلب ہے کہ وہ دوزخ جو روح کو سرفرازی بخشے بہتر ہے اس سچائی سے جو ذلت آفرین ہو۔

1895ء میں گورکی نے دفعتاً چوروں اور جنگلی انسانوں کی داستانیں قلم بند کرنا چھوڑ کر نیا رخ بدلا، اب اس نے جو روش اختیار کی، وہ حقیقت نگاری کی تشکیل اور رومانیت کا اجتماع تھی۔ اس کا پہلا افسانہ ''چلکاش'' جو بڑے پریس میں شائع ہوا، بہت کامیاب ہے۔ اس داستان کا موضوع چلکاش نامی ایک ترش رو اور نڈر خفیہ فروش اور اس نوجوان طامع لڑکے کا تقابل ہے جسے چلکاش اپنے خطرناک اور مجرمانہ پیشے کا شریک بناتا ہے اس کہانی کا پلاٹ نہایت سلجھا ہوا اور دلچسپ ہے۔ چلکاش کا کردار اور قابل تعریف صفائی اور بہترین فن کاری سے پیش کیا گیا ہے اسی قسم کے دو اور افسانے ''مالوا'' اور ''میرا ہم سفر'' ہیں

اول الذکر افسانے میں مالوا عورت کے بھیس میں دوسرا چلکاش ہے، موخر الذکر داستان کردار نگاری کے نقطہ نظر سے غیر قانونی حیثیت رکھتی ہے ''میرا ہم سفر'' میں پرنس شارکو (جس کے ہمراہ داستان گو اوڈیسا سے ٹفلسن تک پیدل سفر کرتا ہے) کا کردار فی الحقیقت گورکی کی نادر تخلیق ہے۔

شارکو کے کردار میں مثالیت کا شمہ بھر موجود نہیں۔ گو یہ صاف ظاہر ہے کہ مصنف کی صناعانہ ہمدردی صرف اسی کے حق میں ہے۔

''میں مصروف تھا اس کی نقرئی آواز فضاء میں جو لہروں کے تھپیڑوں کی دھیمی اور دل نواز صدا سے معمور تھی آہستہ آہستہ حل ہوتی معلوم ہوتی تھی ۔۔۔۔۔ آگ تیزی سے جلنے لگی الاؤ سے شعلے سرخ اور زرد پھولوں کا ایک گلدستہ نظر آتے تھے کانپتے ہوئے سائے ہمارے آس پاس رقص کر رہے تھے ۔''

(از میرا ہم سفر)

موسم بہار کے سورج کی کرنیں بادلوں سے چھن چھن کر پانی کی سطح پر زرنگاری کا کام کر رہی تھیں ۔ ہوا کا جھونکا آنے پر نیچر انتہائی مسرت میں مسکرا دی ۔ بادلوں میں چھپا ہوا نیلگوں آسماں بھی مسکرا رہا تھا ۔ بادلوں کا گروہ جو فضاء میں غیر متحرک لٹک رہا تھا ، چمکیلے پانی کے اوپر کسی گہری سوچ میں غرق تھا گویا وہ آتش سورج سے بچنے کے لیے کوئی راستہ تلاش کر رہا تھا ۔ اس شوخ رنگ اور پر مسرت سورج سے جو طوفان کے ان نشانوں کا دشمن ہے

(از ۔۔۔۔ کلک پر)

گورکی کے بیشتر افسانوں میں اس قسم کی تفصیلات عام ہیں ''مالوا'' کا افتتاحیہ جملہ جو صرف دو لفظوں یعنی ''سمندر ہنس رہا تھا'' پر مشتمل ہے اس کے طرز بیان کی مخصوص مثال ہے ۔

1898ء میں گورکی کی حقیقت نگاری اس کی رومانیت پر غالب آ گئی ''جو کبھی انسان تھے'' اس پر شاہد ہے

اس افسانے اور ہر اس افسانے میں جو گورکی نے 1897ء کے بعد قلم بند کیا ، ایک ایسی خصوصیت نمایاں طور پر ظاہر ہے جو اس کی ادبی شہرت کے زوال کا

باعث ہے۔

ان خصوصیتوں میں سے جو گورکی کی شہرت کا باعث ہوئیں ایک اس کی نیچر کو بیان کرنے کا خاص انداز ہے ہم یہاں مثال کے طور پر اس کے افسانوں میں سے چند جملے پیش کرتے ہیں۔

لنگر گاہ کے گردوغبار میں جنوبی آسمان گدلا نظر آتا ہے۔ تاباں سورج سنہری مائل سمندر کو دھندلی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ جیسے اس نے خاکستری نقاب اوڑھ رکھی ہے۔ سورج کا عکس سمندر کی سطح پر چپوؤں کے تھپیڑوں، دخانی کشتیوں اور ترکی جہازوں کی نقل و حرکت کی وجہ سے نہیں پڑ رہا جو بندرگاہ پر ہل چلا رہے ہیں۔ یہاں سمندر کی آزاد لہریں سنگین دیواروں میں قید اور ان بھاری وزنوں کے نیچے دبی ہوئی ہیں جو ان کے سینے کو کچلتے ہیں جھاگ بن کر اپنی چھاتی کوٹتی ہیں اور شکایت کرتی ہیں

(از۔۔۔۔۔۔چاکاش)

''ہم نے الاؤ روشن کیا اور اس کے قریب لیٹ گئے رات بہت شاندار تھی گہرے سبز سمندر کی لہریں نیچے چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہمارے اوپر نیلگوں آسمان کی پر شکوہ خاموشی چھائی تھی۔ ہمارے گردو پیش عطر بیز درخت تھے۔ جھاڑیاں بڑی آہستگی سے جھوم رہی تھیں۔ چاند بلند ہو رہا تھا جس کے ساتھ درختوں کے نازک سایوں کا جھرمٹ پتھروں پر رینگ رہا تھا۔ قریب ہی کوئی خوش گلو پرندہ راگ الاپنے میں مصروف ہے'' یہ خصوصیت ''فلسفیانہ گفتگوؤں'' سے حد سے بڑھا ہوا پیار ہے جب تک اس نے اس عنصر سے پرہیز کیا وہ اپنی تعمیری قوت

کا ثبوت دیتا رہا جو دیگر افسانہ نگاروں میں بہت کم ملتی ہے گورکی کا وہ افسانہ جو اس کے ان تمام ادبی عیوب پر پردہ ڈال دیتا ہے ''چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ'' ہے جو اس نے 1899ء میں لکھا۔

(''پرنس ڈی ایس میرسکی'')

اس افسانے کا افتتاحی منظر بسکٹ بنانے کا ایک تنگ و تاریک کارخانہ ہے جہاں چھبیس مزدور روزانہ چودہ گھنٹے لگاتار مشقت کرتے ہیں۔ گورکی نے اس افسانے میں اپنے مخصوص انداز میں اس طرح شروع کر دیا ہے

''ہم تعداد میں چھبیس تھے چھبیس متحرک مشینیں ایک مرطوب کوٹھڑی میں مقید جہاں ہم صبح سے لے کر شام تک بسکٹوں کے لیے میدہ تیار کرتے''

ہماری زندان نما کوٹھڑی کی کھڑکیاں جن کا نصف آہنی چادر سے ڈھکا تھا اور شیشے گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے۔ اینٹوں اور کوڑے کرکٹ سے بھری ہوئی کھائی کی طرف کھلتی تھیں اس لیے سورج کی شعاعیں ہم تک نہ پہنچ سکتی تھیں۔

ہمارے آقا نے کھڑکیوں کا نصف حصہ اس لیے بند کر دیا تھا کہ ہمارے ہاتھ اس کی روٹی سے ایک لقمہ بھی غریبوں کے دینے کے لیے باہر نہ نکال سکیں یا ہم ان بھائیوں کی مدد نہ کر سکیں جو کام کی قلت کی وجہ سے فاقہ کشی کر رہے تھے۔

اس سنگین زندان کی چھت تلے جو دھوئیں کی سیاہی اور مکڑی کے جالے سے اٹی ہوئی تھی، ہم نہایت تکلیف دہ زندگی بسر کر رہے تھے اس چاردیواری میں جو کیچڑ اور میدے کے خمیر سے بھری ہوئی تھی، ہماری زندگی غم کی زندگی تھی۔

اس افسانے کے متعلق کچھ لکھنے سے پیشتر ہم گورکی کے پیش کردہ کرداروں پر

مختصر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں گورکی کی اپنی بیشتر تصانیف میں مزدوروں اور غربت زدہ کسانوں کو وہ انسان کی صورت میں پیش نہیں کرتا۔ یہ چیز یورپی ذہن کے لیے جو خوشگوار ماحول کا عادی ہے نئی عجیب حیثیت رکھتی ہو تو کوئی اچنبھا نہیں ہے مگر ہندوستان جو روس کے اس زمانے کی فضاء سے صد گونہ مماثلت رکھتا ہے، ان کرداروں کو جو کبھی انسان تھے، بخوبی سمجھتا ہے۔

جب گورکی چھبیس متحرک مشینیں لکھتا ہے تو ہمیں تعجب نہیں ہوتا ہم فوراً سمجھ لیتے ہیں کہ یہ لفظ ناکامی حزن وملال اور تاریک زندگی کا مطالعہ پیش کرر ہے ہیں۔

گورکی انسان کو اس شکل میں پیش نظر رکھتا ہے جیسا کہ وہ ہے۔اس کے کردار بھوک کو ''معاشی دباؤ'' نہیں کہتے وہ اسے صرف بھوک کہتے ہیں وہ امراء کو ''سرمایہ دارانہ عناصر کا اجتماع'' نہیں کہیں گے وہ انہیں صرف ''امراء'' کا نام دیں گے۔

گورکی کی یہ سادہ بیانی اور صاف گوئی اس کی تمام تصانیف میں موجو ہیں'' چھبیس متحرک مشینیں'' لکھتے وقت غالباً گورکی کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ نہایت سادہ اور مختصر الفاظ میں ان مظلوم مزدوروں کی صحیح تصویر ناظر کے سامنے پیش کرے اور یہ حقیقت ہے کہ'' چھبیس متحرک مشینیں'' پڑھتے وقت ان مزدوروں کی لامتناہی محبت ومشقت اور بے بسی کی ایک صاف تصویر کھنچ جاتی ہے۔

اس افسانے میں چھبیس زشت رو غلیظ مزدوروں کی ایک داستان بیان کی گئی ہے یہ سب ایک حسین لڑکی ٹینیا کی محبت میں گرفتار ہیں جو ہر روز ان سے بسکٹ لینے کے لیے آتی ہے اس لڑکی کا معصوم حسن ہی ایک ایسی شعاع ہے جس سے ان کی تاریک زندگی آشنا ہے۔

ان لوگوں کو جو سب کے سب غلیظ اور ان میں سے اکثر مریض ہیں، صرف ایک چیز منسلک کی ہوتی ہے یعنی ٹینیا سے ان کی جذباتی محبت گور کی بڑے صاف انداز میں ان کی اس اجتماعی محبت کی تشریح کرتا ہے۔

”ہم صنف نازک کے متعلق ایسے الفاظ میں گفتگو کیا کرتے تھے کہ بعض اوقات ہماری گفتگو ناگوار ہو جایا کرتی تھی اس سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ ہمارے خیالات عورتوں کے متعلق بہت برے تھے بلکہ وہ صنف جس کے متعلق ہم اظہار خیالات کرتے تھے، عورت کہلانے کی مستحق ہی نہیں، مگر ٹینیا کی شان میں ہمارے منہ سے کبھی گستاخ کلمہ نکلنے نہ پاتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ ہمارے پاس بہت کم ٹھہرتی تھی۔ وہ آسمان سے ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح روشنی دکھلا کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو جایا کرتی تھی یا اس کی وجہ اس کا حسن ہو کیونکہ ہر حسین چیز انسان کے دل میں اپنی وقعت پیدا کر دیتی ہے خواہ انسان غیر تربیت یافتہ ہی کیوں نہ ہو۔“

اس کے علاوہ ایک اور بھی وجہ تھی گو زندان نے ہم سب کو وحشی درندوں سے بد تر بنا دیا تھا مگر ہم پھر بھی انسان تھے اور بنی نوع انسان کی طرح ہم بھی کسی کی پرستش کیے بغیر زندہ نہ رہ سکتے تھے۔ ہمارے لیے اس کی ذات سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی شے نہ تھی اس لیے کہ بیسیوں انسانوں میں جو اس عمارت میں رہتے، ایک صرف وہی تھی جو ہماری پرواہ کیا کرتی تھی، سب سے بڑی وجہ یہی تھی۔

ہر روز اس کے لیے بسکٹ مہیا کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہ ایک نذرانہ ہوتا جو ہم ہر روز اپنے دیوتا کی قربان گاہ پر چڑھا دیتے تھے آہستہ آہستہ یہ رسم ایک مقدس

فرض ہو گئی جس کے ساتھ ہمارا اور اس کا رشتہ بھی باہم مضبوط ہو گیا ہم ٹینیا کو نصیحتیں بھی کیا کرتے یہی کہ وہ سردی میں گرم کپڑے استعمال کیا کرے اور سیڑھیوں پر سے احتیاط کے ساتھ سے گزرا کرے۔

مندرجہ بالا سطور سے مزدوروں کے کردار کا بچپن نمایاں طور پر ظاہر ہے اس بچپن سے گورکی کو یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ چھبیس غیر تربیت یافتہ مزدور کس غیر معمولی اخلاص اور سادگی سے ٹینیا کی محبت میں گرفتار تھے۔ دراصل ان مزدوروں کو اپنی تاریک زندگی میں صرف ایک ہی شعاع نظر آئی جس کا دامن انہوں نے پکڑ لیا۔ گو یہ لوگ غلیظ وحشی جاہل اور غیر تربیت یافتہ ہیں لیکن بایں ہمہ ان کے کھدرے قلوب پر ٹینیا کا وجود پورا اثر کرتا ہے، جسے وہ حقیقی حسن تصور کرتے ہیں۔

یہ لوگ خود اپنی غربت اور پراز مصائب زندگی کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں مگر یہ ان کا قصور نہیں کہ وہ مذہب اور آئیڈیل نہیں رکھتے وہ امید اور خواہش زندگی سے نا آشنا ہیں۔

''روسی مجلسی دائرے میں آراء و افکار کی نا استواری کا وجود'' جیسا کہ گورکی خود کہتا ہے ''مثالیت سے غفلت برتنے کا نتیجہ ہے''

ٹینیا چھبیس مزدوروں کی نظر میں ایک فرشتہ ہے اس کی عصمت، پاکیزگی اور نیکی نہ صرف ان کی گفتگوؤں کا موضوع ہوتی ہے بلکہ وہاں مزدوروں کی زندگی کو نئے معانی بخشتی ہے۔

بڑے ڈرامائی اور بے رحم انداز میں گورکی اپنے پیش نظر مقصد کو رفتہ رفتہ ظاہر

کرتا ہے چھبیس پجاری اپنی دیوی کی عصمت کا امتحان لیتے ہیں۔

ایک سپاہی جو اس کارخانے میں ان کی بہ نسبت اچھے کام پر نوکر ہے، ان سے دعوے کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ ٹینیا کو ہتھے چڑھا لے گا۔ مزدور سپاہی سے شرط تو لگا بیٹھتے ہیں مگر وہ ایک بے قراری مول لے لیتے ہیں۔

''اب ہمیں معلوم ہوا کہ ہم شیطان سے بازی لگا رہے ہیں جب ہم نے کیک بنانے والے سے سنا کہ سپاہی نے ٹینیا کا پیچھا کرنا شروع کر دیا ہے تو ہمیں سخت رنج پہنچا ہم اس رنج کو مٹانے کے لیے اس قدر محو تھے کہ ہمیں یہ معلوم تک نہ ہوا کہ آقا نے ہماری بے چینی اور اضطراب سے فائدہ اٹھا کر میدے میں تیس سیر کا اضافہ کر دیا ہے۔''

وہ حد درجہ مضطرب اور اس بات پر متاسف تھے کہ انہوں نے خواہ مخواہ ٹینیا کی عصمت کا امتحان کرنا چاہا لیکن با ایں ہمہ وہ اس روز کے منتظر تھے جب انہیں یہ معلوم ہو جانے والا تھا کہ وہ برتن جس میں انہوں نے اپنے دل رکھے ہوئے ہیں کتنا صاف اور کتنا بے لوث ہے۔

بد قسمتی سے ٹینیا با عصمت ثابت نہیں ہوتی اور وہ سپاہی کے ہتھے چڑھ جاتی ہے یہ داستان خوشگوار نہیں ہے لیکن گورکی کے قلم نے اسے غیر جانبدارانہ تفصیل سے بیان کیا ہے کہ یہ ہولناک حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ شعریت کی اس قدر زوردار رو سے لبریز ہے اس میں آزادی اور حسن کا اتنا معتدل ایمان و ایقان ہے اس کے علاوہ یہ داستان اس قدر صحت فن کاری سے بیان کی گئی ہے کہ ہم اسے گورکی کا شاہکار تسلیم کیے بغیر نہیں

رہ سکتے۔ یہ افسانہ اسے بلاشک وشبہ ہمارے بلند مرتبت کلاسکس کی صف اولین میں جگہ دلواتا ہے!

("پرنس ڈی ایس میرسکی")

گورکی اپنے افسانوں میں ارادتاً سوسائٹی کے پائیں طبقے کو زیرقلم رکھتا ہے اس کے کردار بالعموم اپنے مقاصد میں ناکام رہتے ہیں اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں جب وہ ایک آوارہ زندگی بسر کر رہا تھا، اسے اسی قسم کے واقعات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

اس کے افسانوں کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ چیز ہرگز فراموش نہ کرنی چاہیے کہ گورکی کی پرورش آغوش غربت میں ہوئی اور یہ کہ اسے پیٹ پالنے کی خاطر ایک طویل مدت تک ذلیل سے ذلیل مشقت کرنا پڑی۔

اس شخص کے بربط سے جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ایک تاریک فضا میں اور غیر تربیت یافتہ درشت مزدوروں میں بسر کیا، کس قسم کے نغمے بلند ہو سکے ہیں، گورکی ہمیں وہی کچھ پیش کرتا ہے جو اس کے احساس نے محسوس کیا، اور جو اس کی چشم فکر نے مشاہدہ کیا فرق صرف اتنا ہے کہ اس کا انداز بیان نہایت بے باک اور "ظالمانہ" ہے۔

جس طرح بائرن کا ترنم غیر صناعانہ، آتشیں اور آزاد ہے۔ ٹھیک اسی طرح گورکی بلند آواز، دیوانہ وار اور بے لگام ہے۔ جب وہ برہنہ پا گرسنہ شکم لوگوں کا گیت الاپتا ہے جو اپنی کاہلی پر نازاں ہیں۔ جو مفلس ہیں تو ہیں مگر نڈر جو اپنی پر از مصائب زندگی سے خوش ہیں گو مسرت کے وقت مغموم۔

گورکی کی صدا چیخوف کی شائستہ نرم و نازک اور منجھی ہوئی آواز نہیں، نہ وہ معلم اخلاق تالستائی کی کمزور زاہدانہ صدا ہے۔ وہ چنگھاڑتے ہوئے شیر کی گرج ہے چمکتی ہوئی بجلی کی کڑک ہے۔

ابتدائی قوت میں یہ آواز کسی ایسے حسان انسان کے دل میں اتر جانے والی چیخ ہے جس نے زندگی کے مصائب و آلام سہہ کر وہیں دنیا کے منہ پر نہایت بے پرواہی سے تے کردی ہو۔

وہ دنیا جو گورکی اپنے افسانے میں پیش کرتا ہے، ہماری دیکھی بھالی نہیں ہے اور وہ کردار جو اس کے افسانوں کے محرک ہیں، ہم ان سے نا آشنا ہیں مگر اس کے باوجود کہ ہم اس سرزمین کے جغرافیائی حالات کے سوا کچھ نہیں جانتے گورکی ہمیں ان گہرائیوں تک لے جاتا ہے اور روسی زندگی کی ایک ایسی قلمی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے جس سے عکسی تصاویر عاجز ہیں۔

گورکی کے افسانوں کے کردار عموماً کسان یا مزدور جماعت سے متعلق ہوتے ہیں۔

"وہ ایسے ناکارہ انسان ہیں جو دنیا کی شاہراہوں پر بھٹک رہے ہیں۔ ان کے ذہن غلاموں ایسے ذہن ہیں کسی آقا یا زندگی کے ایسے قانون کی تلاش جس کی وہ آنکھیں بند کئے اطاعت کرسکیں، ان کا واحد منتہائے مقصد ہوتا ہے۔ ان میں تشخص اور کریکٹر کی استواری کا فقدان ہے۔ اگر ان میں الیا لیونیف ایسی ہوش مندی اور ذہانت اور اپنی کوششوں سے اپنی حالت کو بہتر بنانے کی صلاحیت ہے تو ان میں نظام خودی کا عنصر بہت قلیل مقدار میں ہوتا ہے جو انجام کار ان کی زندگی کو

مغموم بنا دیتا ہے۔ان تمام امور کے ہوتے ہوئے ان کا خالق یعنی گورکی ان پر ایک غیر معمولی اعتقادرکھتا ہے۔''

(''مس گروسکاٹ'')

گورکی کے پروردہ غربت ہیرو''تشخص'' سے بے گانہ ہوں۔وہ زندگی کی شاہراہوں پر بھٹکے ہوئے ناکارہ انسان ہوں مگران میں ایک نمایاں خصوصیت ضرور ہے جس کی مثال روسی ادب میں اورکہیں نہیں ملتی۔وہ دوستوو سکی اور تو گنیف کے پیش کردہ کرداروں کی طرح اپنی تیرہ بختی کا گلہ نہیں کرتے''روسی ہیرو'' گورکی اپنے کسی افسانے میں لکھتا ہے''ہمیشہ جاہل اور سادہ لوح ہوتا ہےوہ ہمیشہ کسی ایسی چیز کوسمجھنے کی کوشش کرتا ہے جس کووہ سمجھ نہیں سکتا۔وہ ہمیشہ ملول رہتا ہے۔''

''ان لوگوں کی زندگی جہالت کا مرقع ہے۔انہوں نے غلامی کی فضاء میں پرورش پائی ہےلیکن وہ یقیناً آزادی کی لذت محسوس کرتے ہیں۔''

''مجھے اپنی بے خانماں اورآوارہ زندگی پسند ہے۔بیشتر اوقات سردی نے میری رگوں میں خون منجمد کیا ہے۔میں نے فاقے کھینچے ہیں لیکن آزادی عظیم الشان ہے۔''یہ ہیں وہ الفاظ جوہم گورکی کے ایک کردار کے منہ سے سنتے ہیں۔

دیہات اورشہر کی پرسکون زندگی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔گورکی کے تقریباً ہر افسانے میں ہم اس کے''خانہ بدوش'' اورحریت پسند کردارکوکسی آئیڈیل کا دامن تھامے دیکھتے ہیں۔یہ خصوصیت بلاشبہ گورکی کا اپنا عکس ہے۔

اس کے کردارعموماًسوسائٹی کے مصنوعی نظام سے رہائی حاصل کرکے نیچر کے

وسیع کارخانے میں بھاگ آتے ہیں۔ جہاں انہیں سکون قلب اور اطمینان خاطر نصیب ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہم نیچر کو اس کے افکار کے دوش بدوش اور اس کے کرداروں کی انسانی حیات میں موجود دیکھتے ہیں۔

انسان اور نیچر میں صوفیانہ قربت گورکی کی ہر تصنیف میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اگر ہم فرداً فرداً اس کے ہر افسانے اور ہر ناول سے اس عنصر کی مثال پیش کرنا چاہیں تو اس کے لیے یقیناً ایک علیحدہ مفصل مقالے کی ضرورت ہو گی۔ طوالت کے خوف سے ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

''مالوا'' نامی افسانے میں ہم ایک ایسی لڑکی دیکھتے ہیں جو زندگی سے نہ صرف نفرت کا اظہار کرتی ہے بلکہ اس سے سخت اکتا گئی ہے۔ وہ نیچر کے دام الفت میں گرفتار ہے وہ تمام مرد جو اس سے ملتے ہیں اس کی دلچسپی کا سامان مہیا نہیں کر سکتے۔

اس افسانے کا ایک کردار ان الفاظ میں شہری زندگی سے اپنی انتہائی نفرت کا اظہار کرتا ہے۔

''لوگوں نے شہر اور گھر تعمیر کر رکھے ہیں۔ ان میں بھیڑوں کے گلے کی طرح بسر اوقات کرتے ہیں، زمین کو پلید کرتے ہیں، حبس دم ہو رہے ہیں، ایک دوسرے کو دبا رہے ہیں۔۔۔ عجیب مضحکہ خیز زندگی ہے۔''

''میدانوں میں'' نامی افسانے میں گورکی کا خانہ بدوش کردار رات کے وقت ننگی زمین پر لیٹا اپنے دوست سے یہ کہتا ہے۔

''یہ زندگی خواہ فاقوں سے لبریز ہے۔۔۔ مگر آزاد ہے۔۔۔۔۔ اپنے آقا

خود آپ ہو۔۔۔۔۔۔اگر اپنا سر بھی کاٹنا چاہو تو کوئی روکنے والا نہیں۔۔۔۔۔ان دنوں فاقہ کشی نے مجھے سرکش بنا دیا تھا۔۔۔۔مگر میں اب یہاں لیٹا آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ستارے میری طرف دیکھ دیکھ کر آنکھیں جھپک رہے ہیں۔۔۔۔۔معلوم ہوتا ہے۔وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں سٹیپن کچھ فکر نہ کرو، جاؤ دنیا کی سیاحت کرو مگر دیکھو کسی کی غلامی قبول نہ کرنا۔۔۔۔دل کس قدر مسرور ہے۔''

گورکی کے خانہ بدوش کردار با اخلاص اور بے ریا ہوتے ہیں۔وہ زبان سے وہی کچھ نکالتے ہیں جسے وہ اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ان میں تہذیب یافتہ افراد ایسی بناوٹ اور مداہنت نہیں ہوتی۔وہ زندگی کو اس شکل میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں جیسی وہ اصلاً ہوتی ہے، بعض اوقات وہ ظلم کرنے پر بھی اتر آتے ہیں مگر کبھی کبھار۔

ایک اور افسانے میں ہم سوسائٹی کا ایک ایسا کردار دیکھتے ہیں جو کسی تاجر کو قتل کرنے جا رہا ہے۔وہ اپنی آنکھوں سے ایک لڑکی کو دریا میں ڈوبتے دیکھتا ہے مگر اسے صرف اس لیے نہیں بچاتا کہ اسے تاجر کو قتل کرنا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس چلکاش عادی چور، شرابی اور آوارہ مزاج اپنے ساتھی گیوریلا سے جو ایک کمزور دل دیہاتی ہے، نہایت رحم دلی اور فیاضی کا ثبوت پیش کرتا ہے، اسے وہ تمام روپیہ دے دیتا ہے جو اس نے چوری سے پیدا کیا ہوتا ہے۔۔۔۔

ہم گورکی کے افسانوی کرداروں کی نوعیت پر مختصر تبصرہ کر چکے ہیں، آگے چل کر ہم اس کے ویل افسانوں (ناولوں) کے کرداروں پر اس روشنی میں تبصرہ کریں

گے گذشتہ اوراق میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ گورکی نے فلسفیانہ گفتگوؤں کو اپنے افسانوں میں داخل کرنا شروع کر دیا۔ جس سے اس کی ادبی شہرت کم ہونے لگی۔

1898ء میں اس نے ایک افسانہ بعنوان ''شریر لڑکی'' سپرد قلم کیا، اس میں اس نے تعلیم یافتہ لوگوں کی عکاسی کرنا چاہی مگر اس میں ناکام رہا۔

ہمیں گورکی کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے صرف ایسا انشاء پرداز بننا ناپسند تھا جس کا خمیر طبقہ ادنی سے اٹھایا گیا۔ وہ فی الحقیقت لیڈر اور معلم کی حیثیت میں خود کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ اس خواہش کی جھلکیاں ان ڈراموں اور ناولوں میں صاف طور پر نمایاں ہیں جو اس نے 1899ء اور 1921ء کے درمیانی زمانے میں تصنیف کیے۔۔۔۔۔۔ اس زمانے کے قابل ذکر ناول یہ ہیں۔

1 فوما گورڈیوف

2 وہ تینوں

3 ماتا

4 ایک

''فوما گورڈیوف'' عظیم الشان تصنیف ہے اس میں نہ صرف روس کی تمام پہنائیاں مرکوز ہیں بلکہ وسعت زندگی مستور ہے۔

جس طرح کارخانوں اور منڈیوں کی اس دنیا میں اور عبور و مرور اور تجارت کے اس زمانہ میں ہر جگہ ایک غضب ناک لوگ اٹھتے ہیں جو ساز حیات کے تاروں میں اس کی صحیح تڑپ کی جستجو کرتے ہیں اور زندگی کی حقیقی تپش سے آشنا ہونا چاہتے ہیں، ٹھیک اسی طرح فوما گورڈیوف روس کی سرخ فضاء میں ابھرتا ہے اور اسی سوال

کا جواب چاہتا ہے۔

اس کتاب میں روسی تجزیہ خودی اور دقیق النظری گورکی ہی کی پیدا کردہ ہے، اپنے دیگر روسی بھائیوں کی طرح اس کے افکار بھی غیرت منداور پر از جوش احتجاج کے حامل ہیں مگر اس احتجاج سے ایک مقصد وابستہ ہے۔وہ صرف اس لیے اپنا قلم اٹھاتا ہے کہ اسے گوش انسانیت تک کچھ پہنچانا مقصود ہے۔۔۔۔۔اس کے مضطرب بربط فکر سے نرم و نازک راگنیاں بلند نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے ساز سے صرف حقیقت کا نغمہ نکالتا ہے۔۔۔۔دل سوز، خوف ناک اور بے باک۔

یہ غلطی ہوگی، اگر ہم خیال کریں کہ امراء کی جماعت اس خوف زدہ انسان فوما گورڈیوف کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔۔۔۔ان موٹی کھالوں پر گورڈیوف کی چبھوئی ہوئی سوئیاں کچھ اثر نہیں کرسکتیں۔

انہیں یہ امر نہایت تعجب خیز معلوم ہوگا کہ فوما گورڈیوف نے جسے دولت کی فراوانی اور صحت کی تازگی میسر تھی، اپنے ہم اقتدار لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنا کیوں پسند نہ کیا۔۔۔۔ان لوگوں کی طرح جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ کرسیوں کے ساتھ چپک کر تبادلے کے بدلتے ہوئے سودوں کی دھن میں مست اور اپنے حریف ہم پیشہ تاجروں کو کچل ڈالنے کی تدبیر سوچنے میں محو رہتے ہیں۔

فوما گورڈیوف اسی قسم کے ایک تاجر کا لڑکا ہے مگر اس میں بیداری کی چنگاری پیدا ہوجاتی ہے۔وہ اپنے گردوپیش کی دنیا سے سخت متنفر ہوجاتا ہے۔

''آہ! فوما نہایت گستاخ لہجے میں دریافت کرتا ہے۔اگر زر پرستی کے ان تمام برسوں کا انجام مرجانا اور رفنا ہوجانا ہے تو فرمائیے سیم وزر کی اس ہوس سے فائدہ۔''

جس سرمایہ دار سے فوما نے یہ ''گستاخانہ'' سوال کیا، وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھا، خود میا کن (فوما کا روحانی باپ) بھی اپنے روحانی بیٹے کو نہ سمجھ سکا۔۔۔۔۔

''آپ فخر کیوں کرتے ہیں'' ایک روز فوما، میا کن پر برس پڑتا ہے ''آخر آپ اترا کس چیز پر رہے ہیں'' ۔۔۔۔۔۔۔۔ ''آپ کا لڑکا بتایئے وہ کہاں ہے'' ۔۔۔۔ ''آپ کی لڑکی، فرمایئے وہ کیا ہوئی'' ۔۔۔۔۔۔۔ ''زندگی کے ناظم صاحب، مانا کہ آپ چالاک ہیں آپ کے علم میں سبھی کچھ ہے مگر ذرا یہ تو بتایئے۔ آپ کس لئے جیتے ہیں؟ روپیہ کیوں اکٹھا کرتے ہیں؟ کیا آپ کو مرنا نہیں ہے؟ ۔۔۔۔۔ تو پھر''

میا کن کے پاس ان تمام سوالوں کا جواب نہیں ہوتا مگر وہ پھر بھی اپنی ہٹ پر قائم رہتا ہے۔

فوما گورڈیوف کے سوالات غیر متوقع اور تیز ہوتے ہیں۔ یہ چیز اس کے مضطرب قلب کی آئینہ دار ہے۔ دراصل وہ اپنے دل میں ایک عجیب قسم کی بے چینی محسوس کرتا ہے جب وہ اپنے ماحول میں ہر چیز کو انسانیت کش پاتا ہے۔ یہ اضطراب یہ بے قراری اس کی زبان پر چند پریشان مگر آتشیں الفاظ لاتی ہے، جو وہ ہر اس شخص کے منہ پر کہہ ڈالتا ہے جو اس سے ہم کلام ہو۔

فوما گورڈیوف اس ماحول سے باغی ہو جاتا ہے جو سراسر دولت کمانے کی خود غرض خواہشات اور نفس دوستیوں سے لبریز ہے۔ اگناٹ (فوما کا باپ) میا کن (فوما کا روحانی باپ) اور اسی قسم کے دیگر کامیاب تاجروں کے طلائی سکوں کی تعریف میں گائے ہوئے گیت اس پر اثر انداز نہیں ہوتے ۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ

لوگ کیوں گائیں، جب پاس ہی دوسرے رو رہے ہیں۔ یہ زندگی ایک کابوس ہے!۔۔۔۔۔۔۔خواب جس کا کوئی مطلب نہیں! میں پوچھتا ہوں اس کے معنی کیا ہیں؟۔۔۔۔۔اس کے نیچے کیا ہے؟

اگناٹ،فوما کو جوابھی کم سن لڑکا ہوتا ہے، سمجھاتا ہے۔

''اگر تم غرباء کو ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھتے ہو تو یہ ایک نہایت مبارک جذبہ ہے لیکن تمہیں اپنی اس ہمدردی کے ساتھ انصاف برتنا چاہیے اولاً تمہارے پیش نظر یہ ہونا چاہیے کہ وہ شخص جسے تم ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہو، اس کا مستحق بھی ہے یا نہیں۔ اگر یہ شخص اہلیتوں اور طاقت کا مالک ہے اور تمہیں اس سے فائدہ اٹھانے کی امید ہوسکتی ہے تو تم بخوشی اس کی مدد کرو لیکن اگر وہ کمزور ہو۔کام کرنے کے نا قابل ہے تو اس پر تھوک دو اور اپنے سے غرض رکھو۔ یہ بھی واضح رہے کہ وہ شخص جو ہر چیز کے متعلق شکوے شکایت کرتا رہے اور ہر وقت اپنا رونا روتا رہے، ایک پھوٹی کوڑی کا حق دار نہیں ہے۔۔۔۔۔ایسے شخص کی مدد کرنا بے کار ہے۔''

باپ کی ان زرگرانہ اور تاجرانہ نصیحتوں کے باوجود فوما اپنی دھن میں مست رہا۔ان چند و نصائح نے احساس بیداری کی اس چنگاری کو ہوا دے کر شعلوں میں تبدیل کر دیا جو اس کے نوخیز دماغ میں سلگ رہی تھی۔

میاکن فوما کا روحانی باپ الگ اپنا زاہدانہ راگ الاپتا ہے وہ یہ وعظ کرتا ہے۔۔۔۔۔

''میرے عزیز! معلوم ہے بھکاری کیا ہوتا ہے؟۔۔۔۔۔بھکاری وہ انسان

ہے جسے قسمت مجبور کرتی ہے کہ وہ ہمیں حضرت عیسیٰ کی یاد دلائے، وہ عیسیٰ کا بھائی ہے۔۔۔۔خدا کا گجر جو ہمارے خوابیدہ ضمیر کو بیدار کرنے کے لیے فضاء میں گونجتا ہے۔وہ کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو کر گاتا ہے۔عیسیٰ کی راہ میں۔۔۔۔'' اس صدا سے وہ ہمیں مقدس پیغمبر کے احکام کی یاددہانی کراتا ہے کہ ہمیں غرباء کی مدد کرنی چاہیے مگر مقام تاسف ہے کہ فی زمانہ لوگ اپنی زندگی کچھ اس طریق پر گزار رہے ہیں کہ اس کی تعمیل محال ہے۔۔۔۔۔اب ہم ان فقیروں اور گداگروں کو ایسی چاردیواری میں قید کرنا چاہتے ہیں کہ وہاں سے نکل کر وہ ہمارے ضمیر کو نیک کام کرنے کے لیے بیدار نہ کر سکیں۔

فوما کے دماغ پر ان تمام گفتگوؤں کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔اس کے منہ سے نکلی ہوئی چیخ ان خشک و تر نصیحتوں کی طالب نہیں ہوتی۔فوما روشنی چاہتا ہے اور چونکہ روشنی ڈھونڈنے کی یہ خواہش اسے ایک لمحہ چین نہیں لینے دیتی اس لیے وہ اپنے بغاوت سے بھرے ہوئے سینے کو لے کر اٹھتا ہے اور زندگی کے حقیقی معانی کی جستجو کرتا ہے۔

''اس کے تمام خیالات اس غلیظ جماعت پر مرکوز ہو گئے جو صبح سے شام تک گدھوں ایسی مشقت کرتی تھی۔۔۔۔یہ منظر اس کے لیے سخت تعجب افزاء تھا۔۔۔۔اسے حیرت تھی کہ وہ زندہ کیوں ہیں؟ انہیں اپنے تاریک ماحول میں ایسی کون سی شعاع نظر آتی ہے جس کے سہارے وہ جی رہے ہیں؟۔۔۔۔ان کا کام صرف اپنے غلیظ فرائض کو سرانجام دینا اور کڑی سے کڑی مشقت کرنا تھا ان کے بدن پر چیتھڑے لٹک رہے ہوتے۔وہ سوکھی روٹی پر گزر اوقات کرتے اور ان

میں سے اکثر شراب کے عادی ہوتے۔۔۔۔ اگر کسی کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر گئی ہوتی تو اس ضعیف العمری کے باوجود وہ نوجوانوں کے دوش بدوش مشقت میں مصروف نظر آتا۔۔۔۔۔ یہ تمام مزدور فوما کی نظر میں کیڑوں کا ایک ڈھیر تھا جو زمین پر کچھ کھانے کے لیے رینگ رہے ہوں۔''

رفتہ رفتہ فوما زندگی کا ایک مجسم استفہام بن جاتا ہے۔ وہ زندہ رہنے سے منکر ہو جاتا ہے جب تک اسے زندگی کا اصل مطلب سمجھ نہیں آجائے۔۔۔۔۔

''میں کیوں زندہ رہوں۔ جب مجھے پتہ ہی نہیں ہے کہ اس زندگی کا مطلب کیا ہے؟'' وہ ایک بار مایا کن سے دفعتاً سوال کرتا ہے جو اسے اپنے مرحوم باپ کا کاروبار سنبھالنے کے لیے کہہ رہا ہوتا ہے۔

دراصل فوما کی عقل اس عقدے کو حل کرنے سے قاصر ہوتی ہے کہ لوگ صرف اس کی واحد ذات کے لیے کیوں مشقت برداشت کریں اور اس کے اور اس کی دولت کے غلام بنیں؟

''انسان کے لیے مشقت ہی میں تمام نعمتیں نہیں دھری ہیں۔۔۔۔۔ کام کے ساتھ اس عذر کو وابستہ کرنا غلطی ہے۔ بعض افراد ایسے بھی ہیں جن کے ہاتھ محنت و مشقت سے ناآشنا ہیں لیکن بایں ہمہ وہ نہایت شاندار زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ۔۔۔۔؟ میرے پاس پر از عیش زندگی بسر کرنے کا کیا عذر ہے؟ وہ لوگ جو دوسروں سے اپنے احکام منواتے ہیں، آرام دہ زندگی بسر کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں؟۔۔۔۔ وہ کس لیے زندہ رہتے ہیں؟۔۔۔۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ زندگی شروع کرنے سے پیشتر قطعی طور پر معلوم کر لے کہ

وہ کس مقصد کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔۔کیا یہ ممکن ہے کہ زندگی کا مقصد مشقت، روپیہ کی فراہمی، مکانوں کی تعمیر، بچوں کا پیدا کرنا اور مر جانا ہے؟ ہر گز نہیں۔۔۔مقصد حیات کچھ اور ہے۔۔۔۔انسان پیدا ہوتا ہے کچھ مدت کے لیے زندہ رہتا ہے اور مر جاتا ہے۔۔۔۔۔کتنی مضحکہ خیز بات ہے؟ ہم سب کو یہ سوچنا سزا وار ہے کہ زندگی کس لیے عطاء کی گئی ہے۔۔۔۔۔خدا کی قسم۔۔۔۔اس کا صحیح جواب سوچنا ہر انسان کا فرض ہے۔ ہماری یہ زندگی فضول ہے، لایعنی۔۔۔۔۔بے ہودہ ہے۔ بکواس ہے! کچھ امیر ہیں جن کے پاس اس قدر دولت ہے کہ ہزاروں انسانوں کو اپنا غلام بنا سکتے ہیں۔۔۔۔۔وہ بالکل ہاتھ پیر نہیں ہلاتے۔ دوسری طرف ایسے لوگ ہیں جو تمام عمر مشقت میں اپنی کمریں دوہری کر لیتے ہیں مگر ان کی جیبیں تانبے کے ایک پیسے سے نا آشنا رہتی ہیں۔''

فوما کو جس طرف روشنی کی مدھم شعاع بھی نظر آتی ہے، وہ ادھر دوڑ پڑتا ہے اسے معلوم ہے کہ ہر چیز سقیم ہے مگر وہ اس سقم کو دور کرنے کی قدرت خود میں نہیں پاتا۔ وہ صرف حملہ کرنا اور تباہ کرنا جانتا ہے۔ وہ تاجروں کی بہرہ مند ہستیوں سے سوال کرتا ہے۔

''یہ زندگی تمہاری تخلیق کردہ نہیں۔۔۔۔۔۔تم لوگوں نے اس دنیا کو گندگی کا ایک عمیق گڑھا بنا رکھا ہے! تمہارے افعال غلاظت افشانی کرتے ہیں۔ کیا تم اپنے پہلو میں ضمیر رکھتے ہیں؟۔۔۔۔۔۔کیا خدا کی یاد تمہارے دلوں میں موجود ہے؟۔۔۔۔۔پانچ دمڑی کا پیسہ یہ ہے تمہارا معبود!!''

اور پھر عیسی کی روحانی آواز کی طرح وہ ان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے------

''اے زر دارو--------ان قہروں پر آنسو بہاؤ جو عنقریب تم پر برپا ہونے والے ہیں۔خون چوسنے والے پسوؤ! تم دوسروں کی طاقت کے بل بوتے پر جیتے ہو۔تم مستعار ہاتھوں سے کام کرتے ہو------تم تباہ ہو جاؤ گے-----تمہیں ہر چیز کا حساب دینا ہو گا----آنسو کے ننھے قطرے تک کا!''

وہ اپنے گردوپیش کی تاریکی سے متعجب ہو کر سوال کرتا ہے اور سوال کیے جاتا ہے کہ اسے اس اسرار کا کوئی حل مل سکے مگر بے سود۔ چنانچہ وہ زندگی کی بھول بھلیوں میں ٹھوکریں کھاتا ،موت کا ناچ ناچتا، کسی موہوم چیز کی تلاش میں سرگرداں اور زندگی کے صحیح مقصد کی جستجو میں حیران رہتا ہے اور انجام کار پاگل ہو جاتا ہے۔

یہ کتاب دل کش نہیں ہے مگر عبارت ہے زندگی کے استفہام سے----عمومی زندگی سے نہیں بلکہ آج کل کی معاشری زندگی سے-------یہ کتاب پر لطف نہیں۔اس لیے کہ موجودہ معاشرت پر لطف نہیں ہے۔اس کتاب کا مطالعہ کے بعد قاری دنیا کی آبلہ فریبیوں اور دروغ کاریوں سے آشنا ہو کر زندگی سے متنفر ہو جاتا ہے---مگر بایں ہمہ یہ تصنیف صحت بخش ہے۔اس کے اوراق میں معاشری مرض کی ایسی حکیمانہ تشریح کی گئی ہے اور معائب کا تاروپود اس بے دردی سے بکھیرا گیا ہے کہ اس کا وجود سوائے انسانی فلاح کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

1905ء کے انقلاب کے بعد گورکی کی جوئے فکر ایک تندوتیز سمندر کی

صورت اختیار کر لیتی ہے۔وہ اب دنیا کا نہایت متانت سے مطالعہ کرنے کے بعد نظام حیات کی پہنائیوں تک پہنچتا ہے کہ اپنے پیش نظر مقاصد کی تخلیق و تولید کرے۔

ان کتابوں میں جو گورکی نے اس زمانے میں سپرد قلم کیں ''ماتا'' سب سے مشہور ہے یہ کتاب جو روسی انقلاب کے زیر اثر لکھی گئی انقلابی تحریک کی نہایت واضح تصاویر پیش کرتی ہے۔ہم یہاں اس پر مختصر تبصرہ کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کے آخری نصف میں روس کو ایک نمایاں جگہ حاصل ہے۔

جس طرح زمین کا یہ خطہ نقشہ عالم پر پھیلا ہوا ہے۔ٹھیک اسی طرح ملت روس کی جدوجہد آزادی کے خونی واقعات تاریخ عالم کے بیشتر اوراق گھیرے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔شاید ہی چشم فلک نے ایسے لرزہ خیز وقائع و مناظر، دل ہلا دینے والے ستم و جور، خوف ناک جرائم اور جنگ آزادی میں خون کے ایسے دریا بہتے دیکھے ہوں گے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہم انسانی زندگی کو ایک ڈرامہ خیال کرتے ہیں تو اس عظیم ڈرامے کی اور کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی جو روس کی سرخ سٹیج پر کھیلا گیا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہم بہادری کے ان کارناموں، قربانیوں اور شجاعتوں سے متاثر ہوتے ہیں جو کسی نیک مقصد کے لیے عمل میں لائی گئی ہیں تو روس کی اس آزادی کی کشمکش اور کون مد مقابل ٹھہر سکتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہم ان جوانمردوں، بزرگوں، ولیوں اور شہیدوں کا شمار کرنے کے بعد جنہوں نے قصر آزادی کی تعمیر میں حصہ لیا، کسی قوم کی عظمت کا

اندازہ لگا سکتے ہیں تو ملت احمر کے ان برہنہ پا مرد اور عورتوں کی مثال موجود ہے۔ جنھوں نے ایوان جمہوریت کی تاسیس کے لیے اپنے خون اور گوشت پوست کو پیش کر دیا۔

روسی غلام کو اپنی سعادت اور اس دیوی کی پوجا کرنا اپنا فرض واحد خیال کرتے تھے۔

وہ اپنے جان و مال کو زار کی ملک سمجھتے تھے
بادشاہ کا ہر لفظ لفظ الٰہی تھا۔ اس کے قلم کی ہر جنبش فرمان ربانی!
زار روسیوں کے لیے خدا کا سایہ اور باپ تھا
اس کے ڈھائے ہوئے مظالم عوام کے لیے شہد کی طرح شیریں تھے۔
روسی قوم کسی تاریک خواب میں مدہوش پڑی تھی۔
آخرش کیا ہوا؟

کورنش بجا لانے والے ہاتھ ستم وارانہ اٹھے اور زار کو اس کے تخت سے نیچے گھسیٹنے لگے۔

ٹھوکریں کھائے ہوئے سینے ابھرے اور زار کی مطلق العنانی کے مقابل آہنی دیوار بن گئے۔۔۔۔

بادشاہ کے ڈھائے ہوئے تلخ مصائب کو عوام نے اسی کے منہ پر تھوکنا شروع کر دیا!

جرس انقلاب کا بے پناہ شور بلند ہوا اور قانون کی بلند آہنگی کو ہمیشہ کے لیے اپنی آغوش میں سمیٹنا شروع کر دیا۔

پھر اسی خوشگوار بادنسیم کے راندے ہوئے لوگوں پر جنت ارضی کی تمام دروازے نیم وا ہونے لگے۔

''ماتا'' اسی زمانے کی ایک داستان ہے، جب جنگ آزادی کی تڑپ ہر نوجوان کے قلب کو گرمائے ہوئے تھی۔ اس خونچکاں کہانی میں ملت احمر کے مایہ ناز مفکر گورکی نے اس خونی جدوجہد کی اس کامیابی و فن کاری سے تصاویر کھینچی ہیں کہ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ واقعہ ہو بہو رقص کرتا نظر آتا ہے۔

دراصل روس کے یہاں ہر چیز ایک عظیم پیمانے پر ہے۔ اس کے افسانہ نگاروں کی کہانیاں مینڈک کے پاؤں کی ان بڑی تصاویر کی مانند ہوتی ہیں جو کسی طبی سکول کے کمرے میں پردہ سیمیں پر دکھلائی جا رہی ہوں۔ ان تصاویر کے ذریعے سے ہم رگوں میں دوڑتا ہوا خون، حرکت کوئی نسیں اور پر اسرار نظام نظام عصبی کو جو اس سے پیشتر ہماری آنکھوں سے نہاں تھا، بخوبی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح وہ جذبات و حسیات جو اس سے قبل صرف ہماری سماعت تک محدود تھے۔ گورکی کے بیان کردہ واقعات سے ہم پر روشن ہو جاتے ہیں۔

مے خانوں میں خفیہ ملاقاتوں، سرگوشیوں میں تباہ کن سازشوں کی تیاری، رات کی سیاہی میں خنجر کی جھلک، منڈلاتے ہوئے جاسوس، مصائب و نوائب کے تیروں سے چھلتے دل، گلی کوچوں میں صدائے انتقام، خون کی ندیاں، غیر منتہم غم و اندوہ، لامتناہی سیل عشق اور برہنہ پا و گرسنہ شکم انسانوں کی خون منجمد کر دینے والی برف باری میں حسرت ناک اموات ہماری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتی نظر آتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

روسی تند خو بھی ہیں اور نرم مزاج بھی، ظالم بھی ہیں اور رحم دل بھی، نفرت بھی کرتے ہیں اور پیار بھی، جاہل بھی ہیں اور عالم بھی، بے وقوف بھی ہیں اور چالاک بھی، بادشاہت کے حامی بھی ہیں اور آزادی کے دلدادہ بھی، غیر حساس بھی ہیں اور حساس بھی، بھولے بھی ہیں اور زمانہ ساز بھی، سب سے زیادہ جذباتی بھی ہیں مگر سب سے زیادہ دبے ہوئے بھی ہیں۔ ان سب کے علاوہ ان میں محسوس کرنے کا مادہ اپنی ہمسایہ قوموں سے کہیں زیادہ ہے اور غالباً یہی ان کے تصویر نما افکار کا سب سے بڑا راز ہے۔ جسے دیکھ کر دنیا آنکھیں جھپکتی رہ گئی ہے۔ افسانہ نگاری میں ان کا تقابل فن کسی اور دماغ کے بس کا نہیں ہے۔

روس کے ان تمام مفکروں اور ان کی تمام تصانیف میں سے جو انسانی قلوب پر اثر انداز ہوتی ہیں، بلا شک وشبہ گورکی سب سے بڑا مفکر اور اس کا شاہکار ''ماتا'' سب سے اعلیٰ تصنیف ہے۔

کوئی دوسرا انشاء پرداز یا افسانہ نگار ان واقعات کا صرف ہلکا سا خاکہ کھینچ کر بس کر دیتا ہے۔ جو فضاء میں ٹھوس چٹانوں کی مانند کھڑے تھے مگر گورکی کا قلم اس ٹھوس موضوع پر شروع سے لے کر آخر تک ایک ہی روانی سے چلا ہے اور اس دوران میں اس کی فن کاری میں کسی مقام پر بھی لغزش نہیں آنے پائی۔

زندگی کے اس پیش نظر ٹکڑے کو جس پر وہ اپنے لاثانی افسانے کی چاردیواری بلند کرنا چاہتا ہے، وہ کسی ماہر معمار کی طرح ہر پہلو سے بغور دیکھتا ہے تاکہ عمارت میں کوئی خامی نہ رہ جائے۔

گورکی یہ افسانہ لکھنے سے پیشتر چاروں طرف نگاہ دوڑا کر حقیر سے حقیر

واقعات کو بھی فراہم کر لیتا ہے کہ شاید وہ کسی جگہ کے لیے موزوں ہو۔شوربے کی تلخی، مرد کے بوٹ سے چمٹی ہوئی برف، کسی عورت کے بالوں میں اٹکے ہوئے برف کے گالے، لکڑیاں کاٹتا ہوا لکڑ ہارا، دہقانوں کی بھدی گفتگو، پیانو کے چھیڑے ہوئے نغمے، سنتری کی آنکھوں میں حیوانی جھلک، بازاروں میں اڑتی ہوئی کیچڑ اور کارخانوں کے بلند دود کشوں کا سیاہ دھواں۔ان تمام کم حقیقت اور مہم چیزوں کے اجتماع سے اس کا دست فکر ایسے مناظر پیش کرتا ہے جو اپنے اندر اثر پیدا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

گورکی کے یہ افکار ہمارے دل و دماغ کو چیرتے ہوئے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔یہ قلمی تصاویر جو اس نے ایک مرقع میں جا بجا چپکا دی ہیں، احساسات کی ان عمیق گہرائیوں میں لے جاتی ہیں، جن سے رومانی افسانے اور عکسی تصاویر عاجز ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ہمارے اذہان میں حقیقی زندگی کا انجکشن کر دیا ہے۔یہ جدا امر ہے کہ ہم اس کی بیان کردہ داستان کے محل وقوع کی سرزمین سے واقف نہیں مگر اس نے ہمارے سامنے روسی زندگی ایسے صاف و عیاں طور پر پیش کی ہے کہ اب ہمیں مزید مطالعہ یا مشاہدہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

گورکی کا فقید المثال اور پر اسرار فن اسی میں مضمر ہے کہ وہ اپنے قلم کی سیدھی سادھی جنبشوں سے ہم پر دہقان کی جھونپڑی کا منظر، سرما کی خون منجمد کر دینے والی سردی اور گاؤں کے نیم برہنہ لوگوں کی ٹھہرے پانی ایسی زندگی اور کھنڈروں میں انسانی ارواح کی کشمکش کی صحیح کیفیت طاری کر دیتا ہے۔۔۔۔اس کے علاوہ

آرٹ کا مقصد کامیابی ہو بھی کیا سکتا ہے!

روس کے تمام ڈراموں میں جو عمومی زندگی سے متعلق ہیں، یہ تمثیل سب سے نمایاں رتبہ رکھتی ہے جس میں پرانے نظام کو پاش پاش کرنے کے لیے ایک طویل جنگ مدت تک کروٹیں لیتی رہی ہے۔

کم و بیش! ایک سو سال تک روسی لوگ جیلوں کو آباد کرتے رہے۔ منتقین اور جلادوں کو مشغول رکھا۔ سائبریا کے یخ بستہ میدانوں میں منجمد ہونا قبول کیا اور حکام کو خطرے کی گھنٹیاں بجا بجا کر جھنجھوڑتے رہے۔ جب ہمیں یہ حقیقت معلوم ہے کہ ستر سال کے دوران میں آٹھ لاکھ سے کچھ زیادہ سپاہی اسیر عدالت کے ایک دروازے سے سائبیریا میں دھکیل دیئے گئے تھے تو واقعات جن کی گورکی نقاب کشائی کرتا ہے، بعید از فہم معلوم نہیں ہوتے۔

دراصل روس کی یہ جنگ آزادی اپنی مثال نہیں رکھتی۔ جمہوری حکومت کے لیے اٹلی کی پچاس سالہ کشمکش کو بھی اس پر وقعت نہیں دی جاسکتی۔

ہر سال ہزاروں روسی عورتیں اور مرد بڑھتے اور جلا وطن اور مرے ہوئے لوگوں کی خالی جگہ پر کر دیتے ہیں۔ یہ جان نثار لوگ اس وقت تک دم نہ لیتے جب تک حکومت کے بھیانک نظام کی سرد انگلیاں ان کا گلا نہ دبا دیتیں، میدان جنگ میں سر بکف نکلنا اس وقت واقعی معنی رکھتا ہے۔ جب دونوں فریق ہم پلہ ہوں، زندگی اور فتح کا ایک موقع ہو۔ اس صورت میں مادر وطن سے ہر فرزند گی کی رگ میں خون جوش سے ابلنے لگتا ہے۔ خطرے کا خوف غائب ہو جاتا ہے اور قربانیوں تڑپ پیدا ہوتی ہے مگر غیر مرئی خاموش عیار اور خونی قاتلوں سے تاریکی کے

پردے میں جنگ کیے جانا ہمیشہ اپنی جان ہی کے خطرے کا احتمال ہونا، یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کشمکش کا انجام یقینی موت ہے اور پھر اس انجام کو بے دھڑک قبول کر لینا، ایسی ہمت و جوانمردی ہے جو آج تک کوئی قوم نہیں دکھا سکی۔

روز بروز روس دیگر ممالک کی عنان توجہ اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور ابھی کافی مدت تک اپنی معاشرتی سیاسی اور ادبی تحریکات کی وجہ سے کھینچتا رہے گا۔ ایک فلسفہ دان اور مورخ سالہا سال کی طویل کوشش کے باوجود بھی ناکام رہتا۔ گورکی کی ''ماتا'' نے چند مختصر ابواب میں بیان کر دیا ہے۔ جب اس کی داستان کا مطالعہ کیا جائے تو روس روشنی میں نظر آتا ہے۔

زندگی جیسی ہے نہ کہ جیسی ہو سکتی ہے خیال کی جاسکتی ہے یا ہو گی یہ ہے گورکی کا فن اور یہی ہے روس کے دیگر افسانہ نگاروں کا راز!

نقلی مہیج، نقلی انسانیت یا نقلی زندگی کے نقلی نقشوں سے روسی افسانہ نگاروں کو کوئی سروکار نہیں ہے۔ ان کے نزدیک صرف کہانی کا ڈھانچہ خیالی ہو سکتا ہے اور بس! باقی افسانے کے سب کردار حقیقی ہونے لازمی ہیں۔

انسان کو بیک وقت حسین جوانمرد اور چالاک شیطان پیش کرنا ان کے نزدیک فن صحیح و صنعت سنجیدہ ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ مغربی افکار کے طومار کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے۔ پریوں، دیوؤں، ناقابل فہم نوجوانوں اور لڑکیوں کی کہانیاں ان کی نظروں میں بالکل مہمل نظر آتی ہیں۔ وہ اسے بخوبی سمجھتے ہیں کہ ایسے واقعات پردہ ظہور پر ہرگز نہیں آتے۔ مغربی کرداروں کی صفحات پر تھکا دینے والی بھاگ دوڑ کو وہ بچوں کا ایک کھیل خیال کرتے ہیں۔۔۔۔ وہ سخت حیران ہیں کہ

مغربی اذہان کب اس خواب سے بیدار ہوں گے۔

گورکی کی قوت بیان کو سمجھنے کی خاطر اس فرق کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔۔

اس کی تصانیف میں اس کے کردار بظاہر بالکل بے معنی سی باتیں کرتے ہیں اس لیے کہ انسانی گفتگو ننانوے فی صدی اسی قسم کی ہوتی ہے۔اس کے بیان کردہ لوگ عجیب عجیب حرکات کرتے ہیں بہت جلد آگ ببھوکا ہو جاتے ہیں بغیر کسی وجہ کے فوراً ہی ان کا غصہ سرد ہو جاتا ہے ان کی سرگرمیوں کا آغاز و انجام واقعات کی رفتار پر انحصار رکھتا ہے اور وہ اس دوران میں مقدر کے انتخاب کردہ ہتھیاروں کا کام دیتے ہیں اس لیے کہ حیات حقیقی میں ان کا یہی حصہ ہے۔

یہ حقائق گورکی کے قلم سے اس انداز میں بیان کئے جاتے ہیں کہ ہماری نظروں کے سامنے وہ تاریک بھیانک بے رحم کور چشم اور خون میں لتھڑی ہوئی مشین واضح پر حرکت کرنے لگتی ہے جو روس پر حکومت کر رہی تھی۔گورکی نے نہ صرف یہی کچھ کیا ہے بلکہ ہمارے جسم پر اس خوف کی کپکپی بھی طاری کر دی ہے۔ اس کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس آہنی دیو کی گرفت محسوس کرتے ہیں جو اس زمانے میں سرزمین روس پر ڈکار رہا تھا۔

اس طرح گورکی کی ہماری حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے اپنے خوف ناک نظام کی جس کی گرفت سے کوئی بھی رہائی نہیں پا سکتا،اس مرد کی جو اپنے مصائب کو فراموش کرنے کی دوا کو شراب خیال کر کے پیتا حیوان بن جاتا ہے اور اس دیوانگی کی حالت میں اپنی بیوی کو زدوکوب کرتا ہے اور اس نوجوان کی جو ایک کتاب میں

دنیائے آزادی کی جھلکیاں دیکھ کر خود کو دہکتے ہوئے الاؤ میں گرا دیتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ دیو جس سے وہ برسر پیکار ہے۔ کس آسانی سے اس کا غنچہ حیات اپنے ہاتھوں سے مسل سکتا ہے، حکایت پیش کرتا ہے طبقہ اعلیٰ کے اس فرد کا افسانہ جو خطرناک مواقع کی نبض گرتی دیکھ کر انقلاب پسند جماعت کا رکن بن جاتا ہے، ناز و نعمت میں پلی ہوئی ان عورتوں کی داستان، جو بغیر کسی حیل و حجت کے کشمکش آزادی میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لیتی ہیں، خواہ انہیں کیسے ہی لرزہ خیز مصائب سے کیوں نہ سامنا کرنا پڑے۔ تپ دق کے ایک خون تھوکنے والے مریض کے ایثار کا واقعہ جو اس جدوجہد میں تا دم آخر حصہ لیتا ہے، کمال فن کاری سے بیان کرتا ہے۔

ایک نوجوان اور دوشیزہ محبت میں گرفتار ہیں۔ وہ شادی کے خیال کو بالائے طاق رکھ کر جنگ آزادی میں شامل ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اس لیے کہ محبت ان کے نیک مقصد میں حارج ہے۔ ایک تعلیم یافتہ مطالعہ کتب، موسیقی اور امن کا دلدادہ ہے۔ وہ ان کو فراموش کر دیتا ہے۔۔۔۔۔ اس لیے کہ اس کی جدوجہد آزادی میں یہ چیزیں مخل ہیں۔ پھر اسی تعلیم یافتہ مرد کی نوجوان بہن اپنے خوش نما لباسوں اور پر تکلف بچھونوں کو ٹھکرا کر انقلاب پسند جماعت میں ایک قلی کے فرائض انجام دیتی ہے۔

"ایک پر از مسرت ہنسی کے ساتھ صوفیہ نے ماتا کو اپنی انقلابی سرگرمیوں کا حال سنانا شروع کیا۔ جیسے وہ بچپن کی خوشگوار داستان ہو۔"

صوفیہ کو اپنا نام تبدیل کرنا پڑا تھا۔ جاسوسوں کی تیز نگاہ سے بچنے کے لیے

مختلف بھیس بدلنے پڑے تھے۔ ہزاروں من وزنی انقلابی کاغذات ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کرنا پڑے تھے اور اپنے رفیقوں کی رہائی کے لیے بیسیوں تدابیر عمل میں لانا پڑی تھیں۔ اس کے پاس کاغذات چھاپنے کے لیے ایک چھوٹا پریس بھی تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ سپاہی تلاشی کے لیے باہر دروازے پر کھڑے ہیں تو اس نے ان کے اندر داخل ہونے سے ایک لمحہ پہلے خادمہ کا لباس پہنا اور گھر سے باہر نکل گئی۔

وہ انہیں راستے میں ملی۔ چہرے پر صرف ایک ہلکی سی نقاب تھی۔ سر پر اس نے چھوٹا سا رومال اوڑھ رکھا تھا۔ ہاتھ میں مٹی کے تیل کا بھبکا تھا۔ اس حالت میں وہ مکمل ایک دن سرما کی بے پناہ سردی میں شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگاتی رہی تھی۔

اسی طرح ایک دفعہ اور یہ واقعہ ہوا تھا۔ وہ ابھی ایک غیر مانوس شہر میں چند رفیقوں کی ملاقات کے لیے پہنچ کر ان کے مکان کی سیڑھیاں ہی چڑھ رہی تھی کہ اسے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کی تلاشی ہو رہی ہے بھاگنا فضول تھا اس لیے اس نے بغیر کسی تامل کے درمیانی چھت کے ایک دروازے کی گھنٹی دبا دی اور دروازہ کھول کر ان نامعلوم اشخاص کے پاس چلی گئی جس سے وہ قطعاً ناواقف تھی اور اپنی موجودہ حالت صاف صاف بیان کر دی۔

”اگر آپ چاہیں تو مجھے سپاہیوں کے حوالے کر سکتے ہیں مگر مجھے امید نہیں کہ آپ ایسا کریں گے۔“

ایسے مرد اور عورتوں کے حالات پڑھ لینا ہی کافی ہے مگر ان کو اپنی آنکھوں سے

دیکھنا، سمجھنا، سننا ان کے کام کا مشاہدہ کرنا اور ننگے ہاتھوں سے مطلق العنانی کی ان سیسہ پلائی ہوئی خونی دیواروں کو منہدم کرنے کی سعی کرتے دیکھنا جو روس کے کمزور و نحیف سینے پر سوار تھیں، زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔۔۔۔۔ یہ سب مناظر گورکی اپنے قلم کی ایک جنبش ہی سے ہم پر واضح کر دیتا ہے اور اس کی اس تصنیف کے اوراق پر پھیلا ہوا سحر ابھر ابھر کر ہمیں بالشوزم کے اسرار بتاتا ہے۔

ان مناظر میں ہم ایک بوڑھی عورت کو دیکھتے ہیں جو اس افسانے کی روح رواں ہے۔ یہ عورت (ماتا) عمر رسیدہ ہے۔ ایک خاص شب تک وہ اسی مہلک نظام کے لاکھوں گونگے شکاروں میں سے تھے۔ کمال صبر سے اپنے خاوند کی مار پیٹ سہتی تھی۔ اس کی کتاب حیات میں ہر نیا باب اس امید کا حامل تھا کہ شاید وہ اپنے خاوند کو زدوکوب سے بچ جائے۔ اپنی ہڈیوں میں حیوانی زندگی کو برقرار رکھنا ہی اس کی واحد خواہش تھی۔

پر ہم کیا دیکھتے ہیں؟

گورکی کا سحر آفرین قلم اسی ایک عورت میں تمام روس کو پیش کر دیتا ہے۔ بغاوت کا احساس اولیں اسے خوف زدہ کر دیتا ہے، وہ خیال کرتی ہے؟ کیا زار کے خلاف نبرد آزمائی۔ اسرائیلی قوم کے مقدس فرد سے جنگ آسمانی حکم سے بیگانگی، جس نے یہ تاج پوش شیطان ان کی گردنوں پر مسلط کر دیا ہے؟

مگر یہ خیال تبدیل ہوا جاتا ہے

وہ دل کش، جاں پرور اور عجیب خوابوں کے قریب پہنچ کر انہیں پسند کرنا شروع کر دیتی ہے۔ ان میں حصہ لینا چاہتی ہے۔

نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

یہ عورت ایسے صبر آزما پر از شجاعت کام کرتی ہے، جن کے لیے دلیری درکار ہے۔ بھیس بدلتی ہے کہ سپاہیوں کے ساتھ ہم کلام ہو سکے۔ پر مغز جاسوسوں کے ہجوم کو دھوکا دیتی ہے۔ کیچڑ اور برف سے اٹے ہوئے بازاروں میں میلوں سفر کرتی ہے کہ انقلابی لٹریچر تقسیم کر سکے۔ اپنے اکلوتے بچے کو جو دنیا میں اس کا واحد سہارا تھا، اس تحریک کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے اور آخرش تھک کر چور چور گاڑی کے ظالم پہیوں سے لپٹ کر اپنی جان قربان کر دیتی ہے۔۔۔۔ مگر حالت نزع میں بھی اس کے لبوں پر آزادی کا وہی گیت ہوتا ہے۔

یہ موت اس وقت وقوع پذیر ہوتی ہے جب وہ ایک مقامی سٹیشن پر اپنے لڑکے کی تقریر کی چھپی ہوئی کاپیاں بغدل میں دابے جا رہی تھی۔۔۔۔

پولیس کے سپاہی اور جاسوس اس کا تعاقب کر رہے ہیں اور اسے ''چور'' ''چور'' کہہ کر پکار رہے ہیں اس وقت تک وہ سخت خوفزدہ اور سرتاپا ارتعاش تھی اور اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

''اگر وہ مجھے نہ ماریں تو کتنا اچھا ہو۔۔۔ اگر وہ مجھے مار پیٹ نہ کریں تو کتنا اچھا ہو۔''

مگر ''چور'' کا لفظ اس کی خفتہ روح کو بیدار کر دیتا ہے۔۔۔۔ اس کا خوف دور ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ ''میں چور نہیں ہوں۔۔۔۔۔۔ تم جھوٹ کہتے ہو۔''

وہ اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے بلند آواز میں چلائی۔ یہ کہتے وقت اس کی نظروں کے سامنے تمام چیزیں انقلابی چکر کی طرح رقص کرنے لگیں اور ہتک

کی تلخی نے اس کے دل و دماغ کو گرما دیا اور اس نے جھٹکے کے ساتھ اپنا بستہ کھولا

''دیکھو! تم سب لوگ ادھر دیکھو!''

وہ چلائی اور اپنے لڑکے کی تقریر کی چھپی ہوئی کاپیوں کے مٹھے ہوا میں لہرائے اپنے کانوں سے اس نے شور میں ان لوگوں کی حیرت کی صدائیں سنیں جو چہار اکناف سے اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔

ماتا اپنے بستے سے تقریر کی کاپیاں نکال کر ہوا میں اچھال دیتی ہے اور بلند آواز میں کہتی ہے۔

غربت، گرسنگی اور بیماری۔۔۔۔۔۔یہ ہے جو کام، غریب لوگوں کو عطا کرتا ہے۔ یہ حالات ہمیں جرائم اور بدکاریوں کی طرف کشاں کشاں لے جاتے ہیں۔ ہم سب کے اوپر امراء عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس غرض سے کہ ہم ان کے احکام بجا لائیں۔ پولیس، حکومت، سپاہی سب ان کے ہاتھ میں ہیں۔۔۔۔۔۔۔یہ سب لوگ ہمارے درپے آزاد ہیں۔ سب چیزیں ہمارے خلاف ہیں ہم روز بروز محنت و مشقت اور غلیظ زندگی میں اپنی جانیں تباہ کر رہے ہیں۔۔۔دوسرے ہمارے بہائے ہوئے پسینے پر عیش کرتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں کتوں کی طرح زنجیروں سے جکڑ رکھا ہے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ خوف کے سائے تلے ہم ہر چیز سے خائف ہیں۔۔۔ہماری زندگی رات ہے۔ ایک اندھیری رات!۔۔۔۔۔ایک وحشت ناک خواب انہوں نے ہمیں تیز زہر پلا رکھا ہے۔ وہ ہمارا لہو پیتے ہیں۔ افراط عیش انہیں فربہ کر رہا ہے۔۔۔۔شیطان حرص کے غلام! کیا وہ نہیں ہیں؟

''یہ درست ہے''لوگوں کی طرف سے جواب آیا

اس ہجوم کے پیچھے ماتا ایک مخبر اور دو سپاہیوں کو دیکھ کر جلدی جلدی کاغذوں کے مٹھے تقسیم کرنا شروع کر دیتی ہے۔سپاہی پہنچ جاتے ہیں۔

''بینچ پر کھڑی ہو جاؤ'' سپاہی ماتا کو حکم دیتے ہیں

''میں بہت جلد گرفتار کر لی جاؤں گی''

''یہ ضروری نہیں ہے''

''جلدی بولو۔۔۔۔۔۔وہ آ رہے ہیں''

پولیس کے سپاہی دوڑ کر موقع پر پہنچ جاتے ہیں اور ہجوم کو منتشر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ماتا اپنی تقریر جاری رکھتی ہے۔

''لوگو!اپنی تمام قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کر لو!''

ایک موٹا سپاہی اپنے سرخ ہاتھ سے اس کا کالر پکڑ کر جھنجھوڑتا ہے۔

''خاموش رہو''

اس کی گردن دیوار سے جا ٹکرائی۔تھوڑی دیر کے لیے اس کے دل پر خطرے کا تاریک دھواں چھا گیا مگر فوراً ہی وہ پھر شعلہ افشاں ہوئی۔

اسی لمحے ایک سپاہی دوڑتا ہوا آ رہا ہے اور اسے اپنا گھونسا تان کر دکھاتے ہوئے کہتا ہے

''خاموش بوڑھی مکار!''

یہ سن کر ماتا کی آنکھیں کھلیں، چمکیں۔اس کے جبڑے کانپے، پھسلتے ہوئے پتھروں پر قدم جما کر اور اپنی قوت کے آخری ٹکڑے فراہم کرنے کے بعد وہ

چلائی۔

"بیدار روح کو وہ ہرگز فنا نہیں کر سکتے"

سپاہی نے اپنا ہاتھ جھٹک کر اس کے منہ پر ضرب لگائی۔ ایک لمحہ کے لیے کسی سرخ و سیاہ چیز نے اس کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ خون کا نمکین ذائقہ اس کے منہ کو بدمزہ کر رہا تھا۔

وہ اسے زدو کوب کرتے گھسیٹتے ہوئے لے جاتے ہیں۔ اس حالت میں بھی وہ برابر کہے جاتی ہے۔

"تم حق کو خون کے سمندر میں غرق نہیں کر سکتے"

پھر وہ اس کا اور اس کی آواز کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔

یہ ہے اس عورت کی داستان جو اپنے خاوند کی مار پیٹ سے خمیدہ کمر سیدھی کرنے کے بعد آزادی کی جدوجہد میں شامل ہوئی۔ اور ظالم سپاہیوں کے ہاتھوں دوسرے لوگوں کو خواب غلامی سے بیدار کرنے کی سعی کرتی جان دے گئی۔

اس کا لڑکا پیول شروع شروع میں اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے اور اپنے باپ کی طرح ایک کونے میں لڑکھڑاتا ہوا بیٹھ کر چلاتا ہے

"کھانا"

اس کی ماں آئی اور اس کے سر کو اپنی چھاتی سے لگا لیا مگر پیول نے اسے ایک طرف ہٹا کر کہا۔

"جلدی کرو"

ماتا نے غمگین اور محبت بھری آواز میں کہا "بے وقوف لڑکے!"

مگر پیول شراب سے مخمور ہے وہ اسی کو رازِ حیات سمجھتا ہے کہ اپنے باپ کی پیروی کرے۔ وہ شراب کے نشے میں کہتا ہے۔

''لاؤ میرے باپ کا پائپ کہاں ہے؟ میں آج سے تمباکو پینا بھی شروع کروں گا!''

''پہلی مرتبہ اس نے شراب کو منہ لگایا ہے۔ گو شراب نے اس کے جسم کو کمزور اور مردہ کر دیا ہے۔ مگر اس کا ضمیر زندہ ہے، جو اسے ملامت کرتا ہے اور اس کے کانوں میں پکارتا ہے کہ وہ شرابی ہے۔۔۔ ایک بے ہوش شرابی!''

ماں کی محبت اسے سخت تکلیف پہنچاتی ہے۔ وہ اپنی ماں کی آنکھوں میں غم کی جھلک دیکھ کر بہت متاثر ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی صرف ایک خواہش ہے کہ وہ روئے اور خوب روئے۔ اس خواہش پر غلبہ پانے کے لیے وہ اپنے آپ کو زیادہ مخمور کرتا ہے مگر ماں اسے پیار سے کہتی ہے۔

''بیٹا! تم نے ایسا برا کام کیوں کیا۔۔۔۔۔۔ تمہیں یہ چاہیے نہیں تھا!''

تھوڑی دیر کے بعد ماتا اسے بستر پر لٹا دیتی ہے۔ اس پر پیول کو قدرے ہوش آتا ہے اور وہ سوچتا ہے۔

''میرا خیال ہے کہ میں نے قبل از وقت شراب نوشی شروع کر دی ہے دوسرے بھی تو پیتے ہیں، انہیں کچھ نہیں ہوتا پر میں بیمار پڑ گیا ہوں''

کمرے کے کسی حصے سے ماتا کی غمگین آواز سنائی دی۔

''تم نے ابھی سے شراب پینا شروع کر دی ہے اب تم میری خبر گیری کیسے کر سکو گے''

پیول آنکھیں بند کر کے جواب دیتا ہے

''ہر شخص پیتا ہے''

''ہر شخص پیتا ہے'' ان مختصر الفاظ میں گورکی نے ان تمام مزدوروں کا صحیح نقشہ کھینچ دیا ہے۔ جو مشقت سے چور چور ہو کر کسی ارضی لذت کے خواہاں تھے۔

وہ شراب کیوں پیتے تھے؟ اس کے جواب کے لیے گورکی کے اپنے الفاظ موجود ہیں۔

سالہا سال کی جمع شدہ تھکاوٹ نے ان کی بھوک چھین لی تھی، کچھ کھا سکنے کے لیے وہ شراب نوشی کرتے۔۔۔۔۔ اپنے کمزور معدوں سے کما لینے کی خاطر ''وودکا'' کا جھلس دینے والا چابک استعمال کرتے تھے۔

اپنے بیٹے کا جواب سن کر ماتا ٹھنڈی سانس بھرتی ہے کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ اس کا لڑکا درست کہتا ہے۔ ماتا کو اچھی طرح علم ہے کہ شراب خانے کے سوا مردوں کے لیے کوئی اور جگہ نہیں، جہاں وہ اپنا غم غلط کر سکیں۔ مگر پھر بھی وہ اپنے بچے کو نصیحت کرتی ہے کہ اسے شراب نوشی ترک کر دینی چاہیے اس لیے کہ اس کے باپ نے اس کے حصے کی پی کر اسے کافی سے زیادہ تنگ کیا تھا۔

پیول کو کچھ سمجھنے لگتا ہے۔

ماں کی غمگین اور رحم انگیز گفتگو سن کر پیول نے خیال کیا کہ اس کی ماں اپنے خاوند کی بے جا مار پیٹ سے بچنے کے لیے ہمیشہ چپ چاپ رہا کرتی تھی۔ وہ خود چونکہ اپنے والد خشمگیں نگاہوں سے بچنے کی خاطر ہمیشہ گھر سے غیر حاضر رہا کرتا تھا اس لیے اسے اپنی ماں کو جاننے کا بہت کم اتفاق ہوا تھا مگر اب جوں جوں سے

ہوش آنے لگا۔اس نے ماں کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا۔

اس کی ماں لانبے قد کی اور اوپر سے ذرا جھکی ہوئی تھی۔اس کا بھاری جسم سالہا سال کی ان تھک محنت اور خاوند کی مار پیٹ سے اب بڑی مشکل سے ہلتا تھا، وہ کمرے میں اس انداز سے ٹہل رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا، ابھی گر پڑے گی۔

یہ دیکھ کر اور اس پر غور کرنے کے بعد پیول اسی دم شراب کی لعنت دور کرنے کا تہیہ کر لیتا ہے اور پھر کبھی مے نوشی نہیں کرتا؟

وہ مے نوشی نہیں کرتا تو کیا کرتا ہے؟

ایک کتاب کے اس خفتہ ساز دل پر مضراب کا کام دیتی ہے اور اس کے پیدا کردہ نغمات سے متاثر ہو کر وہ انقلاب پسند جماعت میں شامل ہو جاتا ہے۔شرابی قصر آزادی کا معمار بن جاتا ہے۔روس کے گلی کوچے اس کی صدائے انتقام سے گونج اٹھتے ہیں۔

پیول اپنے رفیقوں سمیت پکڑا جاتا ہے اور عدالت کے روبرو پیش کیا جاتا ہے، وہاں وہ اپنا بیان دیتا ہے۔

"ہم اشتراکی ہیں۔۔۔۔۔سرمائے کے دشمن جو لوگوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا ہے۔جو انسان کو انسان کے خلاف لڑنے پر آمادہ کرتا ہے۔ہمارے نزدیک وہ سماج جو انسان کو اپنی دولت بڑھانے کا آلہ تصور کرتا ہے غیر انسانی ہے۔"

ہم لڑنا چاہتے ہیں اور ہر اس بندش کے خلاف جو انسان کو جکڑے ہوئے ہے، لڑیں گے۔خواہ وہ اخلاقی ہو یا جسمانی۔۔۔۔۔ہم مزدور ہیں وہ لوگ جن کی

مشقت ننھے کھلونوں سے لے کر دیو قامت مشینیں تک تیار کرتی ہے۔ ہم وہ افراد ہیں جو اپنی عزت نفس کو برقرار رکھنے کے حق سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ ہر شخص ہمیں استعمال کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اب ہم اتنی آزادی کے خواہاں ہیں جو ہمارے لیے تمام قوتوں کو مسخر کرنا ممکن بنا دے۔ ہمارا مطمع حیات بالکل صاف اور سیدھا ہے۔ تمام اختیار عوام کے ہاتھوں میں، پیداوار کے تمام ذرائع عوام کے لیے، سب کے لیے کام کرنا فرض۔۔۔۔۔۔ انفرادی سرمائے کی بیخ کنی اور بس۔۔۔۔۔۔ دیکھتے ہیں۔۔۔ ہم باغی نہیں ہے۔

جج آغوش جہالت میں پرورش پائے ہوئے شخص کے منہ سے فاضل مقرر ایسے الفاظ سن کر بہت حیران ہوتا ہے مگر فوراً ہی اسے اصل موضوع کی طرف پلٹنے کا حکم دیتا ہے۔ پیول تھوڑی دیر کے بعد اپنی تقریر شروع کرتا ہے۔

"ہم انقلابی ہیں اور اس وقت تک انقلابی رہیں گے۔ جب تک ذاتی سرمائے کا وجود بقایا ہے، جب تک چند افراد حکومت کرتے ہیں اور باقی صرف محنت و مشقت کرتے ہیں۔۔۔ ہم فتح یاب ہوں گے۔۔۔۔۔۔ ہم مزدور یقیناً جیتیں گے۔ تمہاری سوسائٹی اتنی طاقتور نہیں ہے جتنی کہ تم سمجھ رہے ہو! یہی سرمایہ جس کی حفاظت اور پیدائش کے لیے سوسائٹی لاکھوں انسان قربان کرتی ہے۔۔۔۔۔ یہی قوت جو اسے ہم پر حکومت کرنے کا اختیار بخشتی ہے۔ اس کے افراد کی جسمانی و اخلاقی تباہی کا باعث ہے۔ سرمایہ کے لیے مائی حفاظت درکار ہے اور درحقیقت تم سب ہمارے حکام ہم سے زیادہ غلام ہو۔۔۔۔۔ تم روحانی لحاظ سے غلامی کی زندگی بسر کرتے ہو اور ہم جسمانی لحاظ سے۔۔۔۔ تمہاری

قوت۔۔۔تمہارا سرمایہ تمہیں کئی حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے جو ایک دوسرے کو نگلنے کی کوشش کرتا رہتا ہے ہمری قوت ایک زندہ طاقت ہے جس کی بنیاد مزدوروں کی ہمیشہ بڑھنے والی بیداری ہے تمہارا ہر کام جرم سے وابستہ ہے اس لیے کہ اس کا مقصد عوام کی غلامی کے جال میں پھنسانا ہے ہمارا کام دنیا کو ان تمام مہیب دیوؤں سے نجات دلانا ہے جو تمہاری حرص کے پیدا کردہ ہیں۔تم نے لوگوں سے زندگی چھین کر انہیں کچل دیا ہے۔اشتراکیت تمام دنیا کو آپس میں جوڑ دے گی۔''

''جو تمہارے بوجھ تلے دب کر شکستہ ہو چکی ہے۔۔۔۔۔اور یہ ضرور ہو گا!''

پیول یہاں تک پہنچ کر ایک لمحہ کے لیے ٹھہرتا ہے اور آہستہ لہجہ میں کہتا ہے

''اور ضرور ہو گا!''

پیول کے رفقاء میں اینڈری کا کردار بہت دلچسپ ہے، بات بات پر مزاحیہ نوک جھونک کرنے میں اس کو مزا آتا ہے۔عدالت میں پیش ہے، سائبریا کے یخ بستہ میدان آنکھوں کے سامنے نظر آ رہے ہیں مگر وہ ججوں سے بھی مذاق کرنے سے باز نہیں آتا۔

اینڈری اٹھا اس نے اپنے جسم کو حرکت دی، ججوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور کہنے لگا۔

''معزز مدعا علیہ حضرات۔۔۔۔۔''

''عدالت تمہارے سامنے ہے نہ کہ مدعا علیہ''

اینڈری کے چہرے اور گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عدالت کو تنگ کرنے پر تلا ہوا ہے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے لانبے ہاتھوں سے اپنے سر کو

تھپکا اور کہا

''سچ مچ؟ مگر میرا خیال کچھ اور ہے، تم جج نہیں ہو محض مدعا علیہ ہو۔۔۔۔۔۔''

یہ سن کر ایک جج خشک لہجے میں پکارتا ہے

''ازراہ عنایت وہی بیان دو جو اس مقدمے سے متعلق ہے''

''جو مقدمے سے متعلق ہے؟ بہت خوب! چلئے میں نے یقین کر لیا کہ آپ واقعی جج ہیں خود اختیار اور ایماندار۔۔۔۔۔''

''عدالت یہ کردار نگاری نہیں چاہتی''

'' اس کردار نگاری کی ضرورت نہیں؟ اچھا میں اپنا بیان جاری رکھتا ہوں۔۔۔۔۔۔تم وہ افراد ہو جو اپنے اور اجنبیوں کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتے۔تم آزاد ہو اب یہاں دو فریق تمہارے روبرو کھڑے ہیں۔ایک شکایت کرتا ہے مجھے اس نے لوٹ کر برباد کر دیا ہے اور دوسرا جواب میں کہتا ہے مجھے لوٹنے کا حق ہے اس لیے کہ میرے بازو موجود ہیں۔۔۔۔۔''

عدالت پھر اسے خاموش رہنے کا حکم دیتی ہے اس لیے وہ اس قسم کی گفتگو سننا پسند نہیں کرتے۔افسانے کا یہ مزاحیہ کردار چند اور الفاظ کہنے کے بعد اپنا بیان بند کر دیتا ہے۔

''جو آپ کو معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ میرا رفیق بتا چکا ہے۔۔۔۔۔باقی پھر کہا جائے گا۔وقت پر دوسرے گوش گزار کر دیں گے۔۔۔۔۔''

ان سیاسی قیدیوں یعنی پیول کے رفقاء میں جو سائبریا میں جلاوطن کر دیئے جاتے ہیں۔ایک نوجوان کا آتشیں کردار بہت اہمیت رکھتا ہے۔اس کے مختصر بیان

کی نفسیات مطالعہ کرنے کے بعد ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک جواں قلب میں آزادی کی آگ کس تیزی سے بھڑکتی ہے۔اس کے ساتھ ہی ہم اس کے الفاظ میں کم تجربہ کاری اور بچپن کی جھلک دیکھتے ہیں۔

ننھا میزن شامپین کی بوتل کے کاک کی طرح اٹھا اور لرزاں آواز میں کہنے لگا۔

''میں۔۔۔۔۔۔قسم کھاتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ تم نے مجھے ملزم قرار دیا ہے''

میزن کا سانس اکھڑ گیا اور چہرہ زرد پڑ گیا۔اس کی آنکھیں اس کے تمام چہرے کو نگلتی دکھائی دے رہی تھیں۔تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر بلند آواز میں بولا

''۔۔۔۔میں۔۔۔۔اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں کہ تم مجھے خواہ کہیں بھیج دو۔۔۔میں فرار ہو جاؤں گا واپس آ جاؤں گا۔۔۔۔ہمیشہ یہی کام کروں گا۔۔۔اپنی زندگی بھر!۔۔۔۔۔مجھے اپنی عزت کی قسم ہے۔''

''ماتا کے تمام کرداروں سے فرداًفرداً بحث ایک طویل مضمون کی محتاج ہے۔اس مختصر مضمون میں حتی الوسع ماتا پر ہر پہلو سے روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے مگر پھر بھی یہ مضمون تشنہ ہے۔

اب ہم گورکی کے فن منظر کشی کی طرف پلٹتے ہیں یہاں ماتا میں سے ہم مثال کے طور پر چند مناظر پیش کرتے ہیں جو قارئین کے لیے یقیناً دلچسپ ہوں گے۔''

ماتا کے منظر افتتاحیہ میں گورکی کا قلم کارخانہ کی طرف رخ کرنے والے مزدوروں کی تصویر ان زندہ الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

''ہر روز کارخانے کی سیٹی، مزدوروں کی غلیظ اور دھوئیں سے پر فضا میں کانپتی

ہوئی آواز میں غراتی، جس پر بھاپ کے غلام اپنے چھوٹے اور بدنما گھروں سے نکلنا شروع ہو جاتے ہیں غمگین چہروں کے ساتھ وہ خوف زدہ وحشیوں کی طرح تیز قدم بڑھاتے۔ ان کے استقبال کا منظر ہوتا۔ جس کی بیسیوں زرد، بھدی اور چوکور آنکھیں کیچڑ سے بھری ہوئی سڑک کو روشن کر رہی ہوتیں کیچڑ کے چھینٹے ان کے پیروں پر اس طرح گرتے گویا ان کا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔ فضاء بھدی خواب زدہ آوازوں اور گالیوں سے معمور ہوتی ان کے استقبال کے لیے مشینوں کی گرگراہٹ اور بھاپ کی غیر مطمئن چیخ و پکار ہوا میں تیر رہی ہوتی۔۔۔۔ دراز قامت دودکش دھوئیں کے گہرے اور موٹے بادل اپنے حلق سے نکالنا شروع کر دیتے''

یہ تو ہے مزدور کی کارخانوں کی طرف سے روانہ ہونے کی تصویر۔۔۔۔ اب ان کی واپسی کا نقشہ بھی گورکی کا معجز نگار قلم یوں کھینچتا ہے۔

''شام کو سورج غروب ہوتے وقت سرخ کرنیں گھروں کی کھڑکیوں پر چمک رہی ہوتیں۔ کارخانہ اپنے مزدوروں کو جلی ہوئی راکھ کے مانند باہر پھینک دیتا۔ اس طرح پھر ان بازاروں سے اپنے دھوئیں میں لپٹے ہوئے چہرے اور گرسنہ دانتوں کی چمک کی نمائش کرتے مشین کے تیل کی غلیظ بو کو پھیلاتے گزرتے مگر ان کی آوازوں میں خوشی کی جھلک پائی جاتی۔۔۔ مشقت کی سزا اس دن کے لیے ختم ہو چکی تھی۔ آرام کی چند گھڑیاں اور روکھا سوکھا کھانا گھر پر ان کا انتظار کر رہا تھا۔''

''دن کارخانہ نگل گیا اور مشین نے ان انسانوں کے اعضاء سے حسب ضرورت طاقت چوس لی۔ اس طرح ایک مکمل دن زندگی سے جذب کر لیا گیا جس

کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔‘‘

مزدور اس حیوانی مشقت کے باوجود کیوں کر زندہ رہتا ہے اس کے جواب کے لیے گورکی کے الفاظ موجود ہیں۔

’’انسان نے قبر کی طرف بڑھا دیئے مگر جب اس کو نزدیک ہی آرام کی راحتیں اور مے خانوں کی مسرتیں نظر آئیں تو وہ مطمئن ہو گیا!‘‘

یہ ہمیں بھی معلوم تھا مگر گورکی نے اسی خیال کو اپنے سحر آفریں الفاظ میں پیش کر دیا۔ مرصع الفاظ سے اپنے فن کی زیبائش کرنا۔۔۔ یہی گورکی کا راز اور یہی اس کی فقید المثال صنعت ہے۔ ان الفاظ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد اس سحر کار کی ناقابل نقل فن کاری عیاں ہو جاتی ہے اور پھر کسی مزید تفصیل کی حاجت نہیں رہتی۔

تعطیل کے دنوں میں گورکی نے برگشتہ بخت اور رواثگوں نصیب مزدوروں کی نفسیات اس پیرائے میں بیان کی ہے کہ ایک کم عقل بچہ بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے دراصل گورکی وہی بیان کرتا ہے جو اس سے پیشتر ہمارے دل میں موجود ہوتا ہے مگر اس کے الفاظ پہلو میں اس سوئے ہوئے احساس کو اپنے ترنم سے بیدار کر دیتے ہیں۔

’’تعطیل کے روز مزدور دن کے دس بجے تک سوئے رہتے۔ بوڑھے اور شادی شدہ لوگ بہترین کپڑے پہن کر نوجوانوں کو گرجا میں عبادت کے لیے نہ جانے کی بناء پر برا بھلا کہتے۔ پادری کا خطبہ سننے کے لیے جاتے۔ گرجے سے واپس آ کر وہ کچھ کھا کر پھر سو جاتے۔ شام کے وقت وہ سڑکوں پر آوارہ چکر لگاتے۔ جن کے پاس وہ بڑے بوٹ ہوتے، وہ انہیں پہن لیتے خواہ بازار صاف

ہی ہوں۔ جن کے پاس چھاتے موجود ہوتے وہ انہیں اپنے ساتھ لیے پھرتے، خواہ آسمان بالکل ابر آلود نہ ہو۔''

یہ پڑھنے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایسی نکمی چیزوں کی کیوں نمائش کرتے ہیں؟۔۔۔ گورکی فوراً ہی جواب دیتا ہے۔

''ہر شخص یہی خواہش کرتا ہے کہ وہ کسی طریقے سے خواہ وہ کتنا ہی معمولی اور حقیر کیوں نہ ہو، اپنے ہمسائے سے زیادہ معزز دکھائی دے'' پھر وہ ان مزدوروں کو آپس میں لڑنے جھگڑنے کی وجہ بیان کرتا ہے۔ کتنے سادہ الفاظ ہیں، جو دل و دماغ میں سے گزرتے روح میں جذب ہو جاتے ہیں۔

''روزانہ مشقت سے تھکے ہوئے لوگ شراب کا کثرت سے استعمال کرتے، جس سے ان کے دلوں میں ایک نا قابل بیان بے چینی پیدا ہو جاتی جو باہر نکلنے کے لیے راستہ مانگتی۔ اس خاموش نہ ہونے والے اضطراب کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے وہ معمولی سے معمولی واقعات کو اہمیت دیتے اور وحشیوں کی طرح حقیر سے حقیر چیز پر ایک دوسرے سے جنگ کرنے لگ جاتے۔ یہ کینہ ان کے دلوں میں نا قابل علاج تکان کی طرح جو ان کے اعضاء میں گھر کر چکا تھا، بڑھتا رہتا۔۔۔ وہ اس روحانی بیماری وک ساتھ لے کر پیدا ہوئے تھے جو انہیں اپنے والدین سے ورثہ میں ملی تھی۔''

گورکی اسی جماعت کا ایک برہنہ پا و گرسنہ شکم فرد تھا اور وہ اب اسی ملت کا سب سے بڑا مفکر سحر کار مصور پیغام بر قصہ خواں افسانہ نویس اور تمثیل نگار ہے۔

☆☆☆☆

سرخ انقلاب

وسعت ارضی کے لحاظ سے یورپ میں روس سے بڑی کوئی حکومت نہ تھی اور بہ لحاظ مطلق العنانی زار یورپ کے بادشاہوں میں سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ روسیوں نے اسے شان الوہیت دے رکھی تھی۔ وہ اس کی غلامی کو اپنی سعادت اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ زار کی زبان کا ہر لفظ لفظ الٰہی تھا۔ اس کے قلم کی ہر جنبش فرمان ربانی وہ جسے چاہتا سزا دیتا اور جس کو چاہتا، تختہ دار پر لٹکا دیتا۔ اس کی نظروں میں جرم اور بے جرمی کا مفہوم کچھ نہ تھا۔ ہر سزا کے لیے صرف ارادہ سلطانی کافی تھا۔ جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا تھا۔ رعایا اسی میں خوش تھی کہ غیروں کی ٹھوکریں کھانے سے یہ تذلیل بہتر ہے وہ اپنے بادشاہ کے ہر ظلم کو برداشت کرتے تھے اس لیے کہ وہ اس کی ہر خواہش ان کی خواہش تھی۔۔۔۔۔اس لیے کہ وہ ان کا باپ تھا اور اس کی ہر بولی فرمان الٰہی تھی۔۔۔۔۔اس لیے کہ وہ ظل الٰہی تھا مگر دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر رینگنے والے روسی اٹھے اور عقابوں کی طرح فضاء کی بلندیوں میں پرواز کرنے لگے۔ اب جس چیز کو وہ شہد سمجھ کر چاٹ رہے تھے، حنظل سمجھ کر زار کے منہ پر تھوکنے لگے۔ اطاعت کیش سر متمردانہ کھینچنے لگے۔ ہر شخص آزادی کی قدرو قیمت سے واقف ہو گیا۔ کورنس بجا لانے والے ہاتھ اٹھے اور زاریت کی گردن کو ہمیشہ کے لیے دبا دیا۔ یہ سب کچھ کس طرح ہوا؟

اس مختصر مقالے میں روس کے اس عظیم الشان انقلاب کا ایک ہلکا سا نقشہ پیش

کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

الگزنڈر اول جب اپنی کثیر التعداد فوجیں لے کر نپولین کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے فرانس کی طرف بڑھ رہا تھا تو اسے مطلق خبر نہ تھی کہ اس کے سپاہی اپنے ساتھ ایسے جراثیم لائیں گے جو تخت و تاج کے لیے مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نپولین کی فوجیں جس جگہ پر پہنچیں، انہوں نے نوک سنگین سے انقلاب کے بیج بوئے۔ نپولین کی قائم کی ہوئی سلطنت واٹرلو کے میدان میں فنا ہوگئی اور وہ خود نظر بند ہو کر سینٹ ہلینا کی صحت رباغربت میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد جب روس کے سپاہی جو عموماً کسان تھے، اپنے گھروں کو واپس لوٹے تو ان کے سینے مشعل آزادی سے منور تھے۔

1817ء میں روس کے سپاہیوں نے ایک خفیہ انجمن بنائی۔ اس انجمن کا نام ''انجمن نجات'' تھا اس میں تین خیالوں کے آدمی شامل تھے۔ ایک طبقہ مرادیف کے رفقاء کا تھا جو انگیزوں کے دستور کو پسند کرتا تھا۔ دوسرا گروہ نکولائی تورگنیف کے رفیقوں کا تھا، جو صرف کاشتکاروں اور مزارعوں کی آزادی کا طالب تھا۔ تیسرے طبقے کا رہنما ریال پستل تھا۔ یہ لوگ کامل جمہوریت کے طلبگار تھے اور تخت و تاج کو نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے چونکہ اس انجمن میں اصولی اختلاف تھا اس لیے یہ کوئی مفید کام کئے بغیر ٹوٹ گئی اور اس انجمن کی جگہ ایک اور انجمن نے لے لی جس کا نام ''انجمن فلاح'' تھا اس کے سرگرم اراکین میں سے ایک پستل تھا اور دوسرا مشہور روسی شاعر لیف پستل فوج کا عہدہ دار تھا۔ اسے تبدیل کر کے جنوبی روس میں بھیج دیا گیا۔ جہاں اس نے اپنی سوسائٹی کو بہت مضبوط کر لیا اب ''انجمن

فلاح'' کی دو شاخیں ہو گئیں۔ شمالی شاخ رائی لیف کے ماتحت تھی اور دستوری حکومت چاہتی تھی۔ جنوبی شاخ پستل کے ماتحت تھی اور جمہوریت کی خواہاں تھی۔

1825ء میں الگزینڈر اول کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد تخت کا وارث اس کا بھائی کانستنائن تھا لیکن چونکہ الگزینڈر اول اپنے اس بھائی سے ناراض تھا اس لیے اس نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی کو ولی عہد بنا دیا تھا لیکن اس وصیت سے بے خبر تھے۔ اس لیے کانستنتائن نے اپنے عہد کے مطابق نکولس کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ ادھر نکولس نے کانستنتائن کی بادشاہی کا اگلان کر دیا۔ گو اس وقت بظاہر دو بادشاہ تھے لیکن حقیقتاً ایک بادشاہ بھی نہ تھا ''انجمن فلاح'' کے کارکنوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ چونکہ یہ بغاوت دسمبر 1825ء میں ہوئی تھی اس لیے یہ ''دسمبریوں کی بغاوت'' کے نام سے مشہور ہے اور اس بغاوت میں شریک ہونے والوں کو ''دسمبریوں'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

پستل دوران بغاوت میں جنوبی روس میں گرفتار کر لیا گیا۔ رائی لیف نے لینن گراڈ میں ہنگامہ برپا کر کے شاہی محل کی بنیادیں ہلا دیں مگر نکولس نے آتش بازی کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ پستل میدان جنگ میں بارود اور گولیوں سے کھیلنے والے جرنیل نے دوران مقدمہ میں اپنے ایک ساتھی کا نام بتا دیا۔ اس پر تمام باغی پکڑے گئے مگر غیر مرئی اشیاء کا مطالعہ کرنے والے شاعر رائی لیف کو عدل وانصاف کے بھیانک پتلے مرعوب نہ کر سکے۔ وہ آخر وقت تک یہ کہتا رہا کہ سارا جرم اس کا ہے اور باقی سب بے گناہ ہیں۔

نکولس نے اس بغاوت کے پانچ سر کردہ رہنماؤں کو پھانسی لٹکا دیا اور باقی ''دسمبریوں'' کو سائبریا کے یخ بستہ میدانوں میں جلاوطن کر دیا۔ آتش انقلاب کو سرد کرنے کے لیے رائی لیف اور پستل تختہ دار پر لٹکا دیئے گئے۔

اب نکولس نے جبر و تشدد اور رفنا کو بادہ ہر جام کر دیا۔ تمام اصلاحات روک لیں۔ طلبہ اور اخبار نویسوں پر علی الخصوص سخت پابندیاں عائد کیں۔ درس گاہوں میں فلسفے اور اقتصادی کی تعلیم ممنوع قرار دی۔ نکولس نے تیس سال تک ایک جابر اور قاہر بادشاہ کی طرح حکومت کی۔ جاسوس اور سنسر اس کے تاج و تخت تھے۔ اس کی حکومت کا مدار استبداد کے سوفاروں پر تھا۔ ہر روسی کی زندگی اور موت کے درمیان جاسوس حائل تھے۔ خاموشی اور اظہار کے درمیان سنسر کا پردہ لٹک رہا تھا۔ کلک ادیب ضبط کر لی گئی۔۔۔ ایک لاکھ پچاسی ہزار روسی جلاوطن کر دیئے گئے اور لاکھوں انسان روسی زندانوں کی رونق بڑھا رہے تھے۔ غرضیکہ نکولس کے عہد حکومت میں روس کی حالت بے حد نازک ہو گئی تھی۔ اس کی خارجی حکمت عملی نے اسے تمام یورپ میں بدنام کر دیا۔ اس نے پولستان کو روس سے ملحق کر دیا۔ روس کی آمدنی کا چالیس فیصدی فوج پر خرچ کیا جاتا۔ نکولس اپنی فوج پر بہت نازاں تھا لیکن کریمیا کی جنگ میں اسے ان کی کمزوری کا احساس ہوا۔ وہ سپاہی جو نپولین کی فوجوں کو تنگ کرتے رہے۔ ترکی اور برطانوی سنگینوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس دوران میں عوام کی آنکھوں سے زاریت کا رعب کا پردہ اٹھ گیا۔ روس نے جنگ کے بعد وہی کیا جو جرمن نے جینا کے بعد کیا تھا۔

1855ء میں نکولس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا الگزینڈر دوئم تخت پر بیٹھا۔ ا

س نے اپنے باپ کی عائد کردہ تمام پابندیاں دور کرنا شروع کر دیں۔ اخباروں سے سنسر اٹھا لے۔ 1821ء میں اس نے کاشت کاروں کو کچھ مراعات بھی دیں۔ اب نظام حکومت کی کچھ خوبیاں بروئے کار آنے لگیں۔ اسی دوران میں ''عدمیوں'' کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جو بادشاہوں کو موت کے گھاٹ اتارنا سب سے بڑی خدمت سمجھتا تھا۔

''عدمیوں'' کی اصطلاح روس میں سب سے پہلے تو رگنیف کے ناول'' خلاف و اسلاف'' میں نظر آتی ہے یہ ناول 1826ء میں شائع ہوا تو رگنیف دیکھتا ہے کہ دانش گاہوں کے طالب علم اپنے نظریہ حیات میں عوام سے بالکل جدا ہیں۔ وہ ان میں نئی روح کارفرما دیکھتا ہے۔ فی الحقیقت یہ عدمی اپنی قسم کے واحد لوگ تھے۔ عدمی لڑکے اپنے بالوں کو کندھوں پر اٹھائے ماسکو کے گلی کوچوں میں چکر کاٹتے۔ وہ عوام سے بلا تکلف گفتگو کرتے اور تجدید پسندی کا درس دیتے عدمی لڑکیاں ترشوائے ہوئے بالوں سے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرتیں۔ نیلگوں چشموں نے ان کے دانش مند چہروں کی زینت کو دوبالا کیا ہوتا۔۔۔۔۔ جہالت کدہ روس میں حسن انقلاب کی دعوت دے رہا تھا۔

الگزنڈر بہت کمزور دل تھا۔ ملک کی بری حالت دیکھ کر اکثر اس کے دل میں اصلاح کا جذبہ پیدا ہوتا مگر اس کے دربار کے منحوس کوؤں کی کائیں کائیں اسے کچھ نہ کرنے دیتی۔ جب اس کے مشیر اس سے یہ کہتے کہ اصلاحات سے سلطنت ضائع ہو جائے گی تو ہمدردی کا جذبہ اس کے دل میں سرد پڑ جاتا۔ تاہم اس نے اصلاحات کے دامن سے اشک شوئی کی کوشش کی مگر عدمی ان طفل تسلیوں کو خاطر

میں نہ لانے والے تھے۔ وہ فوری تغیر کے آرزومند تھے۔ وہ اشتراکی نظام حکومت کے خواہاں تھے۔ چونکہ مرکزی حکومت میں ان کو اقتدار حاصل تھا اس لیے وہ اپنے عقائد کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ اعلیٰ درس گاہوں سے مبلغ تبلیغ کے لیے نکل آئے۔ ہر مبلغ آزاد تھا کہ وہ جس طرح چاہے اپنے عقائد لوگوں تک پہنچائے۔

اسی دوران میں الگزنڈر پر دو مرتبہ ناکام حملے ہوئے۔ انجام کار 1818ء میں ایک نوجوان لڑکی نے اسے مہلک طور پر زخمی کر دیا اور ایک گھنٹے کے بعد روس کی فضاء میں اس بادشاہ نے سانس لینا بند کر دیا۔

الگزنڈر دوئم کی وفات کے بعد اس کے بیٹے الگزنڈر ثالث نے حکومت کی۔ اس کے عہد میں جبر وتشدد کا بازار خوب گرم ہوا۔ سائبیریا کے زندانوں میں صدہا محبان وطن ٹھونس دیئے گئے۔ آزادی کے پرستاروں کے لیے یہ سخت مصائب کا دور تھا۔ قہر وغضب کی تلوار ہر روسی کی گردن پر معلق ہو چکی تھی۔۔۔۔ لیکن آزادی کا یہ سیلاب ایسے بند باندھنے پر رک نہ سکا۔ بادشاہت رعایا کے مقابلے کی تاب نہ لا سکی۔ استبداد کی آندھیاں ٹمٹماتے چراغوں کو گل کر سکتی ہیں مگر انقلاب کے شعلوں پر ان کا کوئی بس نہیں چلتا۔ نوجوان روسی اپنے سینوں میں انتقام کی آگ سلگاتے ہوئے بڑھے اور بڑھتے گئے۔

1894ء میں الگزنڈر ثالث کا انتقال ہو گیا اور نکولس ثانی زار بنا، جو خاندان رومانوف کا بہادر بادشاہ تھا۔ یہ زار روس کا آخری بادشاہ تھا 1905ء میں جاپان کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی اس میں روس کی شکست نے باشندگان روس کو نظام

حکومت کا اور بھی زیادہ دشمن کر دیا۔ 1905ء میں مزدوروں نے اپنی شکایت کو زار کے بند کانوں تک پہنچانے کی غرض سے ایک مظاہرہ کیا۔ مزدوروں کے اس گروہ پر حکومت کی طرف سے گولیاں برسائی گئیں۔ صدہا مزدور مشعل آزادی پر پروانہ وار فدا ہو گئے۔

روسی محبان وطن میں تراسکی اور لینن بھی شامل تھے۔ ولادی میرا پیلچ لینن 10 اپریل 1870ء کو ایک زمیندار کے گھر پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ قازان یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ بچپن ہی میں اس کے خیالات بہت انقلابی تھے۔ ابھی اسے یونیورسٹی میں داخل ہوئے صرف ایک ماہ کا ہی عرصہ گزرا ہوگا کہ طلبہ کی تحریک انقلاب میں حصہ لینے کی بناء پر اسے وہاں سے نکال دیا گیا لیکن اس کے باوصف اس نے وکالت کی سند حاصل کر لی۔ لینن نے وکالت کو اپنا پیشہ قرار نہ دیا کیوں کہ مارکس کی طرح اس کا مطمع نظر بھی بہت بلند تھا۔ دو سال کی لگاتار کوششوں کے بعد اس نے پیٹروگراڈ میں ایک جماعت بنائی۔ اس کا نام اس نے ''لیبر یونین'' رکھا اسی دوران میں اس نے ایک انقلابی پمفلٹ شائع کیا مگر یہ حکومت نے ضبط کر لیا۔

لینن کی خطرناک سرگرمیوں کو دیکھ کر حکومت نے 1895ء میں اسے سائبریا جلاوطن کر دیا۔ جلاوطنی کے ان ایام میں اس نے مارکسی لٹریچر سائنس اور فلسفے کا خوب مطالعہ کیا۔ ہیگل اور دیگر مفکرین کی تصانیف کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد لینن خود اسی زمانہ میں ایک کتاب ''روس کی مجلسی آزادی کے وسائل'' ضبط تحریر میں لایا۔ اس کتاب کے علاوہ اس نے ایک اور تصنیف بھی شائع کی جو عوام پر

بہت اثر انداز ہوئی۔ اس نے ان کے دماغوں میں شخصیت، سرمایہ داری اور ساہو کاری کیخلاف منافرت کے جراثیم پیدا کر دیئے۔

کچھ عرصے کے بعد زار نے لینن کو روس واپس آنے کی اجازت دے دی مگر اس نے غیر ممالک میں رہائش اختیار کرنے کو ترجیح دی اور 1905ء میں پہلی بالشویک کانگریس منعقد ہوئی گویا روس میں انقلاب کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس کانگریس میں بالکل ابتدائی مراحل طے کئے اور لینن نے ثابت کیا کہ بالشویک ایک مضبوط چٹان کے مانند ہیں، جو اپنے عقائد میں ثابت قدم رہ کر ہر قسم کی قربانیاں دینے کے لیے تیار ہیں جنوری 1912ء میں بمقام پر یگ دوسری بالشویک کانگریس کا انعقاد ہوا جس سے تحریک میں دوبارہ زندگی پڑ گئی۔

اسی دوران میں آزادی گفتار اور فکر و مذہب کا مطالعہ شروع ہو گیا تھا۔ 18 فروری 1905ء میں نکولس کے چچا پر دن کے وقت بم پھینکا گیا۔ انقلابیوں کا عام دستور ہو گیا کہ جو شخص جبر و استبداد میں نمایاں حصہ لیتا، اسے ہلاک کر ڈالتے۔ نکولس نے انقلابی سرگرمیوں کی یہ رفتار دیکھ کر پارلیمنٹ کی ترتیب کا فیصلہ کیا لیکن اس کے اختیارات بہت محدود رکھے۔ تاہم پارلیمنٹ کے ارکان کی کثیر تعداد اپنے اختیارات کو بہتر سے بہتر طریق پر استعمال کرنے کا عزم کر چکی تھی۔ ان کی طرف سے جو تجاویز بھی پیش کی گئیں، وہ وزیر اعظم نے مسترد کر دیں نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹ کو موقوف کر دیا گیا۔ یہ 1906ء کے واقعات ہیں پارلیمنٹ موقوف کرنے کے بعد کسانوں اور مزدوروں کی دلداری کا کچھ سامان کیا گیا مگر یہ نمائشی کھلونے انہیں رام نہ کر سکے۔

دوسری پارلیمنٹ 1906ء میں منعقد ہوئی۔ اسے متاثر و مرعوب کرنے کے لیے پولیس نے زار کے قتل کی ایک فرضی سازش کا خاکہ تیار کیا اور اس طرح کوشش کی گئی کہ پارلیمنٹ کی رکنیت سے اشتراکیوں کو خارج کر دیا جائے۔ پارلیمنٹ نے اس فیصلے کی تائید سے انکار کر دیا۔ لہٰذا اسے بھی موقوف کر دیا گیا۔

نومبر 1908ء میں نئے قانون انتخاب کے ماتحت تیسری پارلیمنٹ منتخب ہوئی یہ پارلیمنٹ بھی استبداد کے لیے آرام کا کوئی سامان مہیا نہ کر سکی۔ یہ صرف 1912ء تک قائم رہی 1912ء میں دوبارہ انتخاب ہوا جس میں تقریباً پہلے ہی ارکان پھر منتخب ہوئے۔ بہ ظاہر اصلاح کا عمل جاری رہا اس کے ساتھ ساتھ ایک پارٹی اندر ہی اندر انقلاب کے لیے کوشاں تھی تا آنکہ یورپ میں جنگ چھڑ گئی۔

اس وقت لینن گلیشیا کے ایک گاؤں میں اقامت پذیر تھا۔ اس کے اور زینوویف کے سامنے یہ سوال حل طلب تھا کہ جرمنی کی اشتراکی جماعت کو اس جنگ کی مخالفت کرنی چاہیے یا نہیں لینن کا خیال تھا کہ یہ جماعت جنگ کے خلاف رائے دے گی لیکن زینوویف کو اس رائے اسے اختلاف تھا چنانچہ جرمن کی اشتراکی مجلس نے صاف لفظوں میں جنگ کی حمایت کی جس سے لینن کو سخت صدمہ پہنچا۔

دراصل لینن کی خواہش تھی کہ روس جنگ میں شکست کھائے اور صلح پر مجبور ہو اس لیے روس کی شکست کے سوا انقلاب کو کامیاب بنانے کی کوئی اور شکل نہ تھی آخر 1918ء کے آغاز میں حالات نے نازک ترین صورت اختیار کر لی۔ ابتداء

خالی معدے کی بغاوت سے ہوئی۔ لینن گراڈ کے ایک مجمع نے بھوک سے تنگ آ کر نان بائیوں کی دکانوں کا محاصرہ کرلیا۔ پولیس نے ان پر گولیاں چلائیں لیکن لینن گراڈ کے سپاہیوں نے پولیس کو مار کر ہٹا دیا۔ حوصلہ پا کر مجمع نے اسلحہ خانے پر حملہ کر دیا۔ جیل خانے کے دروازے توڑ ڈالے اور صدر کوتوالی میں آگ لگا دی۔ شام کو مختلف پارٹیوں کے نمائندے منتخب ہوئے اور رو دزیانکو کی صدارت میں ایک زبردست جلسہ منعقد کیا گیا۔ زار کو اس مضمون کے تار بھیجے گئے۔ ملک اور شاہی خاندان کے فیصلے کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔۔۔ لیکن ان تاروں کا کوئی جواب نہ آیا۔ آخر کار رو دزیانکو نے رفقاء کے کہنے پر ایک عارضی حکومت کے قیام کا بندوبست کر دیا۔ اس عارضی حکومت میں کرنسکی وزیر عدالت بنا۔ یہ حالات دیکھ کر جب زار نے شاہی محل تک پہنچنے کی سعی کی تو راستہ رکا ہوا پایا اور جنرل روڈ کی کے ہیڈ کوارٹر چلا گیا۔ یہاں اسے تخت سے دست بردار ہونے کو کہا گیا۔ وہ اپنے بیٹے کے حق میں دست بردار ہونے کے لیے تیار ہو گیا مگر جب ڈاکٹروں نے یہ بتایا کہ اس کے بیٹے کی بیماری لاعلاج ہے تو اس نے چھوٹے بھائی مائیکل کو تخت نشین کرنا چاہا مگر اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ اس وقت تک تاج و تخت کو قبول نہیں کرے گا جب تک مجلس ملی اس پر رضامند نہ ہو گی۔ یہ شاہی خاندان کے خاتمے کا اعلان تھا 12 مارچ 1918ء کو مائیکل پر سلطنت کا خاتمہ ہو گیا عارضی حکومت نے نکولس کو اس کے محل میں قید کر کے باہر پہرے لگا دیئے۔

1918ء میں لینن چھپ چھپا کر دفعتاً پیٹرو گراڈ آ پہنچا اور وہاں نامساعد حالات کی بناء پر عام انقلاب کرانے میں کامیاب ہو گیا اور ملک کے تمام نظام

جمہور کے ہاتھ میں دے دیا 14 نومبر کو لینن نے ماسکو پر قبضہ کرلیا۔کرنسکی بھاگ کر بصد وقت انگلستان پہنچا ایک مجلس ملی منتخب کی گئی اس مجلس نے ایگزیکٹو کمیٹی کے ارکان منتخب کیے ان کا صدر لینن بن گیا۔۔۔۔زاریت مغلوب اور اشتراکیت غالب آئی۔

جب بالشویکوں کو اقتدار حاصل ہوا تو وہ شاہی خاندان کو بالسک سے ایکاتر نبرگ لے آئے اور یہیں 18 جولائی 1918ء کو بروز کی نامی ایک شخص نے بالشویک حکومت کے ایماء پر سارے خاندان کو چند خادموں اور خادماؤں سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا۔لاشوں کو پٹرول ڈال کر جلایا گیا اور ان کی راکھ کانوں کی تہہ میں بکھیر دی گئی۔

لینن اور اس کے بعد بالشویک پارٹی نے روس کے نشوو ارتقاء کے لیے جو کچھ کیا اس کی تفصیل کے لیے ایک علیحدہ طویل مقالے کی ضرورت ہے۔روس کے اصول ونظریات 1918ء کے مقابلے میں اس وقت بڑے معتدل ہیں۔تقریباً تمام حکومت کے ساتھ اس کے سیاسی وتجارتی تعلقات قائم ہو چکے ہیں۔اس وقت بالشویک روس ان تمام علاقوں میں قابض ہے جو زاروں کے زمانے میں روس کے اجزاء تھے۔روس میں سولہ کروڑ آدمی اپنے پنج سالہ پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے روز و شب بڑی سرگرمی کے ساتھ مصروف ہیں۔بہت سی زائد اراضی مشترک ہو کر زیر کاشت لائی گئی ہیں۔ان میں نئے وضع کے ہل چلا کر پیداوار کو بڑھایا گیا ہے۔کروڑوں آدمی اپنے جوش میں نئے اشتراکی کام کی تکمیل میں مصروف ہیں جنگ عظیم سے پہلے ستر لاکھ بچے تعلیم پاتے تھے۔1931ء میں

ایک کروڑ دس لاکھ تھے مگر اب روس کا ہر فرد خواندہ ہے۔ ہر بچے کا خرچ حکومت برداشت کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ کمانے کے لائق ہو جائے۔ اشترا کی روسی بچوں کی جماعت میں اپنے آئندہ کے حامی و اتحادی پیدا کر رہے ہیں۔ وہ اپنے شہریوں کے مفاد کو اشترا کی دولت کے مفاد سے ملا کر ہر فرد و بشر کو اس دولت کا اک آلہ کار بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی صحت، تعلیم اور فراغت کی محافظ حکومت ہے، ماسکو کے قریب پبلک باغ میں ہر روز تقریباً ایک لاکھ سیر کرنے والوں کا اجتماع ہوتا ہے۔

اشتمالیت نے روسی عورتوں کو اس کی صدیوں کی غلامی سے رہا کر دیا ہے۔ اب روس میں اشتمالی باورچی خانے ہیں۔ کھیتوں میں بچوں کی نگہداشت کا انتظام ہے اب شادی کی بنیاد نہ مذہب پر ہے اور نہ کسی عدالتی معاہدے پر گو اشتمالی خیال کے آدمی بدستور لا مذہب ہیں علماء ادباء کی جماعت تخلیقی کام میں مصروف ہے اور بالعموم روسیوں کے پیش نظر ایک عظیم الشان مشترکی مطمع نظر ہے جو انہیں ہر روز آگے بڑھائے لیے جاتا ہے انہیں یقین ہے کہ وہ ایک نئی دنیا کی طرح ڈال رہے ہیں اور یہ کہ ان کی مساعی کے باعث نوع انسان کا مستقبل شاندار ہو جانے والا ہے۔ گو یہ کہا جاتا ہے کہ روحانیت کے بغیر اشتمالیت کا پودا پروان نہ چڑھے گا لیکن اس حقیقت کو کوئی دوست، دشمن نظر انداز نہیں کر سکتا کہ باوجود انتہائی مشکلات اور شدید مخالف کے روس کو اپنے نئے تجربات میں حیرت انگیز کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ روس کا موجودہ آمر مسٹر سٹالن اپنے ملک کی فضاء کو خوشگوار سے خوشگوار تر بنا رہا ہے۔

باتیں

بمبئی آیا تھا کہ چند روز پرانے دوستوں کے ساتھ گزاروں گا اور اپنے تھکے ہوئے دماغ کو کچھ آرام پہنچاؤں گا مگر یہاں پہنچتے ہی وہ جھٹکے لگے کہ راتوں کی نیند تک حرام ہوگئی۔

سیاسیات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں لیڈروں اور دوافروشوں کو میں ایک ہی زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ لیڈری اور دوافروشی یہ دونوں پیشے ہیں۔ دوافروش اور لیڈر دونوں دوسروں کے نسخے استعمال کرتے ہیں۔ خیر کہنا یہ ہے کہ سیاسیات سے مجھے اتنی دلچسپی ہے جتنی گاندھی جی کو سینما سے گاندھی جی سینما نہیں دیکھتے، میں اخبار نہیں پڑھتا۔ اصل میں ہم دونوں غلطی کرتے ہیں۔ گاندھی جی کو فلم ضرور دیکھنے چاہئیں اور مجھے اخبار ضرور پڑھنے چاہئیں۔

خیر صاحب بمبئی پہنچا وہی بازار تھے، وہی گلیاں تھیں جن کے پتھروں پر پانچ برس میرے نقش قدم بکھرتے رہے تھے۔ وہی بمبئی تھی جہاں میں دو ہندو مسلم فساد دیکھ چکا تھا۔ وہی خوبصورت شہر تھا جس کے اندر میں نے کئی بے گناہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے خون کے چھینٹے اڑتے دیکھے تھے۔ وہی جگہ تھی جہاں کانگریس نے امتناع شراب کا قانون پاس کر کے ان ہزارہا مزدوروں کو بے کار کر دیا تھا جو تاڑی نکالتے تھے۔ وہی مقام تھا جہاں میں نے کئی دھوبیوں کو جو بارہ بارہ گھنٹے پانی میں کھڑے رہتے تھے، رات کو اپنے جسم میں گرمی پیدا کرنے کے لیے زہریلی اسپرٹ پیتے دیکھا تھا۔۔۔۔وہی عروس البلاد تھی جس کے گھونگھٹ کا ایک حصہ

حریری ہے اور دوسرا موٹے اور کھردرے ٹاٹ کا تھا۔۔۔۔وہی بمبئی تھا جہاں اونچی اونچی عمارات کے قدموں میں فٹ پاتھوں پر ہزار ہا مخلوق رات کو سوتی ہے۔

میں نے بس میں سوار ہوتے ہوئے ایک عورت کو دیکھا پھر دیکھا۔۔۔اب کے غور سے دیکھا۔۔۔۔آہ، حقیقت میرے سامنے تھی، ان کالے حلقوں کی صورت میں جو اس لڑکی کی شربتی آنکھوں کے نیچے پڑے تھے۔ میں نے اس سے نام پوچھا (نام نہیں بتاؤں گا) یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔؟ میں نے اس لڑکی کو دلی میں دیکھا تھا۔ مغلوں کی دلی میں جنہیں مقبرے بنانے کا بہت شوق تھا۔ کتنی بھولی بھالی تھی صرف دس مہینے پہلے وہ کس قدر معصوم تھی۔ میں اس سے ڈر کے مارے بات تک نہ کرتا تھا۔ میں اس کو دیکھتا تھا تو مجھ پر رعب سا طاری ہو جاتا تھا۔ پر اب میں نے دیکھا تو مجھے اس کے اور اپنے درمیان کوئی چیز بھی حائل محسوس نہ ہوئی۔ میں نے اس کے کاندھے پر بے دھڑک ہاتھ رکھ کر اس سے پوچھا ''کہو، کیسی گزر رہی ہے'' اس کی آنکھوں میں ایک دھندلی سی چمک پیدا ہوئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دیا جو کبھی مندر میں جلتا تھا، اب دیر سے کسی ویشیا کے گھر میں جل رہا ہے۔ دیر سے بہت دیر سے۔۔۔۔۔۔یہ بمبئی کتنی لڑکیوں کو عورتوں میں تبدیل کر چکا ہے؟۔۔۔۔۔عصمت کی حفاظت ضروری ہے مگر پیٹ کی بھوک مٹانا بھی ضروری ہے یہاں بمبئی میں آ کر معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو بھوک بھی لگتی ہے۔

دو ہندو مسلم فساد اس شہر میں دیکھ چکا ہوں بنائے فساد وہی تھی، پرانی! مندر اور مسجد۔۔۔۔گائے اور سور مندر اور مسجد اینٹوں کا ڈھیر، گائے اور سور، گوشت کا

ڈھیر پر اس دفعہ ایک نیا فساد دیکھنے میں آیا ہندو مسلم فساد نہیں مندر اور مسجد کا جھگڑا نہیں، گائے اور سور کا قضیہ نہیں، ایک نئے قسم کا بلوہ، ایک نئے قسم کا طوفان جو بمبئی میں تقریباً چھ روز مچا رہا۔

ایک روز ٹیلی فون پر کسی صاحب نے مجھے بتایا کہ رات رات میں کانگریس کے تمام لیڈر گرفتار کر لئے گئے، گاندھی جی سمیت جو کانگریس کے ممبر نہیں ہیں۔۔۔ میں نے کہا، اچھا بھئی، گرفتار کر لئے گئے ہیں تو ٹھیک ہیں، یہ لوگ گرفتار اور رہا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مجھے کوئی اچنبھا نہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک دوست نے رنگ کیا تو معلوم ہوا کہ شہر بھر میں بلوہ مچ گیا ہے۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا ہے، گولی چلائی ہے، فوج بلائی گئی ہے۔ بازاروں میں ٹینک چل رہے ہیں۔۔۔۔۔ دو تین روز سے میں گھر سے باہر نہ نکل سکا۔ اخبار پڑھتا رہا اور لوگوں سے بھانت بھانت کی خبریں سنتا رہا۔

مسلم لیگ مسجد ہے، کانگریس مندر ہے۔ لوگوں کا یہی خیال ہے اخبار بھی یہی کہتے ہیں، کانگریس سوراج چاہتی ہے، مسلم لیگ بھی لیکن دونوں کے راستے جدا جدا ہیں دونوں مل جل کر کام نہیں کرتے اس لیے کہ مندر اور مسجد ساخت کے اعتبار سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ میرا خیال تھا کہ یہ جو فساد ہو رہا ہے اس میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو جائیں گے اور ان دونوں کے خون کا ملاپ جو مندروں اور مسجدوں میں نہیں ہوتا موریوں اور بدروؤں میں ہو گا مگر تعجب ہوا، جب میرا یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔

ماہم کی طرف ایک لمبی سڑک جاتی ہے سڑک کے آخری سرے پر مسلمانوں کی

مشہور خانقاہ ہے مسلمان مردہ پرست مشہور ہیں۔ جب بلوہ شروع ہوا اور شہر کے اس حصے تک پہنچ گیا لڑکوں اور بچوں نے فٹ پاتھوں کے درخت اکھیڑ اکھیڑ کر بازار میں رکھنے شروع کیے تو ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ چند ہندو لڑکے لوہے کا ایک جنگلہ گھسیٹ کر اس طرف جانے لگے۔ جدھر خانقاہ ہے چند مسلمان آگے بڑھے، ان میں سے ایک نے بڑی آہستگی سے ان لڑکوں سے کہا ''دیکھو بھئی ادھر مت آؤ۔۔۔۔ یہاں سے پاکستان شروع ہوتا ہے'' سڑک پر ایک لکیر کھینچ دی گئی ہے چنانچہ بلوہ پسند لڑکے چپ چاپ اس جنگلے کو اٹھا کر دوسری طرف لے گئے کہتے ہیں کہ ''پاکستان'' کی طرف پھر کسی ''کافر'' نے رخ نہ کیا۔

بھنڈی بازار مسلمانوں کا ایک علاقہ ہے وہاں کوئی شورش نہ ہوئی۔ مسلمان وہ مسلمان جو ہندو مسلم فساد میں سب سے پیش پیش ہوتے تھے، اب ہوٹلوں میں چائے کی پیالیاں سامنے رکھ کر فساد کی باتیں کرتے تھے اور ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے۔ میں نے ایک مسلمان کو اپنے دوست سے کہتے سنا ''ہمارے جناح صاحب! دیکھئے ہمیں کب آرڈر دیتے ہیں''

اسی بلوے کا ایک لطیفہ سنئے

ایک سڑک پر ایک انگریز اپنی موٹر پر جا رہا تھا چند آدمیوں نے اس کی موٹر روک لی انگریز بہت گھبرایا کہ نہ معلوم یہ سر پھرے لوگ اس کے ساتھ کس قسم کا وحشیانہ سلوک کریں گے مگر اس کو حیرت ہوئی کہ جب ایک آدمی نے اس سے کہا دیکھو، دیکھو اپنے شوفر کو پیچھے بٹھاؤ اور خود اپنی موٹر ڈرائیور کرو۔۔۔۔ تم نوکر بنو اور اس کو اپنا آقا بناؤ۔

انگریز چپکے سے اگلی سیٹ پر چلا گیا۔ اس کا شوفر بوکھلایا ہوا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بلوہ پسند لڑکے اتنی سی بات سے خوش ہو گئے انگریز کی جان میں جان آئی کہ چلو سستے چھوٹ گئے۔

ایک جگہ بمبئی کے ایک اردو اخبار کے ایڈیٹر صاحب پیدل جا رہے تھے۔ بل وصول کرنے کی خاطر انہوں نے سوٹ ووٹ پہن رکھا تھا، ہیٹ بھی لگی تھی، ٹائی بھی موجود تھی۔ چند فسادیوں نے انہیں روک کر کہا "یہ ہیٹ اور ٹائی اتار کر ہمارے حوالے کر دو" ایڈیٹر صاحب نے ڈر کے مارے یہ دونوں چیزیں ان کے حوالے کر دیں جو فوراً دہکتے ہوئے الاؤ میں جھونک دی گئیں اس کے بعد ایک ایڈیٹر صاحب کا سوٹ دیکھ کر کہا "یہ بھی تو انگریزی ہے" اسے کیا نہیں اتروانا چاہیے؟ ایڈیٹر صاحب سٹپٹائے کہ اب کیا ہو گا؟ چنانچہ انہوں نے بڑی لجاجت کے ساتھ ان لوگوں سے کہا دیکھو، میرے پاس صرف یہی ایک سوٹ ہے جسے پہن کر میں فلم کمپنیوں میں جاتا ہوں اور مالکوں سے مل کر اشتہار وصول کرتا ہوں تم اسے جلا دو گے تو میں تباہ ہو جاؤں گا، میری ساری بزنس برباد ہو جائے گی۔

جس محلے میں رہتا ہوں، وہاں کرسچین آباد ہیں۔ ہر رنگ کے کرسچن سیاہ فام کرسچنوں سے لے کر گورے چٹے تک آپ کو تمام شیڈ میں یہاں مل جائیں جامنی رنگ کے کرسچن بھی میں نے یہاں دیکھے ہیں جو خود کو ہندوستان کی فاتح قوم یعنی انگریزوں میں شمار کرتے ہیں۔

اس بلوے میں ان لوگوں کا میں نے برا حال دیکھا پتلون میں مردوں اور سکرٹس میں عورتوں کی پتلی ٹانگیں کانپتی تھیں۔ جب فساد کی خبریں آتی

تھیں۔۔۔۔۔ڈر کے مارے مردوں نے ہیٹ لگانے چھوڑ دیئے، ٹائیاں گلے سے الگ کر دیں۔عورتوں نے سکرٹس اور فراک پہننے چھوڑ دیئے اور ساڑھیاں پہننا شروع کر دیں۔

ہندو مسلم فساد کے دنوں میں ہم لوگ جب باہر کسی کام سے نکلتے تھے تو اپنے ساتھ دو ٹوپیاں رکھتے تھے ایک ہندو کیپ، دوسری رومی ٹوپی جب مسلمانوں کے محلے سے گزرتے تو رومی ٹوپی پہن لیتے تھے اور جب ہندوؤں کے محلے میں جاتے تھے تو ہندو کیپ لگا لیتے تھے۔۔۔۔۔اس فساد میں ہم لوگوں نے گاندھی کیپ خریدی۔یہ ہم جیب میں رکھ لیتے تھے جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوتی تھی جھٹ سے پہن لیتے تھے۔۔۔۔۔پہلے مذہب سینوں میں ہوتا تھا آج کل ٹوپیوں میں ہوتا ہے سیاست بھی اب ٹوپیوں میں چلی آئی ہے۔۔۔۔۔زندہ باد ٹوپیاں!

میرے سامنے دیوار پر ایک کلاک آویزاں ہے۔۔۔۔۔۔ابھی بھی اس نے بارہ بجائے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ چار بجے ہیں جب چار کا وقت ہو گا تو یہ بارہ بجائے گا اس میں کوئی خرابی واقع ہو گئی ہے میں نے اب سوچنا شروع کیا ہے تو مجھے اس کلاک میں اور ہمارے عوام کی موجودہ حالت میں صد گونہ مماثلت نظر آتی ہے۔کلاک کی طرح ان کے کل پرزوں میں بھی کوئی خرابی ہے۔یوں تو کلاک کی سوئیوں کی طرح وہ اپنا کام ٹھیک کرتے ہیں لیکن ان کے فعل اور اس کے ظاہری نتیجہ میں بہت تضاد ہوتا ہے، بالکل اسی کلاک کے مانند جو بارہ کے عمل پر چار دفعہ ٹن ٹن کرتا ہے اور چار بجنے پر بارہ دفعہ ٹن ٹن کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

لوگ اپنے آپ کو مدہوش کیوں کرتے ہیں؟

اس حقیقت کی کیا توضیح ہو سکتی ہے کہ لوگ ایسی اشیاء استعمال میں لاتے ہیں جو انہیں بے خود و مدہوش بنا دیں مثال کے طور پر شراب، بیئر، چرس، گانجا، افیم، تمباکو اور دوسری چیزیں جو زیادہ عام نہیں مثلاً پتھر، مارفیا وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔ان منشیات کا استعمال کیوں شروع ہوا؟۔۔۔ان کا استعمال اتنی جلدی کیوں عام ہو گیا ہے۔ مہذب اور غیر مہذب لوگوں میں ان کی کھپت کیوں روز بروز بڑھ رہی ہے؟۔۔۔۔۔۔یہ کیا بات ہے کہ جہاں شراب یا بیئر نہیں ملتی، وہاں افیم، گانجا اور چرس وغیرہ کا استعمال عام ہے اور تمباکو دنیا کے ہر کونے میں پیا جاتا ہے۔

لوگ اپنے آپ کو مدہوش کیوں کرتے ہیں؟

آپ کسی سے یہ سوال پوچھئے کہ اس نے کیوں پینا شروع کی اور یہ کہ اب وہ کیوں پیتا ہے تو غالباً یہ جواب دے گا شراب بڑی خوش گوار چیز ہے۔۔۔۔اور ۔۔۔۔۔پھر سبھی تو پیتے ہیں'' شاید وہ یہ بھی کہے۔ ''میں پیتا ہوں اس لیے کہ مجھے اس سے فرحت حاصل ہوتی ہے!'' اور وہ لوگ جنہوں نے آج تک اس بات پر غور کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی کہ شراب بری چیز ہے یا اچھی اپنے جواب میں یہ کہیں گے کہ وہ صحت قائم رکھنے کے لیے شراب پیتے ہیں۔۔۔۔یہ ایک ایسا بیان ہے جو آج سے بہت عرصہ پہلے بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے۔

کسی تمباکو پینے والے سے پوچھئے کہ حضرت! آپ نے کس ضرورت کے ماتحت تمباکو پینا شروع کیا اور اب آپ تمباکو کو کیوں پیتے ہیں تو اس کا جواب بھی

کچھ اس قسم کا ہوگا ''وقت کاٹنے کے لیے ہر شخص تمباکو پیتا ہے!''

وقت کاٹنے کے لیے، فرحت حاصل کرنے کے لیے۔۔۔وقت کاٹنے کے لیے، فرحت حاصل کرنے کے لیے اگر کوئی اپنی انگلیاں چٹخائے، سیٹی بجائے، کچھ گنگنائے یا اسی قسم کی کوئی اور چیز کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ایسا کرنے سے نیچر کی دولت ضائع نہیں ہوتی اور نہ کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جس کے بنانے پر بے شمار سرمایہ اور محنت صرف ہوئی ہو۔ اس کے علاوہ اس سے نہ اپنے آپ کو اور نہ دوسروں کو کوئی دکھ ہی پہنچتا ہے، لیکن تمباکو، چرس، تمباکو اور افیم بنانے پر لاکھوں آدمیوں کی محنت خرچ ہوتی ہے اور کروڑوں ایکڑ زمین بھنگ، پوست، انگور اور تمباکو کی کاشت کے لیے وقف کر دی جاتی ہے۔ علاوہ بریں یہ مسلمہ نقصان دہ چیزیں نہایت ہی خطرناک برائیاں پیدا کرنے کے کا موجب ہوتی ہیں اور لوگوں کو متعدی امراض اور جنگوں سے کہیں زیادہ تباہ و برباد کرتی ہیں۔ یہ تمام حقائق روز روشن کی طرح عیاں ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ ان کا استعمال ''وقت کاٹنے کے لیے فرحت حاصل کرنے کے لیے'' ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا اور نہ یہ بہانہ ہی چل سکتا ہے کہ ''ہر شخص پیتا ہے۔''

ان کے استعمال کی کوئی اور ہی وجہ ہے۔

ہم ہر روز ایسے آدمیوں سے ملتے ہیں جو اپنے بال بچوں سے محبت کرتے ہیں اور جو ان کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں لیکن وہ اس کے باوصف شراب، بھنگ، افیون یا چرس پر اتنا روپیہ خرچ کرتے ہیں جو ان کے غربت زدہ اہل و عیال کی حالت بہتر بنا سکتا ہے یا کم از کم ان کو افلاس سے نجات

دلا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے اہل وعیال کی ضروریات اور ان کی مشکلات پر مدہوش کرنے والی چیزوں کو ترجیح دیتا ہے تو کوئی اور ہی معقول وجہ کار فرما ہوتی ہے۔ یہاں ''وقت کاٹنے، فرحت حاصل کرنے کے لیے اور ہر شخص پیتا ہے۔'' کی دلیل جائز نہیں ہو سکتی۔ کوئی ٹھوس وجہ اس فعل کے ساتھ وابستہ ہے۔

یہ ٹھوس وجہ۔۔۔جیسا کہ میں نے اس موضوع پر کتابیں پڑھ کر دوسرے لوگوں کا مشاہدہ کر کے اور خاص طور پر اپنی اس حالت کا اندازہ کرنے کے بعد جب میں شراب اور تمباکو پیا کرتا تھا، سوچا ہے۔ مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی زندگی پر نظر کرے تو اکثر اوقات وہ اپنے اندر دو ہستیاں موجود پائے گا۔ ایک اندھی اور جسمانی ہے دوسری بصارت کی مالک ہے یعنی روحانی۔ اول الذکر اندھا حیوانی وجود کھاتا ہے، پیتا ہے، آرام کرتا ہے، سوتا ہے، بڑھتا ہے، حرکت کرتا ہے، بالکل کوک بھری مشین کے مانند، اور روحانی وجود جو کہ دیکھتا ہے یعنی بصارت کا مالک ہے، حیوانی وجود سے بندھا ہوا ہے، یہ اپنے آپ کچھ نہیں کرتا۔ صرف اپنے ساتھی کی حرکات جانچتا رہتا ہے۔ جب یہ حیوانی وجود کے کسی عمل کو پسند کرتا ہے تو اس کے اندر گھل مل جاتا ہے اور جب یہ اس کے عمل کو ناپسند کرتا ہے تو اس سے الگ ہو جاتا ہے۔

اس مشاہدہ و ملاحظہ کرنے والے وجود کی تشبیہ کمپاس کی سوئی سے دی جا سکتی ہے۔ جس کا ایک سرا شمال کی طرف اور دوسرا سرا جنوب کی طرف رہتا ہے۔ ہم کو اصل نقطے اور اس سوئی کا فرق صرف اسی صورت میں معلوم ہوتا ہے، اگر ہم غلط

سمت جا رہے ہوں۔ ٹھیک اسی طرح روحانی وجود جس کے اظہار کو ہم عام طور پر ضمیر کہتے ہیں کا ایک سر برائی کی طرف رہتا ہے اور دوسرا اچھائی کی طرف، اس روحانی وجود کی موجودگی سے باخبر ہونے کے لیے ہمیں کوئی ایسا فعل کرنا پڑے گا، جو ضمیر کے خلاف ہو کیوں کہ حیوانی وجود کا رخ اس مقام سے ہٹ جائے گا جس کی طرف ضمیر اشارہ کرتا رہتا ہے۔

جس طرح وہ جہاز ران جو اس بات سے آگاہ ہو کہ وہ غلطی کے رستے پر جا رہا ہے، جب تک کمپاس کے مطابق اپنا رخ ٹھیک نہ کر لے یا اپنی غلطی کے احساس کو قطعی طور پر نہ مٹا دے، چپو نہیں چلا سکتا اور نہ بادبانوں ہی سے کام لے سکتا ہے، ٹھیک اسی طرح وہ انسان جو اپنے حیوانی وجود کی حرکات اور ضمیر کی آواز کی دوئی سے آگاہ ہو، صرف اسی صورت میں اپنا کام جاری رکھ سکتا ہے، اگر وہ اسے ضمیر کے مطالبات کے ساتھ ہم آہنگ و منضبط کر دے، یا پھر ان اشارات سے بالکل غافل ہو جائے جو ضمیر اس کے حیوانی وجود کی غ ط روی پر اس تک پہنچتا ہے۔

1 اپنے افعال کو ضمیر کے ساتھ ہم آہنگ کرنا

2 ضمیر کی آواز پر اپنے کان بند کر لینا تا کہ حسب معمول زندگی بسر کی جا سکے۔

بعض حضرات پہلی بات پر عمل کرتے ہیں اور بعض دوسری پر اول الذکر بات صرف اخلاقی روشنی سے حاصل ہوتی ہے اور آخر الذکر بات کے لیے یعنی ضمیر کی آواز پر اپنے کان بند کر لینے کے لیے دو ذریعے ہیں۔ ایک خارجی اور ایک اندرونی خارجی ذریعہ یہ ہے کہ خود کو ایسے مشاغل میں مصروف رکھا جائے جو ہماری

توجہ ضمیر کے اشارات سے ہٹائے رکھیں اور اندرونی ذریعہ یہ ہے کہ خود ضمیر ہی کی روشنی کو آہستہ آہستہ گل کر دیا جائے اور اس میں اندھیرا پیدا ہو جائے۔

اپنے سامنے کی چیزوں کو نہ دیکھنے کے لیے انسان کے پاس دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ نگاہیں ہٹا کر کسی دوسری چیز کو دیکھنا شروع کر دیا جائے، جو زیادہ جاذب نظر ہوں اور دوسرا یہ کہ اپنی آنکھوں کی بصیرت کو مسدود کر دیا جائے۔ اسی طرح انسان ضمیر کی آواز پر اپنے کان دو طریقوں سے بند کر سکتا ہے۔ پہلا طریقہ خارجی ہے یعنی یہ کہ وہ اپنی توجہ مختلف مشاغل، تفکرات کھیلوں وغیرہ کی طرف مبذول کر دے اور دوسرا طریقہ اندرونی ہے یعنی یہ ہے کہ وہ توجہ پیدا کرنے والے عضو ہی کو معطل کر دے۔

ان لوگوں کے لیے جن کی قوت احساس کند ہوتی ہے اور جن کے اخلاقی احساسات محدود ہوتے ہیں، بیرونی تفریحات اکثر اوقات اس بات کے لیے کافی ہوتی ہیں کہ وہ ضمیر کے اشارات نہ سمجھیں لیکن ان لوگوں کے لیے جو اخلاقی طور پر کافی حساس ہوتے ہیں، ایسی تفریحات بالکل ناکافی ہیں۔

بیرونی ذرائع پورے طور پر شعور اور ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتے اور نہ شعور کے مطالبات ہی سے ہمیں قطعی طور پر غافل کر سکتے ہیں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ احساس یہ شعور ہماری زندگی میں روڑے اٹکانا شروع کر دیتا ہے۔ اب لوگ جو اپنے دن حسب سابق گزارنا چاہتے ہیں، اندرونی قابل اعتماد طریقے کو استعمال کرتے ہیں یعنی یہ کہ ضمیر ہی کو تاریک بنا دیا جائے چنانچہ اس کام کے لیے وہ دماغ کو مدہوش بنانے والی چیزوں سے زہر آلود کرتے ہیں۔

(2)

شراب، افیم، چرس، بھنگ اور تمباکو کا تو عالمگیر استعمال اس لیے نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں فرحت یا دل بستگی کا سامان مہیا کرتے ہیں بلکہ ان کا استعمال صرف اس لیے کیا جاتا ہے کہ ضمیر کے مطالبات سے خود کو چھپا لیا جائے۔

میں ایک روز بازار میں جا رہا تھا۔ میرے پاس سے دو گاڑی بان گزر رہے تھے۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا ''بے شک جب ہم ہوش میں ہوں تو ایسا کرتے ہوئے ہمیں شرم محسوس ہوتی ہے'' جب آدمی ہوش میں ہو تو اسے کوئی خاص کام کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے اور جب وہ شراب میں مخمود ہو تو اسے وہی کام ٹھیک معلوم ہوتا ہے ان الفاظ میں وہ وجہ پوشیدہ ہے جو انسانوں کو مدہوش اشیاء کی طرف راغب کرتی ہے، لوگ ان اشیاء کو یا تو اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ شرم کے ان احساسات کو دبا دیں جو کسی غلط کام کرنے پر پیدا ہوتے ہیں یا پہلے ہی سے خود پر ایسی حالت طاری کر لیں جس میں وہ ضمیر کے خلاف کام کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے حیوانی وجود کی اطاعت کر سکتے ہیں۔

ہوش کی حالت میں مرد ویشیا کے مکان پر جانے سے ڈرتا ہے۔ چوری کرنے سے خوف کھاتا ہے اور کسی کو قتل کرنے کی جرأت نہیں کرتا لیکن یہ تمام کام کرتے ہوئے شرابی کو کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ ثابت ہوا کہ اگر کوئی آدمی اپنے ضمیر کے خلاف کام کرنا چاہے تو اسے خود کو مدہوش کرنا پڑتا ہے۔

مجھے اس باورچی کا بیان یاد آ جاتا ہے جس نے میری ایک بوڑھی رشتہ دار کو قتل کر دیا تھا۔ اس نے عدالت میں کہا تھا کہ جب اس نے اپنی داشتہ ایک نوکرانی کو

باہر بھیج دیا اور کام کرنے کا وقت قریب آ گیا تو اس نے چاقو لے کر کمرہ خواب میں جانا چاہا لیکن اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہوش کی حالت میں وہ یہ کام نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ وہ لوٹا اور ''وودکا'' کے دو گلاس پینے کے بعد اس نے خود کو قتل کے لیے بالکل تیار پایا، چنانچہ اس نے کمرے میں جا کر بڑھیا کو ہلاک کر دیا۔ یہاں اسی گاڑی بان کی بات یاد آ جاتی ہے کہ ''جب ہم ہوش میں ہوں تو ایسا کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔''

دس میں سے نو جرم اسی طریقے پر کیے جاتے ہیں یعنی اس بات پر عمل کیا جاتا ہے ''ہمت حاصل کرنے کے لیے شراب پیو۔''

وہ عورتیں جو اپنی عصمت کھوتی ہیں، ان میں سے پچاس فی صدی ایسی ہوتی ہیں جو شراب کے نشے میں اپنی زندگی کا بہترین زیور اتار کر پھینک دیتی ہیں ویشیاؤں کے ہاں اکثر وہی لوگ جاتے ہیں جو شرابی ہوں۔ چونکہ لوگ شراب کے اس اثر سے واقف ہیں کہ ضمیر کی آواز بالکل دبا دیتی ہے اس لیے وہ اسے جان بوجھ کر اسی کام کے لیے پیتے ہیں۔۔۔۔

لوگ صرف اپنے ضمیر سے آواز دبانے کے لیے شراب نہیں پیتے بلکہ دوسروں کو بھی اپنے سے غافل کرنے کے لیے شراب پلاتے ہیں۔ جنگ میں دو بدو لڑائی کے وقت فوجیوں کو عام طور پر شراب پلائی جاتی ہے۔ سبستوپول پر جب فرانسیسی فوجیوں نے حملہ کیا تھا تو وہ سب کے سب مخمور تھے۔

جب کسی جگہ پر قبضہ کیا جاتا ہے اور فوجی وہاں کے بے یار و مددگار بچوں اور بوڑھوں کو مارنے سے انکار کر دیتے ہیں تو عام طور پر ان کو شراب سے مدہوش

کرنے کے احکام جاری کیئے جاتے ہیں، مخموری کی حالت میں وہ اس کام کے لیے تیار ہو جاتے ہیں جو ان سے چاہا جاتا ہے۔

ایسے لوگوں کی کئی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے کوئی غلط کام کرنے کے بعد شراب نوشی شروع کی چونکہ وہ اپنی مزاحمت دور کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے خود کو مدہوش بنانا شروع کر دیا اور پھر سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ لوگ جو بری زندگی بسر کرتے ہیں، منشیات کی طرف جلد راغب ہو جاتے ہیں چور اچکے، رہزن اور ویشیائیں بغیر شراب کے زندہ نہیں رہ سکتیں۔

ہر شخص یہ جانتا ہے اور تسلیم کرتا ہے کہ مدہوش بنانے والی چیزوں کے استعمال کا باعث ہے ضمیر کی ٹیسیں اور یہ کہ زندگی کے غیر اخلاقی رستوں پر چلتے وقت مدہوش بنانے والی اشیاء کا استعمال صرف اس لیے کیا جاتا ہے کہ ضمیر کو کند بنا دیا جائے اور یہ بھی ہر شخص پر واضح ہوتا ہے کہ مدہوش بنانے والی چیزوں کا استعمال ضمیر کو کند بنا دیتا ہے اور یہ کہ مخموری کی حالت میں آدمی وہ فعل بھی کر گزرتا ہے، جو ہوش کی حالت میں وہ کبھی نہیں کر سکتا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ جس کا اسے کبھی قیاس بھی نہیں ہوگا۔ ہر شخص ان باتوں کو تسلیم کرتا ہے، مانتا ہے لیکن جب مدہوش بنانے والی اشیاء چوری چکاری، قتل و غارت یا تشدد پر منتج نہیں ہوتیں۔ جب ان کو کسی بھیانک جرم کے بعد استعمال نہیں کیا جاتا۔ جب ان کو ایسے لوگ استعمال میں لاتے ہیں جو مجرم نہیں ہوتے اور جب ایسی چیزیں تھوڑی تھوڑی مقدار میں استعمال کی جاتی ہے تو عام طور پر کسی وجہ سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تھوڑی مقدار میں شراب، بیئر اور افیون وغیرہ صرف فرحت حاصل کرنے کے لیے استعمال کی

جاتی ہے اور یوں ان کا ضمیر پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ جب معمولی مدہوشی کے بعد کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا جاتا، نہ چوری کی جاتی ہے اور نہ قتل کیا جاتا ہے تو وہ بے ہودہ اور فضول حرکات جو عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں، ان کا مدہوشی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ خود بخود وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ جب یہ لوگ جرائم سے متعلقہ قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتے، تو انہیں اپنے ضمیر کی آواز دبانے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوسکتی اور یہ کہ وہ زندگی جو منشیات کے عادی بسر کرتے ہیں، بڑی اچھی زندگی ہوتی ہے اور اگر وہ اس عادت کو چھوڑ دیں تو بھی ان کی زندگی ویسی اچھی رہ سکتی ہے یہ بھی فرض کر لیا گیا ہے کہ مدہوش بنانے والی چیزوں کا متواتر و مسلسل استعمال ان کے ضمیر کو قطعی طور پر تاریک نہیں بناتا۔

گو ہر شخص تجربے کی بناء پر جانتا ہے کہ شراب اور تمباکو سے انسان کے دل و دماغ کے ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے، ان چیزوں کے استعمال سے ان افعال پر شرم محسوس نہیں ہوتی، جن پر ہوش کی حالت میں ہونی چاہیے۔ ضمیر کی ہر چٹکی پر انسان کسی مدہوش بنانے والی چیز کی طرف رجوع کرتا ہے۔ نشے کی حالت میں اپنی زندگی اور اپنی حالت کا اندازہ نہیں کر سکتا، منشیات کا باقاعدہ اور مسلسل استعمال وہی نفسیاتی اثر پیدا کرتا ہے جو ان کا غیر معتدل اور بے قاعدہ استعمال پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان لوگوں کو جو تمباکو اور شراب اعتدال سے پیتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ منشیات اپنے ضمیر کو کند بنانے کے لیے استعمال نہیں کرتے بلکہ صرف ذائقے اور فرحت کے لیے استعمال میں لاتے ہیں۔

لیکن ان لوگوں کو غیر جانبدارانہ طریقے پر بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔ ایسے نہیں سوچنا چاہیے گویا سر کی بلا ٹال دی گئی ہے بلکہ اس کو سمجھنا چاہیے۔ اولاً یہ کہ جب منشیات زیادہ مقدار میں باقاعدہ استعمال کی جائیں تو ضمیر کو کند بنا دیتی ہیں تو ان کا تھوڑی مقدار میں باقاعدہ استعمال بھی ایسے ہی نتائج پیدا کرتا ہوگا، ثانیاً یہ کہ تمام منشیات، ضمیر کو کند بنانے کی خاصیت رکھتی ہیں، دونوں حالتوں میں ان کی یہ خاصیت برقرار رہتی ہے، خواہ ان کے اثر کے تحت ایسے الفاظ زبان پر آئیں، یا ایسے احساسات دل میں پیدا ہوں جو ہوش کی حالت میں پیدا نہیں ہونے چاہیے تھے، اور ثالثاً یہ کہ اگر چوروں، ڈاکوؤں اور ویشیاؤں کو اپنے ضمیر کند کرنے کے لیے منشیات کی حاجت ہوتی ہے تو ان لوگوں کو بھی جو اپنے ضمیر کے خلاف کوئی کام یا پیشہ اختیار کرتے ہیں (خواہ یہ کام اور پیشے آپ کے نزدیک بڑے باوقار اور موزوں ترین ہوں) ان چیزوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

مختصر الفاظ میں ہم اس حقیقت سے ہرگز ہرگز انکار نہیں کر سکتے کہ منشیات کا استعمال خواہ وہ تھوڑی مقدار میں اور بے قاعدہ اونچے طبقے میں ہو یا نچلے طبقے میں صرف ایک ہی ضرورت کے ماتحت عمل میں آتا ہے اور وہ ضرورت ضمیر کی آواز کو دبانے کی ہے تاکہ راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو۔

صرف ان چند الفاظ میں منشیات و مسکرات اور تمباکو (جو عام پیا جاتا ہے اور جب سب سے زیادہ مضرت رساں ہے) کے عالمگیر استعمال کا راز پوشیدہ ہے۔

یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ تمباکو تازگی بخشتا ہے، خیالات کو صاف کرتا ہے اور

لوگوں کی توجہ اپنی طرف ایسے ہی مبذول کرتا ہے جیسے دوسری چیزیں اور یہ کہ شراب کے مانند اس کا ضمیر پر کچھ اثر نہیں پڑتا لیکن اگر بڑے غور سے ان حالتوں کا مشاہدہ و مطالعہ کیا جائے جن میں تمباکو کو پینے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ ضمیر پر تمباکو کا وہی اثر ہوتا ہے جو شراب کا ہوتا ہے۔ اگر تمباکو واقعی تازگی بخشنے یا خیالات صاف کرنے والا ہوتا تو اس کی شدید طلب ہرگز ہرگز نہیں ہوتی۔ ایسی طلب جو خاص مواقع پر نمودار ہو اور لوگ یہ ہرگز ہرگز نہ کہتے کہ ہم بھوکے رہ سکتے ہیں لیکن تمباکو ضرور پئیں گے۔

اس باورچی نے جس نے اپنی مالکہ کو قتل کر دیا تھا، کہ جب کمرہ خواب میں داخل ہو کر اس نے بڑھیا کے گلے پر چھری پھیر دی اور خون کے فوارے چھوٹنے لگے تو اس کی ہمت، اس کی طاقت جواب دے گئی "میں اپنا کام پوری طرح ختم نہ کر سکا" اس نے عدالت میں بیان دیا "چنانچہ کمرے سے باہر نکل کر میں نے سگریٹ سلگایا"

سگریٹ پی کر اور خود کو مدہوش کرنے کے بعد وہ اس قابل ہوا کہ واپس جا کر بڑھیا کے سر کو تن سے جدا کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت اس کے دل میں سگریٹ پینے کی خواہش اس لیے پیدا نہ ہوئی کہ وہ اپنے خیالات کو صاف کرنا چاہتا تھا یا فرحت حاصل کرنا چاہتا تھا بلکہ اس وقت اس کو اپنی وہ چیز کند بنانا تھی، جو اس برے کام کی تکمیل سے روک رہی تھی۔

ہر تمباکو نوش تھوڑے سے غور و فکر کے بعد معلوم کر سکتا ہے کہ ایسے خاص لمحات آتے ہیں جب وہ خود کو تمباکو سے مدہوش بنانا چاہتا ہے، ان دونوں کو پیش نظر رکھ

کر جب میں تمباکو پیا کرتا تھا، میں آپ کو ایک واقعہ بتاتا ہوں۔ جب مجھے اس کی طلب محسوس ہوا کرتی تھی۔ عام طور پر میں ایسے لمحات میں تمباکو پیا کرتا تھا جب کسی بات کی یاد کو فراموش کر دینا چاہتا تھا۔ جب میں کسی چیز کو بھول جانا چاہتا تھا یا سرے ہی سے غور و فکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں بے کار بیٹھا ہوتا تھا۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ مجھے کام کرنا ہے لیکن چونکہ میں ایسے ہی بے کار بیٹھے رہنا چاہتا تھا اس لیے میں تمباکو پینا شروع کر دیتا تھا۔ میں نے کسی کے ساتھ وعدہ کیا ہوتا تھا کہ میں اس کے یہاں پانچ بجے ضرور آؤں گا لیکن جب یہ وعدہ پورا نہ ہوتا تو اس کے احساس کو بھلانے کے لیے میں تمباکو پینے لگ جاتا۔ طبیعت میں چڑچڑے پن کے باعث میں اگر کسی کو ناخوشگوار کلمات کہہ دیتا تو اس غلطی کے احساس کو دور کرنے کے لیے پائپ سلگا لیا کرتا تھا۔ تاش کھیلنے کے دوران اگر میں توقع سے زیادہ رقم ہار جاتا تو تمباکو پینا شروع کر دیتا تھا مجھ سے اگر کوئی بری حرکت سرزد ہو جاتی تھی اور اس کا اعتراف کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا تو پائپ پینے لگ جاتا تھا اور دوسروں کو قصوروار ٹھہرانا شروع کر دیتا تھا۔۔۔ کوئی مضمون لکھتے وقت اگر مجھے پوری طرح تسکین حاصل نہیں ہوتی تھی اور ہونا یہ چاہیے تھا کہ میں لکھنا ترک کر دوں لیکن میں زبردستی اس مضمون کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں تمباکو نوشی شروع کر دیتا تھا کسی سے گفتگو کرتے وقت اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی بات کو نہیں سمجھ رہے لیکن چونکہ میں اپنی رائے کا اظہار جاری رکھنا چاہتا تھا اس لیے میں تمباکو کو پینا شروع کر دیتا تھا۔

تمباکو اور دوسری مدہوش بنانے والی چیزوں میں یہ امتیازی فرق ہے کہ اس

کے ذریعے ہم بڑی آسانی کے ساتھ خود کو مدہوش بنا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا بظاہر بالکل بے ضرر اور نقل پذیر ہونا ہے۔ افیم، بھنگ اور شراب وغیرہ استعمال کرنے کے لیے ابتدائی تیاریاں کرنا پڑتی ہیں اور دیگر لوازمات کو بھی ضرورت ہوتی ہے مگر تمباکو ہر وقت جیب میں رکھا جا سکتا ہے اور اس کے پینے کے لیے اور لوازمات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شراب اور گانجا پینے والوں کو دیکھ کر عام طور پر لوگ ہیبت زدہ ہو جاتے ہیں لیکن تمباکو پینے والے اس قسم کی کیفیت پیدا نہیں کرتے۔ لوگ ان سے دور ہٹنے کی کوشش نہیں کرتے۔ شراب، افیون اور گانجا وغیرہ تمام حسیات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ اثر دیر تک قائم رہتا ہے مگر تمباکو سے ایسا نہیں ہوتا۔ آپ کوئی ایسا کام کرنا چاہتے ہیں جو آپ کو نہیں کرنا چاہیے تو آپ سگریٹ پی کر خود کو بقدر ضرورت مدہوش بنا لیتے ہیں، اس کے بعد آپ پھر ہوش میں آ جاتے ہیں اور اچھی طرح سوچنے لگتے ہیں۔ یا فرض کر لیا جائے کہ آپ نے کوئی ایسا کام کیا ہے جو آپ کو نہیں کرنا چاہیے تھا تو آپ سگریٹ پیتے ہیں اور اس غلطی کے احساس کو مٹا کر کوئی اور کام کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ تمباکو نہ کسی طلب کو پورا کرنے کے لیے اور نہ وقت کاٹنے کے لیے پیا جاتا ہے بلکہ صرف اپنا ضمیر کند بنانے کے لیے پیا جاتا ہے اور کیا ان تمام امور سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انسان کی زندگی اور اس کے دل میں تمباکو پینے کی خواہش کے درمیان ایک گہرا رشتہ ہے۔

لڑکے کب تمباکو پینا شروع کرتے ہیں؟۔۔۔۔۔ عام طور پر اس وقت جب وہ اپنے بچپن کی معصومیت کھو دیتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے جب انسان اپنی زندگی

کے اخلاقی راستوں پر گامزن ہوتا ہے تو وہ تمباکو کی عادت ترک کر دیتا ہے اور جب ان راستوں سے ہٹ جاتا ہے تو پھر تمباکو پینا شروع کر دیتا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ سب قمار باز تمباکو کے عادی ہوتے ہیں؟۔۔۔۔۔۔وہ عورتیں جو ہموار زندگی بسر کرتی ہیں، کیوں بہت کم تمباکو پیتی ہیں؟۔۔۔۔۔۔ویشیائیں اور دیوانے سب کے سب تمباکو کے عادی کیوں ہوتے ہیں؟۔۔۔۔۔عادت، عادت ہے لیکن تمباکو نوشی یقیناً ضمیر کو کند بنانے والی خواہش سے متعلق ہے اور اس سے یہ خواہش پوری ہوتی ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے (میں خود بھی یہی کرتا تھا) کہ تمباکو پینے سے دماغی کام اچھی طرح ہوتا ہے اگر ہم دماغی کام کی مقدار کو پیش نظر رکھیں تو یہ بیان بلا شک و شبہ صداقت پر مبنی ہے۔وہ شخص جو تمباکو پیتا ہے اور جو انجام کار اپنے خیالات کو جانچنے اور پرکھنے کی قوت کھو دیتا ہے، عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے دماغ میں بے شمار خیالات آ رہے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے دماغ میں واقعی بے شمار خیالات آ رہے ہیں۔ دراصل بات یہ ہوتی ہے کہ اسے اپنے خیالات پر قابو نہیں رہتا اور وہ غلط نتیجہ مرتب کر لیتا ہے۔

جب آدمی کام کرنے لگے تو اسے اپنے اندر دو وجودوں کا احساس ہوتا ہے، ایک وہ وجود جو کام کرتا ہے اور دوسرا وہ جو جانچتا رہتا ہے۔ یہ جانچ جس قدر کڑی ہو گی، اسی قدر کام سست رفتاری سے مگر اچھا اور پختہ ہو گا اور اگر یہ جانچ پڑتال کمزور ہو گی تو کام جلدی مگر خام ہو گا۔ جب کام کرنے والے پر مدہوشی طاری ہوتی ہے تو کام کی مقدار بڑھ جاتی ہے مگر اس میں اچھائی پیدا نہیں ہوتی۔

لوگ عام طور پر کہتے ہیں ''اگر میں تمباکو نہ پیوں تو لکھ ہی نہیں سکتا۔ شروع کرتا ہوں مگر لکھ ہی نہیں سکتا۔'' ۔۔۔۔۔۔ میں بھی یہ کہا کرتا تھا لیکن سوچنا یہ ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ ۔۔۔۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ آپ لکھنا نہیں چاہتے یا پھر یہ ہونا چاہیے کہ آپ کے شعور میں لکھنے کی خواہش ابھی تک خام ہے۔ اس کی صرف دھندلی سی صورت آپ کی نظروں کے سامنے آ رہی ہے۔ جس کی خبر آپ کے اندر والا نقاد بشرطیکہ وہ مدہوش نہ ہو، آپ کو پہنچا دیتا ہے۔ اگر آپ تمباکو نہ پئیں تو آپ یقیناً یا تو لکھنے کا خیال ہی چھوڑ دیں گے یا پھر اس دھندلے خیال کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں گے تا کہ وہ پختگی اختیار کرے اور آپ کی نظروں کے سامنے صحیح شکل میں آ جائے لیکن اگر آپ نے تمباکو کو پی لیا اور آپ کے اندر والا نقاد مدہوش ہو جائے گا اور وہ روک جو آپ کے راستے میں تھی، ہٹ جائے گی۔ تمباکو پینے سے پہلے جو خیال آپ کو بالکل مبہم اور فضول نظر آتا تھا، تمباکو پینے کے بعد اہمیت اختیار کر لیتا، وہ رکاوٹیں جو آپ کے راستے میں حائل تھیں، دور ہو جاتی ہیں۔ آپ لکھنا شروع کر دیتے ہیں اور زیادہ تیزی کے ساتھ۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

(4)

لیکن کیا معمولی اور حقیر سا نشہ جو شراب اور تمباکو کے معتدل استعمال سے پیدا ہوتا ہے، اہم نتائج کا باعث ہوتا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ اگر کوئی شخص گانجا اور شراب پی کر گر پڑے اور اپنے حواس کھو دے تو یقیناً اہم نتائج ہو سکتے ہیں لیکن اگر تمباکو اور گانجا وغیرہ تھوڑی سی مقدار میں استعمال کیا جائے جو معمولی نشہ پیدا کرے تو اس

سے خطرناک نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔۔۔۔۔یہ بیان عام طور پر سننے میں آتا ہے اور فرض کرلیا گیا کہ معمولی سی مدہوشی برا اثر پیدا نہیں کرتی، یہ تو ایسا ہی اگر یہ خیال کرلیا جائے کہ پتھر پر گھڑی کو ٹپک دینے سے اس کو نقصان پہنچے گا لیکن معمولی سا گرد و غبار اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

یہ خیال رکھنا چاہیے کہ انسان کی زندگی کو وہ کام حرکت یا اکساہٹ نہیں بخشتا جو ہاتھوں، پیروں یا پیٹھ سے کیا جائے بلکہ وہ کام حرکت بخشتا ہے جو ضمیر کرے۔ ہاتھوں اور پیروں سے اگر کوئی کام شروع کیا جائے تو شعوری احساس میں رد و بدل کا ہونا ضروری ہے اور یہی رد و بدل کی حرکات کو واضح اور ممیز کرتا ہے، حالانکہ یہ بالکل معمولی اور ناقابل ادراک ہوتا ہے۔

برولوف (روس کا ایک مشہور و معروف مصور 1799-1852) نے ایک روز اپنے شاگرد کی کھینچی ہوئی تصویر کی اصلاح کی اصلاح شدہ تصویر کو دیکھ کر شاگرد ایکا ایکی بول اٹھا ''آپ نے برس سے صرف چھوٹے چھوٹے نشان بنائے لیکن اس میں جان پیدا کر دی'' برولوف نے جواب دیا۔۔۔۔۔'' آرٹ وہیں سے شروع ہوتا ہے جہاں یہ چھوٹے چھوٹے نشان شروع ہوتے ہیں۔''

برولوف کا کہنا بالکل درست ہے صرف آرٹ ہی کے بارے میں نہیں بلکہ تمام زندگی پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ صحیح زندگی کا آغاز وہیں سے ہوتا ہے جہاں سے ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ہونا ہے۔۔۔۔۔۔ جہاں ہمارے قیاس کے مطابق ناقابل ادراک تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں، اصل زندگی وہاں بسر نہیں کی جاتی، جہاں بڑے بڑے خارجی انقلاب

آتے ہیں۔ جہاں لوگ چلتے پھرتے ہیں لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں ۔۔۔۔۔ بلکہ وہاں بسر کی جاتی ہے جہاں بالکل ننھی ننھی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔

ننھی ننھی تبدیلیاں ۔۔۔۔ لیکن ان ہی سے نہایت ہولناک اور نہایت اہم نتائج وابستہ ہوتے ہیں۔ کسی کام کا ارادہ کرنے سے لے کر اس کے کر گزرنے تک بہت سی مادی تبدیلیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔۔۔۔۔۔ گھر کے گھر تباہ و برباد ہو سکتے ہیں، دھن و دولت کا ستیاناس ہوسکتا ہے اور انسانوں کی غارت گری عمل میں آ سکتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم چیز وہ ہے جو انسان کے شعور میں چھپی ہوئی ہے۔ امکان یعنی ہوسکنے کی تجدید شعور ہی کرتا ہے۔

شعور کے اندر چھوٹی سے چھوٹی تبدیلی بھی ناقابل قیاس نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوسکتی ہے۔ آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کا انسان کی اختیاری قوت یا عقیدہ جبر یعنی جبریت سے کوئی تعلق ہے۔ اس پر بحث کرنا بالکل فضول ہے۔ اس سوال کا فیصلہ کیے بغیر کہ آیا انسان اپنی خواہش کے مطابق کام کرسکتا ہے یا نہیں (یہ سوال میرے نزدیک درست نہیں ہے) میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب انسانی سرگرمیاں اور شعور کی خفیف ترین تبدیلیاں لازم وملزوم ہیں تو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے (ہم اختیاری قوت کی موجودگی کو تسلیم کریں یا نہ کریں) کہ ہم خاص طور پر ان حالات کا جائزہ کریں جن کے تحت یہ خفیف ترین تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کوئی چیز تولتے وقت ہمیں ترازو کے پلڑوں کا خاص طور پر دھیان کرنا پڑتا ہے۔

ہمیں حتی الامکان اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو ایسے حالات سے دور رکھیں جو خیال کی اس نزاکت اور صفائی پر اثر انداز ہوتے ہوں۔ جن کے بغیر شعور اپنا کام صحیح طور پر نہیں کر سکتا۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں منشیات کا استعمال ہرگز ہرگز نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ وہ ضمیر و شعور کے کام میں رخنہ اندازی کرتا ہے۔

چونکہ انسان بیک وقت روحانی اور حیوانی مخلوق ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی ان اشیاء سے متاثر ہو جائے جو اس کی روحانی فطرت پر اثر انداز ہوتی ہیں جیسا کہ کلاک سوئیوں کے ذریعے سے بھی متحرک ہو سکتا ہے اور بڑے پہیے کے ذریعے سے بھی حرکت میں آ سکتا ہے بہتر صورت یہ ہے کہ کلاک کو اس کی اندرونی مشینری کے ذریعے سے منضبط کیا جائے۔ ٹھیک اس طرح انسان خود کو ضمیر یا شعور ہی کے ذریعے سے باضابطہ بنا سکتا ہے۔

(5)

لوگ وقتی طور پر اداسی دور کرنے کے لیے یا فرحت حاصل کرنے کے لیے شراب پیتے ہیں کہ خوش گوار شے ہے بلکہ اپنے اندر اپنے ضمیر کی آواز غرق کرنے کے لیے پیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے بہت ہولناک نتائج برآمد ہوتے ہوں گے۔ ذرا اس عمارت کے نقشے کا تصور کیجئے جس کی دیواریں اور کونے ضروری آلات کی مدد کے بغیر تیار کیے گئے ہوں کیا ایسی عمارت پائیدار ہو سکتی ہے؟

لیکن لوگ پھر بھی اپنے آپ کو مدہوش کرتے ہیں جب زندگی ضمیر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتی تو ضمیر کو توڑ مروڑ کر اس کے ساتھ منضبط کر دیا جاتا ہے۔

ضمیر کو مدہوش بنانے کی صحیح اہمیت معلوم کرنے کے لیے آپ اپنی زندگی کے ہر دور کے روحانی لمحات کو پیش نظر رکھیے۔ آپ کو یاد آ جائے گا کہ ہر دور میں آپ کے سامنے کوئی نہ کوئی اخلاقی سوال تھا، جس کو آپ حل کرنا چاہتے تھے اور جس کے حل ہونے سے آپ کی زندگی کی بہتری وابستہ تھی۔ اس سوال کو حل کرنے کے لیے توجہ کے اجتماع اور ارتکاز کی ضرورت تھی، ہر محنت و مشقت سے متعلقہ کام کرنے میں اور خاص طور اس کے شروع کرتے وقت ایسے لمحات آتے ہیں، جب یہ مشکل اور تکلیف دہ معلوم ہوا کرتا ہے اور جب انسانی کمزوری یہ خواہش پیدا کیا کرتی ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے۔ جسمانی کام تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے اور دماغی کام اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوتا ہے جیسا کہ لینگ کہتا ہے کہ لوگ عام طور پر اس وقت سوچنا بند کر دینا چاہتے ہیں، جب کوئی خیال مشکل محسوس ہوتا ہے لیکن میں کہوں گا کہ یہیں جہاں سے یہ مشکل شروع ہوتی ہے، سوچنا یعنی غور و فکر بارآور ہونا شروع ہوتا ہے۔

جب آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے پیش نظر سوالات کے تصفیے پر محنت صرف ہوگی جو عام طور پر تکلیف دہ ہوتی ہے تو اس کے دل میں اس الجھن سے نجات حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اگر اس کے پاس خود کو مدہوش بنانے والے ذرائع نہ ہوتے تو وہ اپنے ضمیر سے ان سوالات کو کبھی خارج نہ کر سکتا جو اس کو در پیش تھے، لیکن چونکہ اس کو ایسے ذرائع معلوم نہیں جن سے ان خیالات کو بھگایا جا سکتا ہے اس لیے وہ بوقت ضرورت انہیں استعمال کرتا ہے۔

جونہی حل طلب سوالات اس کو دق کرنا شروع کرتے ہیں، دکھ دینے لگتے

ہیں ۔وہ جھٹ سے ان ذرائع کی طرف رجوع کرتا ہے اوران تکلیف دہ سوالوں کی پیدا کردہ پیشانی سے نجات حاصل کرلیتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ضمیر ان سوالوں کا حل طلب کرنا بند کردیتا ہے اور یہ غیر حل شدہ سوال آئندہ روحانی لمحات تک غیر حل شدہ رہتے ہیں اور جب یہ لمحات آتے ہیں تو پھر وہ انہی ذرائع کو استعمال کرتا ہے اور انجام کار وہ اپنی زندگی اسی طرح گزار دیتا ہے اور اخلاقی سوالات جو اس کے درپیش تھے، ویسے کے ویسے حل طلب رہتے ہیں۔حالانکہ ان سوالات کے حل ہونے ہی میں زندگی کی ساری حرکت پوشیدہ ہے۔

(6)

جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے افیم اور گانجا کے نتائج بڑے ہولناک ہوتے ہیں جیسا کہ ہم جانتے ہیں پکے شرابیوں کے لیے شراب نہایت مہلک نتائج کا موجب ہوتی ہے اور اس سے زیادہ شراب، بیئر، تمباکو وغیرہ کا معتدل استعمال جو بالکل بے ضرر سمجھا جاتا ہے، ہماری سوسائٹی کے لیے ہولناک نتائج کا باعث ہوتا ہے۔

نتائج فطری طور پر ہولناک اور خطرناک ہونے چاہئیں، اس حقیقت کے پیش نظر کہ سوسائٹی کی معاشرتی، فردی سائینٹفک ادبی اور فنی سرگرمیاں زیادہ تر ان لوگوں سے متعلق ہیں جو غیر معتدل ہیں یعنی جو شراب پیتے ہیں عام طور پر فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو کھانا کھانے کے بعد شراب پیتے ہیں، دوسرے روز کام کے اوقات میں بالکل ٹھیک اور معتدل حالت میں ہوتے ہیں لیکن یہ بہت بڑی غلطی ہے۔وہ لوگ جو شراب، بیئر یا کسی اور نشیلی چیز کے ایک دو گلاس پیتے ہیں،

دوسرے دن ان پر غنودگی کی حالت طاری ہوتی ہے اور خود کو اداس اداس محسوس کرتے ہیں جس کا بالآخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مشتعل ہو جاتے ہیں۔ ان کی دماغی پژ مردگی اور ناتوانی کو تمباکو نوشی اور بھی زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ تمباکو اور شراب کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرنے والے اگر اپنے دماغ کو اصلی حالت میں لانا چاہیں تو کم از کم ایک ہفتہ درکار ہو گا مگر ایسا شاذونادر ہی کیا جاتا ہے۔

چنانچہ ثابت ہوا کہ ہمارے درمیان جو کچھ ہوتا ہے (خواہ اس کی ذمہ داری ان لوگوں کے سر پر ہو، جو حکومت کرتے ہیں یا دوسروں کو سبق دیتے ہیں۔ خواہ اس کی ذمہ داری ان لوگوں سے متعلق ہو، جو محکوم ہیں اور دوسروں سے سبق لیتے ہیں) سنجیدہ و متین حالت میں نہیں ہوتا۔

اگر میں یہ کہوں گا کہ ہماری زندگیوں کے انتشار اور ان کے ضعف کا باعث مد ہوشی کی وہ مستقل حالت ہے جس میں کہ اکثر لوگ رہتے ہیں تو آپ اسے مذاق نہ سمجھئے گا۔ اگر لوگ مدہوشی کی حالت میں نہ ہوں تو ہمارے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے کیا کسی کے فہم و گمان میں آ سکتا ہے۔ ایفل ٹاور بنانے سے لے کر فوجی ملازمت اختیار کرنے تک کسی ضرورت کے بغیر ایک کمپنی بنائی جاتی ہے، سرمایہ اکٹھا کیا جاتا ہے لوگ محنت و مشقت کرتے ہیں، حساب لگاتے ہیں، اسکیمیں تیار کرتے ہیں۔ لاکھوں ٹن لوہا ایک مینار بنانے پر صرف کر دیا جاتا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ کروڑوں آدمی اس مینار پر چڑھنے کو اپنا فرض یقین کرتے ہیں۔ اس مینار کی تعمیر دوسرے لوگوں کے دلوں میں اس سے بڑے مینار بنانے کی خواہش پیدا کرتی ہے، ذرا غور فرمایئے کیا صحیح دماغی حالت میں ایسی فضول باتیں سوجھ سکتی ہیں؟

ایک اور مثال لیجئے یورپی اقوام کئی برسوں سے ایسے عمدہ طریقے ایجاد کرنے پر غور وفکر کر رہی ہیں جن سے انسانوں کو ہلاک کیا جا سکے اور لاکھوں نوجوانوں کو بالغ ہونے کے ساتھ ہی قتل و غارت کے طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اب بربری لوگوں کے حملوں کا کوئی خطرہ نہیں رہا لیکن یہ جنگی تیاریاں متمدن و مہذب اقوام عمل میں لاتی ہیں۔۔۔۔ جو عیسائی مذہب پر یقین رکھتی ہیں اور پھر وہ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔۔۔۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ سب تکلیف دہ، ضرررساں، سکون شکن، تباہ کن اور اخلاق و ادراک کے خلاف ہے لیکن اس کے باوجود سب باہمی قتل و غارت کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔

بعض سیاسی تدبیریں سوچتے ہیں کہ کیسے کس کس کے ساتھ مل کر اور کس کو تباہ و برباد کرنا چاہئے، بعض ان لوگوں کی تنظیم کرتے ہیں جن کو قتل و غارت گری کے سبق دیئے جا رہے ہوتے ہیں، بعض اپنے ضمیر اپنے ادراک اور اپنی مرضی کے خلاف قتل و غارت کی ان تیاریوں کے سامنے اپنے سر جھکا دیتے ہیں۔ کیا متین و سنجیدہ لوگ ایسا کر سکتے ہیں؟۔۔۔۔ صرف شرابی ہی ایسے کام کر سکتے ہیں جو سنجیدگی و متانت کی صحیح حالت تک کبھی نہیں پہنچتے۔

میرا خیال ہے کہ آج سے پہلے لوگ کبھی ایسی زندگی بسر نہیں کرتے تھے جس میں ضمیر اور افعال کے درمیان اس قدر فاصلہ ہو کہ انسانیت ایک جگہ گڑ گئی ہے، رک گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی خارجی سبب نے اسے فطری حالت اختیار کرنے سے روک رکھا ہے جو اسے من حیث الملت اختیار کرنا چاہیے تھی اور یہ

سبب۔۔۔۔۔اگر چہ یہ اکیلا ہی نہ ہو یقیناً جسمانی طور پر خود کو مدہوش کرتا ہے اور یہ سب سے بڑا سبب ہے جس کے ذریعے سے لوگ اپنے آپ کو دن بدن کمزور اور ضعیف بنا رہے ہیں۔

انسانیت کی تاریخ میں وہ دن قابل یادگار ہوگا۔ جب اس خطرناک برائی سے نجات حاصل کی جائے گی اور وہ دن دور نہیں اس لیے کہ اس برائی کے نتائج سے لوگ اچھی طرح آگاہ ہو چکے ہیں۔ مدہوش بنانے والی اشیاء کے متعلق لوگوں کا نظریہ بہت حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور ان اشیاء کے خطرناک نقصانات سے لوگ اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں۔ اب وہ دن بہت نزدیک ہے جب یہ بیداری لوگوں کو ان مدہوش بنانے والی چیزوں سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دے گی اور ان کی آنکھیں کھول دے گی تاکہ وہ ضمیر کے مطالبات دیکھ سکیں اور ان پر غور کر سکیں۔

☆☆☆☆☆

کسان، مزدور، سرمایہ زمیندار

ہمارے دو سال کے تجربات نے جو ہمیں قحط زدہ علاقہ میں امدادی رقوم تقسیم کرنے کے دوران میں حاصل ہوئے ہیں، ہمارے ان دیرینہ افکار و آراء کی تصدیق کر دی ہے یہ کہ مصائب جن کی روک تھام کے لیے ہم روس کے ایک کونے میں بیٹھ کر بیرون ذرائع سے سعی کر رہے ہیں۔ کسی غیر مستقل وجہ کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ان مستقل و غیر مختتم اسباب و علل کا نتیجہ ہیں جو ہم تعلیم یافتہ لوگوں کے اس غیر برادرانہ و سنگ دلانہ سلوک کے پیدا کردہ جو غریب مزدوروں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔

غرباء اپنی محنت و مشقت اور لامتناہی مصائب سہنے کے علی الرغم ہمارے محتاج ہیں اور ہم اس آقائی اور مولائی حیثیت کے باوجود ان سے بے پرواہ ہیں۔ اگر اس سال اس احتیاج، ستم زمستان اور بھوک (جس کے شکار لاکھوں مظالم نوجوان اور ہزاروں سسکتے ہوئے بوڑھے اور بیسیوں بلکتے ہوئے بچے ہوتے ہیں) کی ستم آفرینیوں سے ہمارے کان نا آشنا ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ بلائیں پھر نازل نہ ہوں گی۔۔۔۔ وہ ہماری نظروں سے اوجھل رہیں گی اور ہم انہیں فراموش کر دیں گے۔ ہم آپ کو یقین دلانے کی کوشش کریں گے کہ ان کا وجود باقی نہیں رہا اور یہ کہ اگر نام و نشان باقی ہے تو یہ قانون قدرت ہے ہمیں اس میں کیا دخل؟

یہ یقین و تیقن دروغ بافی پر مبنی ہے۔ نہ صرف ان آفات سے بچاؤ ممکن ہے

بلکہ ان کا استحصال ضروری ہے وقت آ رہا ہے کہ وہ نابود ہو کر رہیں گی اور وہ وقت اب قریب تر ہے۔

ہمیں مزدور جماعتوں سے اپنا شراب سے لبریز پیالہ پوشیدہ معلوم ہوتا ہے، ہم جدی رسوم اور چالاک دلائل ہی سے عیش پرستی کو جائز قرار دیتے ہیں۔عیش و عشرت کی زندگی ان مزدوروں کے درمیان گزارتے ہیں، جو محنت و مشقت کی تاکلیت اٹھا کر اپنے گاڑھے پسینہ سے ہمارے لیے یہ سامان عیش مہیا کرتے ہیں۔مگر اب مشعل علم ہمارے رشتوں کو منور بنا رہی ہے اور ہم بہت جلد ایک خطرناک مجرم کی حیثیت میں دنیا کے سامنے پیش ہوں گے۔۔۔۔۔ایک ایسا مجرم جو یکا یک طلوع آفتاب کی وجہ سے کسی جرم کا ارتکاب کرتا پکڑا جائے۔

اگر ایک دکان دار ضرر رساں اور خراب اشیاء مزدوروں کے پاس فروخت کرتا ہے یا روٹی اور دیگر ضروریات زندگی کو جنہیں وہ کوڑیوں کے مول خریدے اور روپوں کے دام بیچ کر یہ دعوی کرے کہ وہ ایمان داری سے لوگوں کی ضروریات مہیا کرتا ہے۔اگر سگریٹ،شراب اور آئینے بنانے والا کارخانہ یہ بلند و بانگ دعوے کرے کہ وہ مزدوروں کے لیے کام مہیا کر کے ان کا روزی رساں بنا ہے۔اگر کوئی افسر جو سالانہ ہزاروں پونڈ مشاہرہ حاصل کرتا ہے، یہ یقین دلائے کہ وہ قوم کی خدمت کر رہا ہے اور اگر زمیندار یہ لاف زنی کرے کہ وہ زراعت کے بہترین اصولوں سے اپنے گاؤں میں خوش حالی پھیلا رہا ہے۔۔۔۔۔اگر یہ تمام چیزیں آج ممکن ہیں یہ دعوے آج بہ بانگ دہل دہرائے جا سکتے ہیں جب کہ ہزاروں غریب کسان بھوکے مر رہے ہیں اور زمیندار کئی ایکڑ زمین میں آلو صرف اس

غرض سے کاشت کر رہا ہے کہ ان سے شراب کشید کی جا سکتی ہے تو کل یہ حالات نہ رہیں گے اور یہ دروغ و دعویٰ فضاء کو متعفن نہ کریں گے۔

محولہ فوق وجوہ کی بناء پر ہم یہ خیال کرنے سے عاری ہو گئے ہیں کہ ان ہزاروں گرسنہ شکم لوگوں کو "جو ہمارے گرد کام کی زیادتی اور مشاہرے کی کمی کی وجوہ سے تڑپ رہے ہیں۔۔۔۔۔" ہماری ضروریات بہم پہنچانے کے لیے نان خشک تک نصیب نہیں ہوتی۔

باغوں کی رنگ رلیاں، شکار گاہوں کی ہنگامہ آرائیاں، شراب نوشی کی مجلسیں، پنیر اور گوشت کے ٹکڑے تک وہ ہمارے لیے جانفشانی سے مہیا کرتے ہیں اور ہمارے عیش کی افراط ان پر کام کا اور بھاری بوجھ ڈال دیتی ہے۔

ہم روسی لوگ اپنی حقیقت اور حالت کو سمجھنے کی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں۔ مجھے اس نوجوان کا واقعہ بخوبی یاد ہے جو مجھ سے گذشتہ موسم سرما میں ملنے آیا تھا۔ ہمیں ایک کسان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس گھر میں ہر طرف میلی کچیلی چیزیں بکھری ہوئی تھیں، چیتھڑے لٹکائے ہوئے زرد عورتیں اور بیمار بچہ جو بلک رہا تھا، فضاء متعفن تھی اور کثیف تھی ہر طرف اداسی اور حیرت برس رہی تھی۔ مکینوں کے چہرے رحم کے متمنی تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب ہم جھونپڑی سے باہر نکلے تو اس نوجوان نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی زبان تالو سے چمٹ گئی اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ وہ ماسکو اور پیٹرزبرگ میں چند مہینے گزار کر آیا تھا۔ اس نے وہاں کے حسین باغوں کی سیر کی تھی، شاندار محلات دیکھے تھے، جہاں ہر وقت مسرتیں کھلتی ہیں اور ہر تعیش پسند

جماعت میں شمولیت کی تھی۔آج پہلی مرتبہ اس نے ان لوگوں کا نقشہ دیکھا جو اپنے گاڑھے پسینہ سے سامان عیش مہیا کرتے ہیں۔وہ حیرت زدہ ہراساں ہو گیا۔

شاید اسے بوہمیا میں جو اس کا وطن ہے، جہاں دولت وثروت کا کوئی شمار نہیں اور جہاں تعلیم عام ہونے کی وجہ سے ہر ایک مجلسی دائرے میں شمولیت حاصل کر سکتا ہے، مشقت کا ثمرہ معلوم ہو مگر وہ ان ہزاروں لوگوں سے قطع نظر کرکے یہ نظریہ قائم کرتا ہے جو رات کوئلے کی کانوں میں مشقتیں اٹھاتے ہیں اور یہ سامان عیش مہیا کرتے ہیں۔

شاید وہ ان لوگوں کو بھی بھول جائے جو ہماری ضروریات کو مہیا کرنے کے لیے اپنی جانیں قربان کرتے ہیں لیکن ہم روسی لوگ ایسے خیالات کو اپنے دماغ میں جگہ نہیں دے سکتے۔عیش اور مشقت کا رشتہ یہاں عیاں تر ہے اور ایک قوم کے افراد کی تعیش پرستیاں اور ناداریاں ہم پر روشن ہیں۔۔۔ہم اس قیمت سے جو ہمارے عیش و آرام کی خاطر دوسرے انسانوں کو ادا کرنی پڑتی ہے، منہ نہیں پھیر سکتے ہیں۔

ہمارے لیے سورج طلوع ہو چکا ہے اور ہم حقیقت سے اغماض نہیں کر سکتے۔ ہم حکومت کی آڑ لے کر لوگوں پر حکومت کرنے کی ضرورت کا عذر پیش نہیں کر سکتے۔سائنس اور آرٹ کے پردے میں چھپ کر جو کہ موجودہ زمانے میں لازمی تصور کیے جاتے ہیں، اپنی ملکیت کے بل بوتے پر یا جدی رسوم کی تقلید کی وجہ بیان کر کے ان کمزوریوں کو نہیں چھپا سکتے اور نہ برقرار رکھ سکتے ہیں۔

آفتاب حقیقت کی کرنیں ان تمام پردوں کو چاک کر دیں گی۔۔۔۔۔۔اب ہر ایک شخص جانتا ہے کہ جو لوگ حکومت کی خدمت کرتے ہیں وہ لوگوں کی فلاح کے لیے نہیں بلکہ روپیہ بٹورنے کی خاطر ہے۔ وہ لوگ جو زمین کے مالک ہیں اور وہ اپنی زمین پر کاشت کی قیمت بڑھا کر مقدس حقوق کے لیے کوشاں نہیں بلکہ اپنی عیش پرستیوں کی قیمت ادا کرنے کے لیے آمدنی کے خواہاں ہیں۔۔۔۔۔۔اب یہ باتیں چھپ نہیں سکتیں! یہ دروغ تا کجے؟

اب اہل ثروت کے لیے دو راستے کشادہ ہیں۔۔۔۔۔۔ان کے لیے جو کچھ کام نہیں کرتے مگر سنہری اشرفیوں کے مالک ہیں۔ ایک راستہ یہ ہے کہ وہ مذہب بلکہ انسانیت، انصاف اور اسی قسم کے دوسرے اوصاف سے منہ موڑ کر انہیں یہ کہہ کر پھٹکاریں۔

"میں ان حقوق وفوائد کا واحد مالک ہوں اور خواہ کچھ بھی ہو انہیں کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔ اگر کوئی مجھ سے یہ علیحدہ کرنا چاہے تو اسے پہلے میری طاقت کو زیر غور لانا چاہیے۔۔۔میرے ہاتھ میں طاقت ہے، میں سپاہی مہیا کر سکتا ہوں، قید کروا سکتا ہوں، درے لگا سکتا ہوں اور تو اور پھانسی پر لٹکوا سکتا ہوں۔"

دوسرا راستہ اپنے قصوروں کا اعتراف، جھوٹ سے کنارہ کشی، عفو خواہی اور عوام کی امداد کے لیے سعی ہے، صرف زبانی نہیں جیسا کہ ان دو سالوں میں کی گئی ہے بلکہ اس پیسے سے جو ان کے گاڑھے پسینہ کی کمائی ہے مگر ان سے زبردستی چھین لی گئی ہے اور ان دیواروں کو جو ہمارے اور مزدوروں کے درمیان ایستادہ ہیں، مسمار کرنا ہے، لفظوں سے نہیں بلکہ اعمال سے، انہیں اپنا بھائی سمجھ کر، اپنی زندگی کے

موجودہ طریقوں کو بدل کر اور مزدوروں کے ساتھ کام کر کے سائنس اور ادب کی برکات سے متمتع ہونا ہے۔۔۔۔۔۔وہ برکات جو ہم بغیر ان کی رضا کے ان پر دھکیل رہے ہیں۔

ہم دو رستوں کے چوک پر کھڑے ہیں اور ہمیں ایک راستہ انتخاب کرنا ہے۔ ایک راستہ انسان کو دائمی برائیوں اور لعنتوں میں مبتلا کرنے کے لیے اس میں بد کرداروں کے آشکار ہونے کا ڈر اور موجودہ نظام کے بدل جانے کا احتمال قدم قدم پر نظر آتا ہے۔

دوسرا راستہ سچے دل سے حقیقی اصولوں کو مان لینے اور ان کی ترویج کے لیے بے لوث کوشش کرنے کے لیے کھلا ہے۔۔۔۔۔۔وہ اصول جن کی ترویج کے لیے انسانی عقل و ادراک پکار رہی ہے اور آج یا کل ضرور منوا لیے جانے والے ہیں۔۔۔۔۔اگر ہم نہیں تو ہمارے بعد کی آنے والی نسلیں انہیں منوا کر رہیں گی اس لیے کہ انانیت کا استحصال ہی ان تمام بلاؤ اور آفتوں سے ملک اور قوم کو بچا سکتا ہے۔

دروغ بافیوں سے احتراز، تعیش پرستیوں سے پرہیز اور برادرانہ اخوت، ان تمام بیماریوں کی تیر بہدف دوا ہے۔

☆☆☆☆☆

ترقی یافتہ قبرستان

انگریزی تہذیب وتمدن کی خوبیاں کہاں تک گنوائی جائیں۔اس نے ہم غیر مہذب ہندوستانیوں کو کیا کچھ عطاء نہیں کیا۔ ہماری گنوار عورتوں کو اپنے نسوانی خطوط کی نمائش کے نت نئے طریقے بتائے۔جسمانی خوبیوں کا مظاہرہ کرنے کے لیے بغیر آستینوں کے بلاؤز پہننے سکھائے، مسی کاجل چھین کران کے سنگاردانوں میں لپ اسٹک، روج، پاؤڈر اور افزائش حسن کی اور چیزیں بھر دیں، پہلے ہمارے یہاں موچنے صرف ناک یا مونچھوں کے بال چننے کے کام آتے ہیں مگر تہذیب فرنگ نے ہماری عورتوں کو ان سے اپنی بھوؤں کے بال چننا سکھادیا۔

یہ تہذیب ہی کی برکت ہے کہ اب جو عورت چاہے لائسنس لے کھلے بندوں اپنے جسم کی تجارت کرسکتی ہے، ترقی یافتہ مردوں اور عورتوں کے لیے سول میرج کا قانون موجود ہے، جب چاہے شادی کر لیجئے اور جب چاہے طلاق حاصل کر لیجئے۔ ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکوی مگر رنگ چوکھا آتا ہے۔ناچ گھر موجود ہیں جہاں آپ عورتوں کے ساتھ سینے ملا کر کئی قسم کے ناچوں میں شریک ہوسکتے ہیں کلب گھر موجود ہیں جہاں آپ بڑے مہذب طریقے سے اپنی ساری دولت جوئے میں ہار سکتے ہیں۔مجال ہے کہ آپ کبھی قانونی گرفت میں آئیں شراب خانے موجود ہیں جہاں آپ غلط کام کرسکتے ہیں۔

انگریزی تہذیب وتمدن نے ہمارے وطن کو بہت ترقی یافتہ بنادیا ہے۔اب ہماری عورتیں پتلونیں پہن کا بازاروں میں چلتی پھرتی ہیں۔ کچھ ایسی بھی ہیں جو

قریب قریب کچھ بھی نہیں پہنتیں لیکن پھر بھی آزادانہ گھوم پھر سکتی ہیں۔۔۔ہمارا ملک بہت ترقی یافتہ ہوگیا ہے کیونکہ اب یہاں ''ننگا کلب'' کھولنے کی تجویز بھی ہو رہی ہے۔

وہ لوگ سر پھرے ہیں جو اپنے محسن انگریزوں سے کہتے ہیں کہ ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں۔اگر یہ ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے تو ہمارا یہاں ''ننگا کلب'' کون جاری کرے گا۔ یہ جو رقص خانے ہیں ان کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ہم عورتوں کے ساتھ سینے سے سینہ ملا کر کیسے ناچ سکیں گے۔ ہمارے چکلے کیا ویران نہیں ہو جائیں گے۔ہمیں ایک دوسرے سے لڑنا کون سکھائے گا۔مانچسٹر سے جو کپڑے اب ہماری کپاس سے تیار ہو کر آتے ہیں پھر کون تیار کرے گا۔ یہ اچھے اچھے لذیذ بسکٹ جو ہم کھاتے ہیں، کون دے گا۔

جو ترقی ہمیں اور ہمارے ہندوستان کو انگریزوں کے عہد میں نصیب ہوئی ہے اور کسی کے عہد میں نصیب نہیں ہوسکتی۔اگر ہم آزاد بھی ہو جائیں تو ہمیں حکومت کرنے کی وہ چالیں نہیں آسکتیں جو ہمارے ان حاکموں کو آتی ہیں۔ان حاکموں کی جن کے عہد میں نہ صرف ہمارے ہوٹلوں،کلبوں، رقص خانوں اور سینماؤں کو بلکہ ہمارے قبرستانوں کو بھی کافی ترقی ہوئی ہے۔

غیر ترقی یافتہ قبرستانوں میں مردے اٹھا کر گاڑ دیئے جاتے ہیں۔جیسے وہ کوئی قدرو قیمت ہی نہیں رکھتے لیکن ترقی یافتہ قبرستان میں ایسا نہیں ہوتا ہے مجھے اس ترقی کا احساس اس وقت ہوا جب بمبئی میں میری والدہ کا انتقال ہوا میں چھوٹے چھوٹے نسبتاً غیر مہذب شہروں میں رہنے کا عادی تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ بڑے

شہروں میں مردوں پر بھی حکومت کی طرف سے پابندیاں عائد ہیں۔

والدہ کی لاش دوسرے کمرے میں پڑی تھی۔ میں غم کا مارا سر نیوڑھائے ایک صوفے پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اتنے میں ایک صاحب نے جو عرصے سے بمبئی میں رہتے تھے، مجھ سے کہا ''بھئی اب تم لوگوں کو کچھ کفن دفن کی فکر کرنی چاہیے''

میں نے کہا ''سو یہ آپ ہی کریں گے کیونکہ میں یہاں نووارد ہوں''

انہوں نے جواب دیا ''میں سب کچھ کر دوں گا مگر پہلے تمہیں کسی کے ہاتھ اطلاع بھجوا دینی چاہیے کہ تمہاری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے'' ''کس کو؟''

یہاں پاس ہی میونسپلٹی دفتر ہے اس کو اطلاع دینی بہت ضروری ہے کیونکہ جب تک وہاں سے سرٹیفکیٹ نہیں ملے گا قبرستان میں دفنانے کی اجازت نہیں ملے گی۔

اس دفتر کو اطلاع بھیج دی گئی وہاں سے ایک آدمی آیا جس نے طرح طرح کے سوال کرنے شروع کیے ''کیا بیماری تھی، کتنے عرصے سے مرحومہ بیمار تھی، کس ڈاکٹر کا علاج ہو رہا تھا؟''

حقیقت یہ تھی کہ میری عدم موجودگی میں ہارٹ فیل ہو جانے کی وجہ سے میری والدہ کا انتقال ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی کے زیر علاج نہیں تھیں اور نہ مدت سے بیمار ہی تھیں چنانچہ میں نے اس آدمی سے جو سچی بات تھی کہہ دی۔ اس کا اطمینان نہ ہوا اور کہنے لگا ''آپ کو ڈاکٹر سرٹیفکیٹ دکھانا پڑے گا کہ موت واقعی ہارٹ فیل ہو جانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔''

میں سٹپٹا گیا کہ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کہاں سے حاصل کروں چنانچہ کچھ سخت کلمے

میرے منہ سے نکل گئے لیکن میرے وہ دوست جو ایک عرصے سے بمبئی میں قیام پذیر تھے، اٹھے اور اس آدمی کو ایک طرف لے گئے، کچھ دیر اس سے باتیں کرتے رہے پھر آئے اور میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے ''یہ تو بالکل بے وقوف ہے، اس کو یہاں کی باتوں کا علم نہیں'' پھر انہوں نے میری جیب سے دو روپے نکال کر اس آدمی کو دیئے جو ایک دم ٹھیک ہو گیا اور کہنے لگا ''اب آپ ایسا کیجئے کہ دواؤں کی چند خالی بوتلیں مجھے دے دیجئے تاکہ بیماری کا کچھ تو ثبوت ہو جائے، پرانے نسخے وغیرہ پڑے ہوں تو وہ بھی مجھے دے دیجئے''

اس نے اس قسم کی باتیں کیں جن کو سن کر مجھے تھوڑی دیر کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنی والدہ کا قاتل ہوں اور یہ آدمی جو میرے سامنے بیٹھا ہے، مجھ پر ترس کھا کر راز کو اپنے تک ہی رکھنا چاہتا ہے اور مجھے ایسی ترکیبیں بتا رہا ہے جس سے قتل کے نشانات مٹ جائیں۔ اس وقت جی میں آئی کہ دھکے دے کر اس کو باہر نکال دوں اور گھر میں جتنی خالی بوتلیں پڑی ہیں ان سب کو ایک ایک کر کے اس کا بے مغز سر پھوڑتا چلا جاؤں لیکن اس تہذیب کا بھلا ہو کہ میں خاموش رہا اور اندر سے کچھ بوتلیں نکلوا کر اس کے حوالے کر دیں۔

دو روپے رشوت کے طور پر ادا کرنے کے بعد میونسپلٹی کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا گیا تھا۔ اب قبرستان کا دروازہ ہم پر کھلا تھا۔ لوہے کے بہت بڑے دروازے کے پاس چھوٹا سا کمرہ تھا جیسا کہ سینما کے ساتھ بکنگ آفس ہوتا ہے، اس کی کھڑکی میں سے ایک آدمی نے جھانک کر اندر آتے ہوئے جنازے کو دیکھا اور کہنے کو ہی تھا کہ میرے دوست نے وہ پرچی جو میونسپلٹی کے دفتر سے ملی تھی، اس کے حوالے کر دی

قبرستان کے مینجر کو اطمینان ہو گیا کہ جنازہ بغیر ٹکٹ کے اندر داخل نہیں ہوا۔

بڑا خوبصورت قبرستان تھا ایک جگہ درختوں کا جھنڈ تھا جس کے سائے تلے کئی پختہ قبریں لیٹی ہوئی تھیں ان قبروں کے آس پاس موتیا، چنبیلی اور گلاب کی جھاڑیاں اگ رہی تھیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ قبرستانوں کا سب سے اونچا درجہ ہے جہاں ہائی کلاس آدمی اپنے عزیزوں کو دفن کرتے ہیں۔ ایک قبر کے دام مبلغ تین سو روپے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ یہ رقم دینے کے بعد قبرستان کی اس ٹھنڈی اور ہوادار جگہ میں آپ اپنی یا اپنے کسی عزیز کی پختہ قبر بنا سکتے ہیں، اس کی دیکھ بھال کرنا ہو تو آپ کو چھ روپے سالانہ اور دینا پڑیں گے۔ یہ رقم لے کر مینجر صاحب اس بات کا خیال رکھیں گے کہ قبر ٹھیک حالت میں رہے۔

وہ لوگ جو تین سو روپیہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے ان کی قبریں تین یا چار سال کے بعد کھود کھاد کر مٹا دی جاتی ہیں اور ان کی جگہ دوسرے مردے گاڑ دیئے جاتے ہیں۔ ان قبروں کو درختوں کی چھاؤں اور موتیا، چمبیلی کی خوشبو نصیب نہیں ہوتی۔ یہاں دفناتے وقت مٹی کے ساتھ ایک خاص قسم کا مصالحہ ملا دیا جاتا ہے تاکہ لاش اور اس کی ہڈیاں جلدی گل سڑ جائیں۔

چونکہ ایک ہی شکل صورت کی قبریں قطار اندر چلی گئی ہیں اس لیے ہر قبر پر نمبر لگا دیا گیا تاکہ پہچاننے میں آسانی ہو یہ نمبر چار آنے میں ملتا ہے۔ آج کل اچھے سینماؤں میں بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے نمبر لگے ٹکٹ دیئے جاتے ہیں تاکہ ہال میں گڑبڑ نہ ہو اور آدمی اس نمبر کی سیٹ پر بیٹھے جس نمبر کا اس کے پاس ٹکٹ ہے۔ جب مردہ دفن کیا جاتا ہے تو قبرستان کا مہتمم ایک خاص نمبر جو لوہے کی تختی پر لکھا ہوتا

ہے، قبر کے پہلو میں گاڑ دیتا ہے، یہ اس وقت تک گڑا رہتا ہے جب تک قبر کسی دوسرے مردے کے لیے خالی نہیں کی جاتی۔ نمبر ملنے سے کتنی آسانیاں ہو جاتی ہیں یعنی آپ اپنی نوٹ ب میں اپنے عزیز کی قبروں کا نمبر بھی درج کر سکتے ہیں۔

جوتے کا نمبر پانچ

جراب کا نمبر ساڑھے نو

بیمہ کی پالیسی کا نمبر 225689

والدہ کی قبر کا نمبر 4818

ٹیلی فون کا نمبر 44457

اور اگر زمانہ زیادہ ترقی کر گیا تو پیدا ہوتے ہی آپ کو اپنی قبر کا نمبر مل جایا کرے گا۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہی ایک خوبصورت مسجد دکھائی دی جس کے باہر ایک بہت بڑے بورڈ پر ''ضروری اطلاع'' کے عنوان سے یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

''اگر کوئی شخص اپنے وارث کو کچا اوٹا بنانا چاہے تو وہ گورکھودو بناویں اور کوئی نہیں بنا سکتا۔ بڑی قبر کے دو روپیہ چار آنے، جس میں سوا روپیہ گورکھودو کی مزدوری اور ایک روپیہ قبرستان کا حق، چھوٹی قبر کا سوا سو روپے، جس میں گورکھودو کی مزدوری بارہ آنے اور قبرستان کا حق آٹھ آنے اگر نہ دیں گے تو ان کا اوٹا نکال دیا جائے گا قبرستان میں کسی کو رہنے کی اجازت نہیں۔ ہاں میت کے ساتھ آویں اور اپنا توشہ لے کر باہر چلے جاویں۔ خواہ مرد ہو یا عورت، اگر کوئی میت باہر سے بغیر غسل کے آوے اور اس کے ساتھ غسل دینے والا بھی ہو تو اس سے قبرستان کا

حق چار آنے لیا جائے گا۔ جس میت کو غسل رات کو دیا جائے گا، اس سے دو آنہ روشنی کا لیا جائے گا۔ کوئی شخص قبرستان میں دنگا فساد نہ کرے، اگر کوئی کرے گا تو اس کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا قبر کے وارث اپنے اوٹے پر پانی ڈالنے اور درخت لگانے کا کام گورکھودوں کے سپرد کر دیں تو ان کو چار آنہ ماہوار دینا ہوگا۔ جو صاحب نہ دیں گے ان کی قبر پر گورکھودو نہ پانی ڈالیں اور نہ درخت اگائیں گے"
(مینجنگ ٹرسٹی)

سینماؤں کے اشتہار اور قبرستانوں کے اس، اعلان میں ایک گونہ مماثلت ہے۔ کیوں کہ وہاں بھی لکھا ہوتا ہے "شراب پی کر آنے والوں اور دنگا فساد کرنے والوں کو حوالہ پولیس کر دیا جائے گا۔" بہت ممکن ہے کہ زمانے کی ترقی کے ساتھ اس اعلان میں ترمیمیں ہوتی رہیں اور کبھی ایسے الفاظ کا بھی اضافہ ہو جائے۔

بھونچال آنے یا بمباری کی صورت میں منتظم قبروں کے دام واپس نہیں کرے گا۔ جو صاحب اپنے عزیز و اقارب کی قبر پر ائیر ریڈ شیلٹر بنوانا چاہیں، انہیں ڈھائی سو روپیہ زائد ادا کرنا پڑے گا لیکن اس صورت میں بھی قبر کی ذمہ داری منتظم پر عائد نہ ہوگی۔ قبر کو ائیر کنڈیشنڈ بنانے کے لیے چھوٹے چھوٹے پلانٹ دستیاب ہو سکتے ہیں ہر ماہ جتنی بجلی خرچ ہوگی اس کا بل قبر کے وارث کو ادا کرنا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

ایک بورڈ اور دکھائی دیا جس پر غسل وغیرہ کے نرخ مندرج تھے، ملاحظہ ہو۔

نماز جنازہ اور تلقین پڑھائی	/2
غسل بڑی میت	ایک روپیہ 4/
غسل چھوٹی میت	/14

میت کے لیے پانی گرم کرنے کے لیے لکڑی /4

پانی بھرنے اور گرم کرنے کی مزدوری /2

بڑی میت کے برگے، فی برگہ 2-1/2

چھوٹی میت کے برگے، فی برگہ 1-3/4

(نوٹ! برگہ لکڑی کا اس تختے کو کہتے ہیں جو قبر کے گڑھے میں میت کے اوپر رکھے جاتے ہیں، تا کہ مٹی نیچے نہ دب جائے)

کسی اچھے سیلون میں جائیے تو وہاں بھی گاہکوں کی سہولت کے لیے اس قسم کے بورڈ پر آپ کو مختلف چیزوں کے نرخ نظر آئیں گے۔

مردوں کی بال کٹوائی

بچوں کی /4

عورتوں کی ایک روپیہ

بچیوں کی /8

داڑھی منڈوائی /2

بال کٹوائی اور داڑھی منڈوائی /9

شیمپو /2

بال کٹوائی، داڑھی منڈوائی اور شیمپو /10

اگر بال کٹوائے جائیں اور ساتھ داڑھی بھی منڈوائی جائے تو ایک دو آنے کی رعایت ہو سکتی ہے بہت ممکن ہے آگے چل کر قبرستان والے بھی کچھ رعایت اپنے گاہکوں کو دے دیا کریں، کچھ اس قسم کا اعلان کر دیا جائے" جو صاحب سال میں

دو بڑی قبر کھدوائیں گے ان کو ایک چھوٹی قبر مفت کھود کر دی جائے گی'' یا '' جو حضرات بیک وقت دو قبریں کھدوائیں گے، ان کو گلاب کی دو قلمیں مفت دی جائیں گی'' یا '' جو اصحاب کفن دفن کا سب سامان ہمارے ہاں سے خریدیں گے ان کو قبر کا نمبر ایک خوب صورت بلے پر تلے سے کڑھا ہوا مفت ملے گا۔''

عیسیٰ جی موسیٰ جی اینڈ سنز کفن دفن کے ماہرین

میتوں کو جدید آلات کی مدد سے بغیر ہاتھ لگائے غسل دیا جاتا ہے اور بغیر ہاتھ لگائے کفن پہنایا جاتا ہے۔

قبرستانوں کی طرف سے بھی ایسے ہی اشتہار شائع ہوں تو کوئی تعجب نہ ہوگا۔

شہر کا سب سے جدید قبرستان

جہاں مردے اسی طرح قبروں میں سوتے ہیں جس طرح آپ اپنے پر تکلف بستروں میں سوتے ہیں۔

بمبئی شہر میں اس وقت ایسی کئی انجمنیں موجود ہیں جو میتوں کے کفن دفن کا انتظام کرتی ہیں۔ آپ کو تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان انجمنوں میں سے کسی ایک کو اطلاع بھیج دیجیے، میت کو غسل دے دلا کر، کفن وغیرہ پہنا کر اس انجمن کے آدمی دفن کر دیں گے کانوں کان خبر نہ ہوگی، جب سارا کام آپ کے اطمینان کے مطابق ہو جائے گا تو یہ انجمن آپ کو اپنا بل پیش کر دے گی۔

آپ بہت مصروف آدمی ہیں اتفاق سے آپ کے نوکر کی موت آ دبوچتی ہے۔ آپ کو اس کی موت کا بہت افسوس ہے مگر آپ کو ساحل سمندر پر اپنے چند

ایسے دوستوں کے ہمراہ پکنک پر جانا ہے جن سے آپ کے کاروباری مراسم ہیں اس لیے آپ فوراً کسی انجمن کے مہتمم کو بلائیں گے اور فیس وغیرہ طے کر کے اس کے کفن دفن کا انتظام کر دیں گے۔ جنازے کے ساتھ انجمن کے پیشہ ور کندھا دینے والے ہوں گے جو آپ کے مکان سے لے کر بلند آواز میں قرآن شریف کی آیت پڑھتے جائیں گے وہاں نماز جنازہ پڑھی جائے گی جس کی اجرت بل میں شامل ہو گی اور ایک بڑی قبر جس کی قیمت دو روپیہ چار آنے ہوتی ہے، آپ کا وفادار نوکر دفن کر دیا جائے گا۔ ساحل سمندر پر آپ بڑے اطمینان سے اپنے دوستوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے رہیں گے اور یہاں بھی ہنستے کھیلتے آپ کے نوکر کی قبر تیار ہو جائے گی۔ اور اگر آپ نے انعام دینے کا وعدہ کیا ہو گا تو اس پر انجمن کے آدمی پھولوں کی ایک چادر بھی چڑھا دیں گے۔

چند روز ہوئے مجھے پھر اسی قبرستان میں جانے کا اتفاق ہوا نوٹس بورڈ پر ایک اعلان عام لکھا تھا

''مورخہ 8 جون 1842 سے بوجہ گرانی قبر کی کھدائی کی مزدوری میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ بڑی قبر کی کھدائی ایک روپیہ چار آنہ چھوٹی قبر کی کھدائی چودہ آنے''

جنگ نے قبریں بھی مہنگی کر دی ہیں۔

☆☆☆☆☆

مجھے بھی کچھ کہنا ہے

ماہوار رسالہ ’’ادب لطیف‘‘ لاہور کے سالنامہ 1942ء میں میرا افسانہ بعنوان ’’کالی شلوار‘‘ شائع ہوا تھا جسے کچھ لوگ فحش سمجھتے ہیں میں ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔

افسانہ نگاری میرا پیشہ ہے میں اس کے تمام آداب سے واقف ہوں اس سے پیشتر اسی موضوع پر میں کئی افسانے لکھ چکا ہوں ان میں سے کوئی بھی فحش نہیں میں آئندہ بھی اس موضوع پر افسانے لکھوں گا جو فحش نہیں ہوں گے۔

قصہ گوئی ہبوط آدم سے جاری ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ قیامت تک جاری رہے گی اس کی شکلیں بدلتی جائیں گی لیکن انسان اپنے احساسات دوسرے اذہان تک پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ بیسواؤں پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا ہر اس شے کے متعلق لکھا یا کہا جاتا ہے جو سامنے موجود ہو۔ بیسوائیں اب سے نہیں ہزارہا سال سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ان کا تذکرہ الہامی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اب چونکہ کسی الہامی کتاب یا کسی پیغمبر کی گنجائش نہیں رہی اس لیے موجودہ زمانے میں ان کا ذکر آپ آیات میں نہیں بلکہ ان اخباروں، رسالوں یا کتابوں میں دیکھتے ہیں جنہیں آپ عود اور لوبان جلائے بغیر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھنے کے بعد ردی میں بھی اٹھوا سکتے ہیں۔

میں ایک ایسا انسان ہوں جو ایسے رسالوں اور ایسی کتابوں میں لکھتا ہوں اور اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں، جس نظر اور جس

زاویئے سے دیکھتا ہوں، وہی نظر، وہی زاویہ میں دوسروں کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ اگر تمام لکھنے والے پاگل تھے تو آپ میرا شمار بھی ان پاگلوں میں کر سکتے ہیں ''کالی شلوار'' کا پس منظر ایک ویشیا کا گھر ہے۔ یہ گھر بئے کے گھر کی طرح حیرت انگیز نہیں۔ جس کے متعلق عجیب وغریب باتیں مشہور ہیں۔ دہلی میں ایسی عورتوں کے لیے ایک مقام منتخب کر کے بے شمار گھر بنائے گئے ہیں۔ میری سلطانہ بھی ایسے ہی ایک بنے بنائے گھر میں رہتی تھی۔ اس نے بئے کی طرح یہ گھر خود نہیں بنایا تھا وہ بئے کی طرح رات کو جگنو پکڑ پکڑ کر اپنا گھر روشن نہیں کرتی تھی۔ روشنی پیدا کرنے کے لیے بجلی موجود تھی اور چونکہ یہ بجلی مفت نہیں مل سکتی اور نہ رہنے کے لیے مکان ہی کرائے کے بغیر مل سکتا ہے اس لیے اسے مزدوری کرنا پڑتی ہے وہ اگر بیاہی ہوتی تو اسے یہ سب چیزیں مفت مل جاتیں لیکن وہ بیاہی نہیں تھ، وہ ایک عورت تھی۔۔۔۔۔۔اور جب عورت کو بجلی کے پیسے دینے پڑیں، گھر کا کرایہ ادا کرنا پڑے اور جس کے پلے خدا بخش سا آدمی پڑ جائے، جو خدا پر بھروسہ رکھے اور فقیروں کے پیچھے مارا مارا پھرے تو ظاہر ہے کہ وہ ایسی عورت نہیں ہو گی جو ہم اپنے گھروں میں دیکھتے ہیں۔

میری سلطانہ چکلے کی ایک عورت ہے اس کا پیشہ وہی ہے جو چکلے کی عورتوں کا ہوتا ہے چکلے کی عورتوں کو کون نہیں جانتا قریب قریب ہر شہر میں ایک چکلہ موجود ہے۔ بدرو اور موری کو کون نہیں جانتا۔ ہر شہر میں بدروئیں اور موریاں موجود ہیں جو شہر کی گندگی باہر لے جاتی ہیں۔۔۔ہم اگر اپنے مرمریں غسل خانوں کی باتیں کر سکتے ہیں، اگر ہم صابن اور لیونڈر کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان موریوں اور بدروں کا

ذکر کیوں نہیں کر سکتے ، جو ہمارے بدن کا میل پیتی ہیں۔ اگر ہم مندروں اور مسجدوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان قحبہ خانوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جہاں سے لوٹ کر کئی انسان مندروں اور مسجدوں کا رخ کرتے ہیں۔ اگر ہم افیون، بھنگ، چرس اور شراب کے ٹھیکوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان کوٹھوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جہاں ہر قسم کا نشہ استعمال کیا جاتا ہے؟

بھنگیوں سے چھوت چھات کی جاتی ہے۔ اگر کوئی بھنگی ہمارے گھر سے گندگی کا ٹوکرا اٹھا کر باہر نکلے تو ہم اپنی ناک پر رومال ضرور رکھیں گے۔ ہمیں گھن بھی آئے گی مگر ہم بھنگیوں کے وجود سے تو منکر نہیں ہو سکتے۔ اس فضلے سے تو انکار نہیں کر سکتے جو ہر روز ہمارے جسم سے خارج ہوتا ہے قبض، پیچش، اسہال وغیرہ دور کرنے کے لیے دوائیں اسی لیے موجود ہیں کہ ہمارے جسم سے فاسد مادے کا اخراج ضروری ہے۔ گندگی کے نکاس کے لیے نت نئے طریقے سوچے جاتے ہیں اس لیے کہ گندگی ہر روز جمع ہو جاتی ہے۔ اگر ہمارے جسم میں ایک انقلاب برپا ہو جائے اور اس کے افعال بدل جائیں تو ہم قبض، پیچش اور اسہال کی باتیں نہیں کریں گے یا اگر گندگی کے نکاس کے لیے کبھی میکانکی طریقہ ایجاد ہو جائے تو بھنگیوں کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

ہم اگر بھنگیوں کے متعلق بات کریں گے تو یقیناً کوڑے کرکٹ اور گندگی کا ذکر آئے گا۔ اگر ہم ویشیاؤں کے متعلق بات کریں گے تو یقیناً ان کے پیشے کا ذکر آئے گا۔

ویشیا کے کوٹھے پر ہم نماز یا درود پڑھنے نہیں جاتے وہاں جس غرض سے ہم

جاتے ہیں، ظاہر ہے۔ وہاں ہم اس لئے جاتے ہیں کہ وہاں ہم جا سکتے ہیں وہاں جا کر ہم اپنی مطلوبہ جنس بے روک ٹوک خرید سکتے ہیں۔ جب وہاں جانے کی ہمیں کھلی اجازت ہے۔ جب ہر عورت اپنی مرضی پر ویشیا بن سکتی ہے اور ایک لائسنس لے کر جسم فروشی کر سکتی ہے، جب یہ تجارت قانوناً جائز تسلیم کی جاتی ہے تو اس کے متعلق ہم کیوں بات چیت نہیں کر سکتے؟

اگر ویشیا کا ذکر فحش ہے تو اس کا وجود بھی فحش ہے۔ اگر اس کا ذکر ممنوع ہے تو اس کا پیشہ بھی ممنوع ہونا چاہیے۔ ویشیا کو مٹایئے اس کا ذکر خود بخود مٹ جائے گا۔

ہم وکیلوں کے متعلق کھلے بندوں باتیں کر سکتے ہیں، ہم نائیوں، دھوبیوں، کنجڑوں اور بھٹیاروں کے متعلق بات چیت کر سکتے ہیں۔ ہم چوروں، اچکوں، ٹھگوں، رہزنوں کے قصے سنا سکتے ہیں۔ ہم جنوں اور پریوں کی داستانیں بیٹھ کر گھڑ سکتے ہیں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک بیل اپنے سینگوں پر ساری دنیا اٹھائے ہوئے ہے۔ ہم داستان امیر حمزہ اور قصہ طوطا مینا تصنیف کر سکتے ہیں۔ ہم لندھور پہلوان کے گرز کی تعریف کر سکتے ہیں۔ ہم عمرو عیار کی ٹوپی اور زنبیل کی باتیں کر سکتے ہیں ہم ان طوطوں اور ان میناؤں کے قصے سنا سکتے ہیں۔ ہم عمل ہمزاد اور کیمیا گری کے متعلق جو من میں آئے، کہہ سکتے ہیں ہم داڑھیوں، پائجاموں اور سر کے بالوں کی لمبائی پر لڑ جھگڑ سکتے ہیں۔ ہم روغن جوش، پلاؤ اور قورمہ بنانے کی نئی نئی ترکیبیں سوچ سکتے ہیں۔ ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ سبز رنگ کے کپڑے پر کس رنگ اور کس قسم کے بٹن سجیں گے۔ ہم ویشیا کے متعلق کیوں نہیں سوچ سکتے اس کے پیشے کے بارے میں کیوں غور نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں کے متعلق کیوں کچھ نہیں کہہ سکتے جو

اس کے پاس جاتے ہیں۔

ہم ایک نوجوان لڑکی اور ایک نوجوان لڑکے کا باہمی معاشقہ کرا سکتے ہیں ان کی پہلی ملاقات داتا گنج بخشؒ کے مزار میں کرا سکتے ہیں۔ ایک دلال بڑھیا بیچ میں لا سکتے ہیں جو ان دو بچھڑی روحوں کو بار بار ملاتی رہے۔ ہم آخر میں ان کے عشق کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ دونوں کو زہر پلوا سکتے ہیں پھر ان دونوں کے جنازے ایک اس محلے سے اور ایک اس محلے سے نکلوا سکتے ہیں، پھر ان دونوں کی قبریں ایک معجزے کے ذریعے سے آپس میں ملوا سکتے ہیں۔ اور اگر ضرورت محسوس ہو تو اوپر سے فرشتوں کے ہاتھوں سے پھولوں کی بارش بھی کرا سکتے ہیں۔۔۔۔ ہم ویشیا کی زندگی کیوں بیان نہیں کر سکتے۔ اسے تو فرشتوں اور ان کے پھولوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اگر مرتی ہے تو دوسرے محلے سے کوئی جنازہ اس کی موت کا ساتھ نہیں دیتا۔ کوئی قبر اس کی قبر سے ملنے کی خواہش نہیں کرتی۔

ویشیا کا وجود خود ایک جنازہ ہے جو سماج اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے، وہ اسے جب تک کہیں دفن نہیں کرے گا اس کے متعلق باتیں ہوتی رہیں گی۔

یہ لاش گلی سڑی سہی، بدبودار سہی، متعفن سہی، بھیانک سہی، گھناؤنی سہی لیکن اس کا منہ دیکھنے میں کیا حرج ہے۔۔۔۔۔ کیا یہ ہماری کچھ نہیں لگتی۔ کیا ہم اس کے عزیز و اقارب نہیں۔ ہم کبھی کبھی کفن ہٹا کر اس کا منہ دیکھتے رہیں گے اور دوسروں کو دکھاتے رہیں گے۔

میں نے کالی شلوار میں ایسی لاش کا منہ دکھایا ہے، ملاحظہ ہو۔

''سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا۔ جو اس کونے سے اس کونے تک

پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں۔اور ہر قسم کے مال و اسباب کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی، جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں، کبھی ادھر کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک، پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں اسے نظر آتا تھا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا، بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ اٹھتے تھے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔ نہ جانے کہاں پھر ایک روز ایسا آئے گا، جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رک جائے گی کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔''

ذہین پڑھنے والوں کے لیے اس سے اچھے اشارے اور کیا ہو سکتے ہیں۔ سلطانہ کی زندگی کا صحیح نقشہ ان اشاروں اور کنایوں سے میں نے پیش کرنے کی

کامیاب سعی کی ہے۔ دہلی کی میونسپلٹی نے دہلی کی ویشیاؤں کے لیے ایک خاص جگہ مقرر کرتے وقت یہ نہ سوچا ہوگا کہ مال گودان ان کی زندگی کا صحیح نقشہ پیش کرتا ہے لیکن جو صاحب نظر ہیں وہ ان مکانوں اور مال گودام کو آمنے سامنے دیکھ کر ''کالی شلوار'' جیسے کئی افسانے لکھیں گے

اسی لاش کا ایک بار میں نے یوں بھی منہ دکھایا تھا میں اپنے مشہور افسانے ''ہتک'' کا آغاز ان سطور سے کرتا ہوں

''دن بھر کی تھکی مندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور، گھر کو واپس گیا تھا۔ وہ رات یہیں ٹھہرتا۔ پر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی''

وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغے سے وصول کیے تھے، اس کی چست تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے، کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور ان کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔

''اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کے باعث تھی جس کا ادھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس ''بیوڑا'' کا نتیجہ تھی جس کو سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا۔''

''وہ ساگوان کے لمبے چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو

کاندھوں تک ننگی تھیں۔ پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو رات اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہوئے دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث سیاہی مائل رنگ اختیار کر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑہ وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔''

یہ سلطانہ کی ایک بہن سوگندھی کی تصویر ہے۔ اس کے پاس خدا بخش کی بجائے ایک خارش زدہ کتا تھا۔ خدا بخش سلطانہ کا دل نہ بہلا سکا مگر یہ خارش زدہ کتا سوگندھی کے بہت کام آیا۔ میں اس افسانے کے آخر میں لکھتا ہوں

''کتا اپنی ٹنڈ منڈم دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑ پھڑانے لگا۔ سوگندھی چونکی اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شے خالی ہے جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔ یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا، اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ ادھر وہ دماغ کو پر کرتی تھی اور ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔''

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی نیا طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور

ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے اپنے پہلو میں لٹا کر سوگئی۔

کون ہے جو یہ تصویریں دیکھ کر لذت حاصل کرنے کے واسطے ان ویشیاؤں کے کوٹھے پر جائے گا۔ میری سلطانہ اور میری سوگندھی تنہائی میں دیکھنے والی تصویریں نہیں ہیں جن کے اشتہار آئے دن اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں۔ وہ کوئی نیا جوڑ دار آسن پیش نہیں کرتیں۔ وہ امساک کا کوئی خاندانی نسخہ نہیں بناتیں، وہ کوئی لچھے دار آپ بیتی نہیں سناتیں کہ شہوانی جذبات ابھر آئیں۔

میرا زیر بحث افسانہ ''کالی شلوار'' اگر آپ غور سے پڑھیں تو ذیل کی باتیں آپ کے ذہن میں آئیں گی۔

1 سلطانہ ایک معمولی ویشیا ہے۔ پہلے انبالے میں پیشہ کرتی تھی بعد میں اپنے دوست خدا بخش کے کہنے پر دہلی چلی آئی، یہاں اس کا کاروبار نہ چلا

2 خدا بخش خدا پر بھروسہ کرنے اور فقیروں کی کرامات پر ایمان لانے والا آدمی تھا۔

3 سلطانہ کا جب کاروبار نہ چلا تو وہ بہت افسردہ ہوئی اس کی افسردگی میں اور اضافہ ہوگیا، جب خدا بخش فقیروں کے پیچھے مارا مارا پھرنے لگا۔

4 محرم سر پر آگیا۔ سلطانہ کی دوسری سہیلیوں نے کالے کپڑے بنوائے مگر وہ نہ بنوا سکی اس لیے کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

5 اس موقع پر شنکر آتا ہے ایک آوارہ گرد ذہانت، حاضر جوابی اور خوش گفتاری کے علاوہ اس کے پاس بھی کچھ نہیں۔ وہ سلطانہ کے پاس آتا ہے اور اپنی ان خوبیوں کے معاوضے میں اس سے وہ جنس طلب کرتا ہے جسے وہ دام لے کر

فروخت کرتی ہے سلطانہ یہ سودا قبول نہیں کرتی۔

6 دوسری مرتبہ شنکر خود نہیں آتا بلکہ اداس سلطانہ اسے خود بلاتی ہے اور اسے اپنی ٹھہرے پانی ایسی زندگی میں ایک حادثے کے طور پر قبول کر لیتی ہے۔ اس سے مل کر وہ خوش ہوتی ہے مگر یہ احساس اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا کہ محرم کے لیے اس کے پاس کالی شلوار کی کمی ہے۔ وہ شنکر سے کہتی ہے۔ محرم آ رہا ہے، میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیض اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا۔ جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے دیا ہے۔

7 شنکر محرم کی پہلی تاریخ کو ایک کالی شلوار سلطانہ کے لیے لے آتا ہے۔۔۔۔۔۔ خدا بخش کا خدا اور خدا رسیدہ بزرگوں پر اعتقاد کام نہیں آتا لیکن شنکر کی ذہانت کام آتی ہے۔ یہ افسانہ پڑھ کر ایسا اثر پیدا نہیں ہوتا تو یہ افسانہ اخلاقیت سے گراہوا نہیں ہے، اگر یہ اخلاقیت سے گراہوا نہیں تو یہ افسانہ ایسا گیت نہیں جسے حظ اٹھانے کی خاطر لوگ گائیں اور بار بار گائیں۔ کوئی گراموفون کمپنی اس کے ریکارڈ نہیں بھرے گی اس لیے کہ اس میں جذبات ابھارنے والے داورے اور ٹھمریاں نہیں ہیں۔

8 کالی شلوار جیسے افسانے تفریح کی خاطر نہیں لکھے جاتے۔ ان کو پڑھ کر شہوانی جذبات کی رال نہیں ٹپکنے لگتی۔ اس کو لکھ کر میں کسی شرم ناک فعل کا مرتکب نہیں ہوا۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس کا مصنف ہوں۔ میں شکر کرتا ہوں کہ میں نے کوئی ایسی مثنوی نہیں لکھی جس کے اشعار میں آپ کی خدمت میں نمونے کے طور

پر پیش کرتا ہوں۔

ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا
کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا
وہ ترا منہ سے منہ بھڑا دینا
وہ تیرا جیب کا لڑا دینا
وہ ترا پیار سے لپٹ جانا
اور دل کھول کے چمٹ جانا
ہولے ہولے پکارنے لگنا
ڈھیلے ہاتھوں سے مارنے لگنا
منہ سے کچھ کچھ پڑے بکے جانا
چھوٹ جانے کے گوں تکے جانا
تھک کے کہنا خدا کے واسطے چھوڑ
نیند آئی ہے اب مجھے نہ جھنجھوڑ
وہ ترا ڈھیلے چھوڑنا بے بس
وہ ترا ست ہو کے کہنا بس
بات باقی نہیں رہی اب تو
رات باقی نہیں رہی اب تو
کہیں تیری یہ بات نبڑے گی
یا یونہی ساری رات نبڑے گی

مجھ میں باقی اب تو کوئی بات نہیں
صبح بھی ہو چکی ہے رات نہیں
دیکھ اب آگے مار بیٹھوں گی
یا کسو کو پکار بیٹھوں گی
آدمی کی جو رنج نکلے گی
منہ سے کیوں نہ چیخ نکلے گی
جو پھر بھی تو قائم ہووے گا
دیکھیو کون ساتھ ہووے گا

(اقتباسات از مثنوی میر درد مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

شکر ہے کہ میں نے اپنی پیاس اور بھوک کی خواہشات نفسانی کو پرچانے کے لیے ایسے اشعار نہیں لکھے۔

لب سے لب مرے ملائے رکھنا
بازو سے وہ سر اٹھائے رکھنا
وہ سینے پہ لیٹ کے ستانا
مطلب کی سخن پہ روٹھ جانا
وہ منہ میں زبان کی لذتیں ہائے
ظاہر حرکت سے رغبتیں ہائے
اپنا جو ہوا کچھ اور ارادہ
جی چاہا کہ اس سے بھی زیادہ

وہ ہاتھ کو رکھ کے جوش انکار
وا کرنے نہ دینا بند شلوار
وہ ہاتھ کو دم بدم جھٹکنا
وہ تکیے پہ سر کو دے ٹپکنا
آہستہ لگانی آہ لاتیں
حیلہ کی وہ کیسی کیسی باتیں
وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا
و ہو کے تنگ کاٹ کھانا
وہ نیچے پڑے ہی تلملانا
قابو سے تڑپ کے نکلے جانا
وہ چیں بجبیں ہو کے کہنا
کن بے کسوں سے رو کے کہنا
ہے تم کو یہ شغل دن رات
اچھی نہیں لگتی مجھ کو یہ بات
بھرتا ہی نہیں ہے تیرا جی بس
کرتا ہی نہیں ہے تو کبھی بس

(کلیات مومن مثنوی دوم مطبوعہ نولکشور لکھنو)

عورت اور مرد کے جنسی رشتے کے متعلق اگر ادا انداز میں کچھ کہا جائے تو میں اسے معیوب سمجھوں گا اس لیے کہ یہ ہر بالغ آدمی کو معلوم ہے۔ تنہائی میں جب مرد

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
© 2002-2006

اورعورت ایک بستر پر اس غرض سے لیٹتے ہیں تو اسی قسم کی حیوانی حرکات کرتے ہیں لیکن وہ ایسی خوبصورت نہیں ہوتیں جیسا کہ ان اشعار میں ظاہر کی گئی ہیں۔ان کی حیوانیت کو شاعری کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے۔یہ لکھنے والی کی شرارت ہے جو یقیناً قابل گرفت ہے۔

اگر مرد اور عورت کے اس حیوانی فعل کا فلم بنا کر پردے پر پیش کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس کو دیکھ کر تمام سلیم الدماغ آدمی نفرت سے منہ پھیریں گے لیکن جو اشعار میں نے اوپر نمونے کے طور پر پیش کیے ہیں، وہ اس حیوانی فعل کی ایک غلط تصویر پیش کرتے ہیں۔

ایسی شاعری ''دماغی جلق'' ہے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں کے لیے میں اسے معیوب سمجھتا ہوں۔میرے افسانے '' کالی شلوار'' میں ایسا کوئی عیب نہیں۔ میں نے اس میں کہیں بھی مرد اور عورت کے جنسی ملاپ کو لذیذ انداز میں بیان نہیں کیا۔میری سلطانہ سے اچوا پنے گاہک گوروں کو اپنی زبان میں گالیاں دیا کرتی تھی اور ان کو الو کے پٹھے سمجھتی تھی، کس قسم کی لذیا کس قسم کے حظ کی توقع کی جاسکتی ہے۔وہ ایک دکاندار تھی،ٹھیٹ قسم کی دکاندار۔اگر ہم شراب کی دکان پر شراب کی بوتل لینے جائیں تو یہ توقع نہیں کریں گے کہ وہ عمر خیام بنا بیٹھا ہوگا یا اس کو حافظ کا سارا دیوان ازبر یاد ہوگا۔شراب کے ٹھیکے دار شربت بیچتے ہیں،عمر خیام کی رباعیاں اور حافظ شیرازی کے شعر نہیں بیچتے۔

میری سلطانہ عورت بعد میں ہے ویشیا سب سے پہلے ہے کیونکہ انسان کی زندگی میں اس کا پیٹ سب سے زیادہ اہم ہے۔شنکر اس سے پوچھتا ہے ''تم بھی

کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی''

سلطانہ جواب دیتی ہے ''جھک مارتی ہوں''۔۔۔۔۔وہ یہ نہیں کہتی کہ میں گندم کا بیوپار کرتی ہوں یا سونے چاندی کی تجارت کرتی ہوں، اسے معلوم ہے کہ وہ کیا کرتی ہے۔اگر کسی ٹائپسٹ سے پوچھا جائے کہ تم کیا کام کرتے ہو تو وہ یہی جواب دے گا''ٹائپ کرتا ہوں''میری سلطانہ اور ایک ٹائپسٹ میں زیادہ فرق نہیں ہے!

ختم شد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔The End